جامع و مانع کتاب

تقابلِ ادیان و مذاہب

ھندو ازم، بُدھ ازم، زرتشت ازم، کنفیوش ازم،
یہودیت، عیسائیت اور اسلام پر غیر جانبدارانہ اور منصفانہ
تقابلی گفتگو

پروفیسر میاں منظور احمد

عِلمی بُک ھاؤس
چوک اردو بازار: لاہور

جامع و مانع کتاب

تقابلِ ادیان و مذاہب

ھندوازم، بُدھ ازم، زرتشت ازم، کنفیوشس ازم، یہودیت
عیسائیت اور اسلام پر غیر جانبدارانہ اور منصفانہ
تقابلی گفتگو

مؤلفہ

پروفیسر میاں منظور احمد: اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

عِلمی بُک ھاؤس
چوک اردو بازار لاھور

ناشر ———— محمد سعید اقبال
———— علمی بک ہاؤس
ایڈیشن———— 2004
قیمت : ———— 30/-
منظور پرنٹنگ پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش کش

ادیان و مذاہب کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس سے ہمیں بڑی عبرتیں حاصل ہوتی ہیں، انسانی فطرت و نفسیات کی گہرائیوں کا کچھ بھید کھلتا ہے اور دنیا کے عظیم انسانوں سے کتابی ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح عقائد و ایمانیات اور اعمال و رسوم بھی مختلف اہلِ مذاہب کے میل ملاپ سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس طرح مشرق کی چیزیں مغرب میں اور مغرب کی مشرق میں جا پہنچتی ہیں۔ دنیا کے مختلف ادیان و مذاہب کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے نئی چیز نہیں ہے۔ ہمیں قرآن میں اس موضوع پر کافی مواد ملتا ہے۔ مشرکوں دہریوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے عقائد و اعمال اور اخلاق و کردار کا اس کتاب عزیز میں جگہ جگہ ذکر موجود ہے۔ مخالفینِ اسلام کے اعتراضات اور شکوک و شبہات کا رد کیا گیا ہے۔ سابق انبیاء اور ان کی امتوں پر جابجا تبصرے پائے جاتے ہیں۔ دینِ حق کی خاطر حق پرستوں نے کیا کیا تکالیف اٹھائیں؟ اسلام کا راستہ روکنے کے لئے کون کون سے ہتھکنڈے اختیار کئے گئے؟ اہلِ ایمان نے کس صبر و ثبات اور جاں بازی و جاں سپردگی کے مظاہرے کئے؟ قرآن نے ان سب مضامین کو کہیں تفصیل سے اور کہیں مجمل طور پر بیان کیا ہے۔ مقصد ان تمام واقعات کے بیان سے ہدایت و عبرت ہے۔

اسلام کو شروع سے ہی جن خطرناک حالات میں سے گزرنا پڑا اور ذرا آگے چل کر باطل جس طرح مختلف بھیس بدل بدل کر اس پر حملہ آور ہوا وہ بھی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ دین کا دفاع کرنے والوں نے ابتداء سے ہی جو کام کیے اور اب تک کئے جا رہے ہیں وہ بھی سب پر روشن ہے۔ دینی علوم کے مطالعہ میں جن لوگوں نے زندگی کا کچھ وقت گزارا ہے وہ جانتے ہیں کہ بے شمار اندرونی و بیرونی فتنے ہمیشہ مسلمانوں کو گھیرے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسولؐ کے لائے ہوئے اس آخری دین کی حفاظت کا خود ذمہ لے رکھا ہے۔ ہر دور میں ایسے اسباب مہیا ہو جاتے رہے کہ دین ہر آزمائش سے سرخرو ہو کر کامیاب نکلا۔ غرض اس داستان سرائی سے یہ ہے کہ مختلف ادیان و مذاہب کا مطالعہ تو پہلے بھی رہا کرتا تھا۔ مگر ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا جس کے باعث اس سال ۱۹۸۱ء میں مجھے یونیورسٹی میں تقابلِ ادیان کا پرچہ بھی اپنے عزیز طلبہ و طالبات کو پڑھانا پڑا۔

ہوا یہ کہ ہمارے شعبہ میں جو استاد تقابلِ ادیان کا پرچہ پڑھاتے تھے وہ مزید تعلیم و تحقیق کے سلسلے میں ملک سے باہر چلے گئے اور یہ پرچہ —— میرے اپنے مضمون حدیث کے علاوہ —— میرے ذمہ کر دیا گیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اتنا اہم مضمون ہو اور اس کے لئے بازار میں کوئی مناسب کتاب نہ مل سکے! مجھے لیکچرز کی تیاری کے سلسلے میں ازسرِنو بعض وہ کتابیں دیکھنی پڑیں جن کا مطالعہ کئے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ میں نے محض لیکچر دینے کی بجائے تعلیم کا ایک اچھوتا طریقہ اختیار کیا۔ اصل لیکچر سے قبل تختۂ سیاہ پر اس کا خلاصہ اشارات کی شکل میں لکھ دیا جاتا۔ پھر اسی کی تشریح و تفصیل بیان کی جاتی۔ کچھ وقت کے بعد میں نے اس میں ایک اور اضافہ کیا۔ وہ یہ کہ گزشتہ لیکچرز کے جامع نوٹ مختصر صورت میں لکھ کر طلبہ و طالبات میں تقسیم کرنا شروع کئے۔ اس سے انہیں بہت فائدہ پہنچتا۔ نہ صرف گزشتہ اسباق کا اعادہ ہو جاتا بلکہ امتحان کے لئے یادداشتیں تیار ہوتی رہتیں۔ اس "مختصر کتابچے" کا شانِ نزول یہی قصہ ہے۔

اب اصل یادداشت میں کچھ ترمیم و اضافہ کر کے اسے طبع کرانے کے لئے تیار کر لیا گیا ہے۔ مارکیٹ میں جو کتابیں اس موضوع پر موجود ہیں وہ کتابی ترتیب و ربط سے کافی حد تک محروم ہیں۔ جو کتابیں اس سے پہلے چھپ کر نایاب یا کمیاب ہو چکی ہیں ان سے بھی طلبہ استفادہ نہیں کر پاتے۔ اس موضوع پر اصل مواد عربی میں ہے یا انگریزی میں، اور وہ بھی انسائیکلو پیڈیا قسم کی کتب میں ہے۔ ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو حجم اور قیمت دونوں لحاظ سے عام طلبہ کی گرفت میں آسکے۔ اگر اس کتاب کا کوئی اور ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت آئی تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں مزید حک و اضافہ کیا جائے گا۔ اس میں بعض چیزیں مجھے تصنیفی اعتبار سے کھٹکتی ہیں۔ یہ نقص انشاء اللہ دور کرنے کی سعی کی جائے گی۔

اس کتابچے کی ترتیب میں جو مواد میرے پیشِ نظر رہا ہے اس کا بیان مختصراً یہ ہے:

۱۔ اَلْفَصل فِی الْمِلَلِ وَالْاَھوَاءِ وَالنِّحَل ۔ امام ابن حزم ظاہری
۲۔ اَلْمِلَلُ وَالنِّحَلُ ۔ علامہ ابو الفتح عبد الکریم شہرستانی
۳۔ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح ۔ امام ابن تیمیہ
۴۔ مقدمہ ابن خلدونؒ
۵۔ کتابِ مقدس (بائبل نیا اور پرانا عہد نامہ)
۶۔ فجر الاسلام، ضحی الاسلام، ظہر الاسلام ۔ احمد امین المصری

۷۔ یہودیت و نصرانیت ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی
۸۔ اظہار الحق (اُردو ترجمہ) مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی
۹۔ مقدمۂ اظہار الحق اُردو از مولانا محمد تقی عثمانی جج وفاقی شرعی عدالت پاکستان
۱۰۔ اسلام اور مذاہب عالم ۔ مظہر الدین صدیقی
۱۱۔ اسلام اور مذاہب عالم ۔ احمد عبداللہ مسدوسی
۱۲۔ نگار پاکستان خدا نمبر ۔ نیاز فتح پوری
۱۳۔ مقالاتِ علوم اسلامیہ ۔ میاں منظور احمد
۱۴۔ تاریخ دعوت و عزیمت ۔ سید ابوالحسن علی ندوی
۱۵۔ تجدید و احیائے دین ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی

میاں منظور احمد
ایسوسی ایٹ پروفیسر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

تقابلِ ادیان

ادیان کا لفظ دین کی جمع ہے۔ دین و مذہب کے الفاظ عام طور پر ایک ہی معنی میں بولے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان کا لفظ RELIGION ان دونوں کو حاوی خیال کیا جاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ تعبیر غلط ہے۔ ہمارے نزدیک دین سے مراد ہے نظامِ حیات اور مذہب کا لفظ ان نظریاتِ حیات پر بولا جائے گا جو دین و دنیا کی تفریق پر مبنی ہیں۔ ان نظریات کی رُو سے مذہب، عقیدہ، عبادت، اخلاقی نظریات وغیرہ ہر انسان کا ذاتی PRIVATE معاملہ ہے۔ سیاست، معاشرت اور معیشت کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب اور دین کے دائرہ ہائے کار الگ الگ ہیں۔ مذہب چند عقائد و اعمال، عبادات، رسوم اور اخلاقی ضوابط کا نام ہے۔ اور بس۔

اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق دین ہماری پوری زندگی پر محیط ہے۔ اسے اس لئے بھیجا گیا تھا تاکہ لوگ دنیا میں اس پر عمل پیرا ہو کر بہتر اور پاکیزہ زندگی گزاریں۔ اللہ کے تمام نبی اور رسول دینِ اسلام کے داعی تھے۔ اسلام کی آخری، کامل و غیر متبدّل صورت وہ ہے جسے آخری رسول محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔

تقابلِ ادیان سے یہ مراد ہے کہ دنیا کے مختلف مشہور مذاہب و ادیان کا غیر جانبدارانہ مقابلہ، ان کے اصول و عقائد اور عبادات و رسوم کا غیر متعصبانہ مطالعہ، تاکہ ہر ایک کی قدر و قیمت اور اس کے مسائل کا حسن و قبح معلوم کیا جا سکے۔ اگر کسی دین و مذہب میں کوئی خوبی ہے تو اس کا کھلا اعتراف کیا جائے۔ اگر کوئی نقص ہے تو اس کا مدلل ردّ کیا جائے۔ اسلام کی عقلی و نقلی فضیلت دلائل سے ثابت کی جائے تاکہ نئی نسلیں اور پڑھے لکھے ذہن اس پر شعوری ایمان لائیں اور ان کی زندگیوں میں مطلوبہ تبدیلی واقع ہو۔

مذاہب کی تقسیم

بحث کے وقت ہم دین اور مذہب کے لفظ کو بالعموم ایک ہی معنی میں بولیں گے۔ جہاں ضرورت پڑے گی ان کا اصطلاحی فرق و امتیاز بھی بیان کیا جائے گا۔ دین کی مذہبی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ادیان و مذاہب دو بڑی قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ ا۔ آسمانی مذاہب ب۔ غیر آسمانی مذاہب۔

پہلی قسم سے مراد وہ ادیان ہیں جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ مثلاً، یہودیت، عیسائیت اور اسلام۔ دوسری قسم ان مذاہب کی ہے جن کی آسمانی حیثیت مشکوک یا غیر ثابت شدہ ہے مثلاً ہندو مذہب، بدھ مذہب، زرتشتیت اور کنفیوشسزم۔

مذہب کی ضرورت اس ضمن میں اوّلین بحث یہ ہے کہ آیا دین و مذہب ضروری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں! ضروری ہے۔ اس کی ضرورت کو تاریخ، عقل اور نقلی دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کی ہر قوم و ملت کسی نہ کسی قاعدے، ضابطے اور نظمِ حیات کی پابند رہی ہے۔ مذہب کے بغیر زندگی میں نظم و ضبط اور ترتیب پیدا نہیں ہوتی۔ وحشی اقوام و قبائل بھی کسی نہ کسی صحیح یا غلط سلط دین و مذہب کو مانتے رہے ہیں۔ مذہب کے بغیر انسان کی ذہنی، قلبی اور روحانی پیاس نہیں بجھ سکتی۔

دین و مذہب کے متعلق دو نظریات

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اب ایک بھولا بسرا فلسفہ بن چکا ہے۔ اسلام نے انسان اور دین و مذہب کی ابتداء کا جو نظریہ پیش کیا ہے اب اُسے قبولِ عام کی سند حاصل ہو رہی ہے۔ اس کی رُو سے مذہب یا عقیدہ یا عبادت جنگلی، پہاڑی یا غاروں میں رہنے والے ننگ دھڑنگ انسانوں کے جذباتِ خوف و مسرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان (آدمؑ) کو اپنے نائب کے طور پر پیدا کیا۔ اس پر وحی نازل کی۔ اس کو رہنے سہنے، کپڑے بنانے اور پہننے، تمدنی زندگی بسر کرنے، اناج اُگانے اور تمام ضروریاتِ زندگی کو حاصل کرنے کا علم بخشا۔

اس نظریئے کی رو سے توحید کا عقیدہ مذہب کی بنیاد ٹھہرتا ہے۔ شرک اس وقت پیدا ہوا جب انسانی آبادی دنیا میں پھیل گئی۔ انسانی ضروریات بڑھ گئیں، آب و ہوا اور علاقوں کے اختلاف نے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے اور نبیوں کی تعلیم دھندلی پڑ گئی۔ شرک کا رد کرنے اور صحیح دین سکھانے کے لئے ہر زمانے اور ہر قوم میں رسول بھیجے گئے، مگر دین و مذہب کے بارے میں انسانوں کو مجبور نہیں کیا گیا۔ اور یہ معاملہ ان کے حسنِ انتخاب پر چھوڑ دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دینِ حق ـــ

اسلام کے علاوہ اور کئی مذاہب و مناہج وجود میں آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی کتابیں انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اتاریں۔ آخری کامل و عالمگیر کتاب قرآن ہے جو آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتری، وہ ڈیڑھ ہزار برس سے پوری طرح محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ اس میں زندگی کے تمام شعبوں اور پہلوؤں کے لئے ہدایات موجود ہیں۔ یہی باعث ہے کہ اسلام خدا کا آخری و آفاقی دین ہے۔

مذہب کا ایک نظریہ تو وہ ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا۔ اسے ہم دین و مذہب کا اسلامی و الہامی نظریہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر ایک دوسرا نظریہ بھی ہے جسے آزاد خیال ارباب تحقیق کا یا بالفاظِ دیگر زمانہ حال کے بعض مغربی مفکرین کا نظریہ کہنا موزوں ہوگا۔ اسے مذہب کا ارتقائی نظریہ بھی کہتے ہیں۔ جدید ماہرین کو چونکہ ہر چیز میں ارتقاء کی کارفرمائی نظر آتی ہے لہذا انہوں نے یہ تصور بڑی شدومد سے پیش کیا، لیکن افسوس ہے کہ تحقیق و تفتیش کے بعض دوسرے میدانوں سے۔ مثلاً تاریخ و جغرافیہ کی مانند ان اہلِ تحقیق کو یہاں بھی محض اندازوں اور تخمینوں سے کام لینا پڑا۔ اندازے صحیح بھی ہوسکتے ہیں اور غلط بھی۔ لیکن مخالفینِ مذہب اور اربابِ الحاد نے اس نظریئے کو چونکہ بڑا اچھالا ہے اس لئے اس پر مختصر گفتگو کی ضرورت پیش آئی۔

اس نظریئے کی رُو سے انسانی مذہبی ارتقاء کی کڑیاں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ قبل ازانی منزم PRE ANIMISM (۲) انی منزم ANIMISM
(۳) ٹوٹم ازم TOTAMISM (۴) اجداد پرستی۔ (۵) فرضی دیوتاؤں کی پرستش ۶۔ توحیدِ الٰہی کا تصور اپنی مختلف منزلوں اور صورتوں سمیت۔

نمبر ایک سے مراد ہے مظاہر پرستی سے پہلے کا دورِ لامذہبیت، نمبر دو سے مراد مظاہر پرستی ہے۔ نمبر تین جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ بعض جانوروں کے تقدس کا عقیدہ اور اُن کی پرستش کا نام ہے۔ نمبر ۴ سے مراد بزرگانِ سلف کی روحوں کے خوف یا شدتِ محبت کے باعث ان کے لئے مراسم عبادت ادا کرنے کا نام ہے۔ نمبر ۵ سے مراد یہ ہے کہ مشرکوں کی عجائب پسند طبیعتوں نے فرضی دیوی دیوتا ایجاد کرکے ان کی پوجا شروع کردی تھی۔ نمبر ۶ اس سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ مگر بعض ماہرین کا اصرار ہے کہ اس کے بعد الحاد و کفر کا دور آتا ہے۔ جس میں خدا وغیرہ کے نظریات کو کھوکھلا بتایا جاتا ہے۔ گویا انسان پھر اُسی دورِ لامذہبیت کی طرف لوٹ جاتا ہے جہاں سے ہزارہا برس

پہلے اس کا ارتقائی سفر شروع ہوا تھا۔
اب ہم ان کڑیوں پہ ذرا تفصیلی بات کریں گے۔ اس نظریئے کی رُو سے ابتدائی انسان کو مذہب اور رسم عبادت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے سوا اس کے سامنے اور کوئی مقصد نہ تھا۔ آہستہ آہستہ انسان کو نباتات، حیوانات، زمین، پہاڑ، برق و رعد، آندھی اور طوفان، سمندر، اور دریا، آگ اور پانی، پرند و چرند اور درندے، ان سب چیزوں سے واسطہ پڑا۔ وہ ان چیزوں کے نفع و ضرر سے آشنا ہوا۔ بجلی کوندی تو وہ ڈر گیا، رعد کی گرج سے اس پہ لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کے لئے پہاڑوں کی بلندی، آسمان کی رفعت، سورج کی روشنی اور تمازت، چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی، ستاروں کی چمک، آگ کی گرمی اور اس کا نفع و ضرر، یہ سب کچھ ناقابلِ فہم تھا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر سہما جاتا تھا۔ پھر موسموں کے تغیر و تبدل، گرمی اور سردی، بارش اور روئیدگی نے اسے اور بھی حیرت زدہ کیا۔ اسی اثناء میں اس کے عزیز و اقارب پہ موت طاری ہونے لگی۔ لوگ وقفے وقفے سے مرنے لگے۔ انسان یہ سوچنے لگا کہ موت کیا چیز ہے؟ حیات کی کیا حقیقت ہے؟ جب اُس کی سمجھ میں یہ سب کچھ نہ آیا تو اس نے سوچا کہ شاید مرنے والوں کو موت کے بعد کسی اور جہان میں متاعِ حیات اور تزئین و آرائش کی ضرورت ہوتی ہو گی۔ یہ سمجھ کر لوگوں نے مُردوں کے ساتھ اُن کی زندگی کی ضروریات کو بھی دفن کرنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ مُردوں کی چیزوں کو اگر ہم نے استعمال کیا تو وہ شاید ناراض ہو کر ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔ یہ خوف اور رشتہ داروں کی محبت اسلاف و اجداد پرستی کا سبب بنی اور انسان نے بزرگوں، بادشاہوں اور سرداروں کے لئے رسومِ عبادت اور انہیں خوش رکھنے کے لئے خود ساختہ مراسم کی پابندی شروع کر دی۔ یہاں پہنچ کر انسان نے سوچا کہ رُوح صرف ان کے بزرگوں میں ہی نہیں تھی بلکہ تمام مظاہر فطرت میں کسی نہ کسی درجے میں روح موجود ہے۔ اس فیصلے پر پہنچے بغیر وہ آسمانوں کی بلندی، سورج کی تمازت، ہوا کی تیزی، سمندر کے تلاطم، چاند ستاروں کی چمک، درختوں کی بلندی اور ثمرداری، زمین کی قوتِ نمو کی کوئی تعبیر نہ کر سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان نے پہلے مادرِ زمین کی پرستش شروع کی کیونکہ وہ ہمارے لئے ہر قسم کی سبزی و ترکاری اور پھل پھول کا انتظام کر کے ہماری زندگی کے قیام کا باعث ہے۔ اس کے بعد

مادرِ زمین کے مقابلے میں آسمانی باپ کا تصور اُبھرا اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، آگ، پانی، مٹی، ہوا، انسان کے مردانہ و زنانہ اعضائے جنسی کو معبود بنایا گیا۔ سورج دیوتا تو بہت سی مشرک قوموں کا معبود رہا ہے۔ اور اب بھی ہے۔ ہندوستان میں سوریہ دیوتا، مصر میں ہورس، آشوریوں کا آشور، ایرانیوں کا ہورِیا خور یہ سب سورج دیوتا کے ہی نام تھے۔ ستارہ پرستی نے علم نجوم کی بنیاد ڈالی اور کائنات کے اُلٹ پھیر کو سیاروں کی گردش سے منسوب کرنے لگے۔ قسمت کو لوگ آج بھی ستارہ کہتے ہیں۔ مختلف اقوام نے پہاڑوں کو بھی پوجا ہے اور ان کی تقدیس کا راگ الاپا ہے۔

آگ کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ نامعلوم دَور سے آتش پرستوں کا معبود رہی ہے، اور آج بھی ہے، ہندوستان میں دیگر دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ اگنی دیوتا بھی ویدوں کا معبود ہے۔ پانی کی پوجا کا تصور بھی قدیم ہے۔ مصر میں دریائے نیل کی پوجا ہوتی تھی۔ ہندوستان میں گنگا جمنا کی پوجا ہوتی ہے۔ اور دریائے سرسوتی کی دیوی کا نام ہی سرسوتی دیوی ہے۔ جو آرٹ کی سرپرست ٹھہرائی گئی ہے۔ ہوا کو ویدوں میں وایو دیوتا کا لقب دیا گیا اور ہندوؤں نے اس کی پوجا کی ہے۔ انسان کے جنسی اعضاء کی بھی پوجا کی گئی ہندوؤں میں شو لِنگ کی پرستش مشہور و معروف ہے۔ ہندوستان کے علاوہ مصر و عراق اور روم، یونان بھی اس پوجا کے مرکز رہے ہیں۔ انسان نے بعض جانوروں کو بھی پوجا ہے مثلاً یونان میں سانڈ، ایران میں گھوڑے، مصر و ہندوستان وغیرہ میں گائے بیل کو مقدس بلکہ معبود تک مانا گیا ہے۔ ہندوؤں نے تو ہر جانور کی پوجا کی ہے۔ حشرات الارض، بچھو، سانپ، نیولا، درندے، کچھوے، وشنو کے کچھ اوتار، گنیش (ہاتھی) سب حیوان پرستی کی مثال ہیں۔ حیوان پرستی کو شمالی امریکہ میں ٹوٹم پرستی کہا جاتا ہے۔ امریکہ کے علاوہ افریقہ کے کچھ حصوں میں بھی ٹوٹم پرستی پائی جاتی ہے۔ چین اور جاپان کے لوگ بھی اس معاملے میں دوسرے مشرکوں سے پیچھے نہیں رہے۔

اس کے بعد خود ساختہ، غیر مرئی فرضی خداؤں اور موہوم دیوتاؤں کا دَور آتا ہے۔ عرب جاہلیت میں ایسے دیوتاؤں کی کمی نہ تھی۔ عراق و فلسطین اور ایران و مصر وغیرہ کے علاوہ یونان و روم میں بھی کئی فرضی اور موہوم دیوتا تسلیم کئے گئے اور ان کی پوجا کی گئی۔ بعض دفعہ ایک قوم کا معبود اس کے نزدیک تمام صفاتِ کمال سے متصف قرار پاتا تھا جب کہ دوسرے معبود ایسے نہ تھے۔ جدید ارتقائی نظریئے میں اسے توحید ناقص کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بعد توحیدِ خالص کا دَور آیا اور اسلام نے وحدتِ الٰہی کا کھرا بے لاگ اور صاف ستھرا تصور پیش کیا۔

وحدت الوجود کا نظریہ ہندؤوں میں بڑی شد و مد سے موجود تھا۔ بعض مسلم صوفی بھی اس کے قائل ہو گئے اور وجودی کہلائے۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ مذہب اور جین مت میں بے صفات خدا کا تصور تھا جو الحاد اور کفر کہلاتا ہے۔ اب دنیا سوشلزم کمیونزم کی راہ سے پھر لامذہبیت کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہے۔ تاریخ نے انسان کو پھر پھرا کر آخر کار وہیں لا کھڑا کیا جہاں سے اس نے اپنا مذہبی سفر شروع کیا تھا۔

مذہب اور عقل جن لوگوں نے مذہب کو خلافِ عقل کہا ہے وہ یا تو خود بے عقل ہیں یا تعصب کا شکار ہیں۔ صحیح مذہب عقلِ سلیم کے خلاف نہیں بلکہ اس کے تقاضے کے مطابق ہے۔ کسی چیز کا عام ادنیٰ یا اوسط درجے کے لوگوں کی عقل میں نہ آنا اور چیز ہے اور حقیقتاً خلافِ عقل ہونا دوسری چیز۔ مذہب اگر کچھ لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکے تو اس کا خلافِ عقل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ دنیا کی بے شمار مادی اور سائنسی چیزیں عوام کی عقل میں نہیں آتیں حالانکہ وہ ثابت شدہ حقائق کے طور پر مسلّم ہو چکی ہیں۔ ان مسلمات کے لئے ہر ہر شخص کی عقل کو معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح دین و مذہب کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ عقلِ سلیم کے مطابق ہے لہٰذا خلافِ عقل نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر دور میں اور ہر ملک کے اربابِ عقل و دانش مذہب کے قائل رہے ہیں۔ اور آج بھی ہیں۔ پس دین و مذہب خلافِ عقل نہیں بلکہ تقاضائے فطرت کے مطابق ہے۔ اس کے بغیر نہ صرف یہ کہ زندگی میں نظم و ضبط قائم نہیں ہوتا بلکہ انسانی ذہن و قلب کو سکون و اطمینان بھی نہیں ملتا۔ یہ ضرور ہے کہ عقلی و نقلی دلائل سے صحیح دین و مذہب کی تلاش کرنا لازم ہے تاکہ زندگی میں نظم و ترتیب اور رُوحانی سکون و اطمینان مل سکے اور دونوں جہان کی فوز و فلاح حاصل ہو سکے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے تمام مادی تقاضے پورے کرنے کا سامان اس دنیا میں بہم پہنچایا ہے۔ کھانے، پینے، پہننے، مکان بنانے، سردی گرمی سے بچنے، مفید چیزوں کو حاصل کرنے اور مضرت سے گریز کرنے کا فطری الہام ہمارے اندر رکھا ہے۔ شہد کی مکھی کو ایک نظم و ضبط کے تحت چھتہ بنانے، شہد جمع کرنے اور افزائشِ نسل کا شعور بخشتا ہے۔ چیونٹیوں کو ایک منظم سلطنت کی صورت میں زندگی گزارنے کا ڈھنگ بتایا ہے۔ اسی طرح انسان کو — جو اشرف المخلوقات ہے — نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے اور راہِ ہدایت پر گامزن ہونے کا حکم دیا ہے۔ یہ حکم انسانوں کے بہترین افراد — انبیاء و رُسل کے ذریعے سے اُتارا گیا ہے۔ اس ذریعہ علم کو

وحی کہا جاتا ہے۔ اس کی صداقت کو جانچنے کے لئے عقل انسانی کے ساتھ ساتھ تجربے اور انبیاء کے ذاتی علم و عمل اور اخلاقِ فاضلہ کو معیار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں خدا کے نبی اور رسول ایسے معجزات بھی پیش کرتے رہے ہیں جن سے ان کی صداقت و امانت کو پرکھا جا سکے۔ انبیاء کی تعلیم و ہدایت اسی دنیوی زندگی کے لئے ہے اور ہم نے جانچ پرکھ کر دیکھ لیا ہے کہ اس تعلیم کو اپنانے اور اس ہدایت پر عمل کرنے سے دنیوی فلاح و صلاح حاصل ہوتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر انبیاء نے ایک آنیوالی زندگی اور جزاء و سزا کا نظریہ بھی پیش کیا ہے جو عقل و فکر کے عین مطابق ہے اور اس سے موت و حیات اور مقصدِ تخلیق کائنات کی گتھیاں بھی سلجھ جاتی ہیں۔

تقابلِ ادیان کا فائدہ یہ ہے کہ نہ صرف اس سے ہماری دینی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ علم و استدلال کی راہ کھلتی ہے اور صحیح و سقیم کا فرق واضح ہوتا ہے۔ ہم مسلم ہیں اور ہمارا دین بفضلِ خدا عقل و فکر کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ اس مضمون سے غیر شعوری ایمان کو شعوری اور پختہ بنانے میں مدد ملتی ہے۔

ہندو مذہب

ہندو مذہب دنیا کے قدیم مذاہب میں سے ہے۔ کئی وجوہ کی بناء پر ہمارا اس سے بہت قریبی رابطہ ہے۔ اس کے پیروؤں کی ایک خاصی تعداد ہندوستان میں رہتی ہے۔ کچھ اقلیتیں مغربی ممالک اور افریقہ و امریکہ میں بھی مقیم ہیں۔ دنیا کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تاریخ پر یہ مذہب کئی طرح سے اثر انداز ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہے، لہٰذا سب سے پہلے اسی پر گفتگو کی جانی مناسب ہے۔

ہندو مذہب کی تاریخ یہ امر افسوسناک ہے کہ دنیا کے اس عظیم و قدیم مذہب کی کوئی تاریخ نہیں۔ خود ہندو فاضلوں نے اس امر کا کھلا اعتراف کیا ہے۔ اس کا بڑا باعث یہ ہے کہ یہ مذہب دوسرے ادیان کی مانند کسی ایک رہنما، نبی و رسول، کتاب اور متعین عقائد اور اعمال کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ متضاد عقائد و اعمال، متضاد کتابوں، متضاد افسانوں اور متضاد رسوم و مظاہر کا ایک معجونِ مرکب ہے۔ اس میں دہریئوں سے لے کر ایک خدا کو ماننے والوں، ہزاروں لاکھوں دیوی دیوتاؤں کے پجاریوں، کروڑوں بتوں کی عبادت کرنے والوں

کا جمّ غفیر نظر آتا ہے اور یہ سب "ہندو" ہیں۔ دراصل یہ لفظ کسی دین و مذہب کا نام نہ تھا، بلکہ شروع شروع میں غلاموں اور قابلِ نفرت لوگوں کے لئے بولا جاتا تھا۔ کثرتِ استعمال سے ایک ملک کے باشندوں اور مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک مذہب کے پیروؤں پر بولا جانے لگا۔ ہندو سیاست دانوں نے اس صورتِ احوال سے بہت سے فوائد بھی حاصل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ برہمنوں کا اقتدار ہمیشہ محفوظ رہا۔ دوسرا یہ کہ غیر ہندوؤں مثلاً بدھوں، سکھوں اور جینیوں وغیرہ کو ساتھ ملا کر ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ دکھائی گئی۔ چنانچہ تقسیم ملک کے وقت ایسا ہی ہوا۔ یہ سب غیر ہندو تعداد کے لحاظ سے تو ہندوؤں کے کھاتے میں رہے مگر حقوق کے لحاظ سے آج ہندوستان میں سکھوں اور دوسری اقلیتوں کا جو حال ہے وہ ہندی مسلمانوں سے کسی حال میں بہتر نہیں۔

آریاؤں کا مذہب

وسط ایشیا سے ہندوستان پر حملہ آور ہونے والی آریہ قوم کا مذہب نامعلوم ہے۔ اس پر تاریخ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اتنا بہرحال معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ وہم و خرافات کے پابند تھے اور فرضی دیوی دیوتاؤں کے پجاری۔ یہی وہمی رسوم امتدادِ زمانہ کے ساتھ آگے چل کر داخلِ مذہب ہو گئیں۔ پھر یہ بھی لازم تھا کہ یہ بیرونی حملہ آور مقامی بُت پرست یا لا مذہب لوگوں سے متاثر ہوں۔ مقامی لوگوں کا مذہب بالعموم بُت پرستی تھا۔ جیسا کہ ہڑپّہ اور موہنجو دارو وغیرہ کی کھدائی سے ثابت ہوتا ہے۔ باہر سے درآمد ہونیوالی آریائی تہذیبی روایات کے ساتھ جب مقامی مذاہب کا ملاپ ہوا تو ایک تیسرا وسیع و عریض مذہب وجود میں آیا۔ آگے چل کر ہزارہا سال کی سماجی و معاشرتی رسوم، فلسفیانہ خیالات، فرضی قصّے کہانیاں اس میں شامل ہوتی چلی گئیں اور ان سب کے مجموعے کا نام ہندو مذہب ہو گیا۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، وید، پران، اپنشد، مہابھارت، رامائن اور گیتا وغیرہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ وید منتروں میں جس طرح اگنی دیوتا، وایو دیوتا، سورج دیوتا وغیرہ سے مدد و نصرت کی استدعا کی گئی ہے اور دشمنوں کے خلاف جس شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے، اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ فاتح آریہ قوم مقامی باشندوں کا قلع قمع کرنے کے لئے غیر محسوس اور غیر مرئی قوتوں سے مدد کی طالب ہوتی تھی اور توحید کی قائل نہ تھی۔

ہندو مذہب کا لٹریچر ہندو مذہب کی کتابوں کے مصنفین پر بھی خود اس مذہب اور اس کی تاریخ کی مانند تاریکی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا زمانۂ تصنیف بھی نامعلوم ہے۔ ان کی کتابوں کی حیثیت، تقدیس اور درجہ ومقام کے متعلق ہندو علماء وفضلا میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کی حیثیت ہمیشہ کم و بیش ہوتی رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ضروریاتِ زمانہ کے مطابق جب جس کتاب کی حیثیت کو زیادہ اجاگر کرنا ضروری سمجھا گیا اُسی کو مذہب کا مرکزی نقطہ بنا کر پیش کر دیا گیا۔ ان کتابوں میں الحاق اور ترمیم واضافہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے۔

ہندو لٹریچر کی ایک بنیادی تقسیم یہ ہے کہ اس مذہب کی کتابیں دو حصوں میں منقسم ہے۔ ۱۔ سُرتی بمعنی مسموع (سُنی ہوئی چیز)۔ ۲۔ سمرتی یعنی آباؤ اجداد کی روایات چاروں وید یعنی، یجر وید، اتھروید، سام وید اور رگ وید سُرتی کہلاتے ہیں جو عام ہندو عقیدے کے مطابق خود بخود رشیوں (اولیاء) کی زبان پر جاری ہو گئے اور لوگوں نے انہیں سُنا، جمع کیا اور ان میں تغیر و تبدل بھی ہوتا رہا۔ رادھا کرشنن سابق صدرِ ہندوستان اور جواہر لعل نہرو مشہور سیاسی ہندو لیڈر کے نزدیک وید انسانی تصنیف ہیں۔ اور ان میں ہر قسم کے عقائد و خیالات موجود ہیں۔ ویدوں کے علاوہ دیگر ہندو کتب سمرتی کہلاتی ہیں۔ یہ واضح نہیں کہ پران جن کو ویدوں کی تفسیر کہا جاتا ہے آیا پہلی قسم میں داخل ہیں یا دوسری میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں سمرتی کا لفظ قانون کا ہم معنی رہا ہو گا۔ مثلاً منو سمرتی، یعنی مشہور ہندو مقنن منوجی کا ترتیب دادہ ہندو قانون۔

وید اور اُن کی تعلیمات وید کا لفظ وِد سے نکلا ہے، وِدوان عالم کو کہتے ہیں۔ وِدّیا کا معنی علم ہے۔ وید طبیب کو بھی کہا جاتا ہے، ودیاساگر ہندوؤں میں کئی لوگوں کا نام ہوتا ہے، یعنی علم کا سمندر۔ شاعر، پنڈت عالم اور برہمن کو بھی وید کہتے ہیں۔ بعض ہندوؤں کا خیال ہے کہ چاروں وید برہما (خالقِ کائنات) کے چار مونہوں سے نکلے ہیں، مشرقی منہ سے رگ وید، مغربی سے سام وید، شمالی سے اتھروید اور جنوبی سے یجر وید۔ بعض اسے چار دیوتاؤں کی تصنیف بتاتے ہیں: اگنی دیوتا رگ وید کا، وایو دیوتا یجر وید کا، ادیتہ دیوتا سام وید کا اور چاند دیوتا اتھروید کا مصنف ہے۔ ہندو علماء کا خیال ہے کہ چاروں

ویددراصل ۱۰۴۴ رشیوں کا کلام ہے۔ یہ طے شدہ نہیں کہ وید آیا وسط ایشیا میں لکھے گئے اور آریہ حملہ آور انہیں ساتھ لائے یا ہندوستان پہنچ کر لکھے گئے۔ اُوپر دو ہندو لیڈروں کا ــــ جن میں سے ایک ہندو مذہب کا عظیم فلسفی بھی تھا یعنی سرادھاکرشنن ــــ یہ بیان درج ہوچکا کہ وید متضاد خیالات کا مجموعہ اور انسانی تصنیف ہیں، گو وہ یہ نہیں بتا سکے کہ مصنف کون تھے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اصل میں وید ایک تھا جس میں ایک لاکھ منتر ــــ جملے یا فقرے ــــ تھے، کسی نامعلوم زمانے میں اسے تقسیم کر کے چار وید بنا لئے گئے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یجروید سب سے قدیم وید تھا، دوسرے تینوں وید اسی سے بنائے گئے ہیں۔

۱۔ رگ وید:۔ سب سے بڑا وید ہے۔ اس کے دس ہزار منتر ہیں۔ اگنی دیوتا کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ پھر اندر دیوتا ــــ مال و دولت کا دیوتا ــــ کی تعریف و توصیف ہے اور دیوی دیوتاؤں سے دعائیں اور التجائیں ہیں۔

۲۔ یجروید۔ یہ بالکل رگ وید کا چربہ معلوم ہوتا ہے اس میں ہَوَن ــــ جشن قربانی ــــ کے گیت ہیں۔ اور قربانی کی اشیاء کو مخاطب کر کے دیوتاؤں کی ان سے خوشی اور رضاء بیان کی گئی ہے۔

۳۔ سام وید:۔ یہ وید تاریخی طور پہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، اس لئے بعض ہندو صرف تین ویدوں کے قائل ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب کا گورنر تر ویدی (تین ویدوں کا عالم) تھا اس وید میں تقریباً پانچ ہزار منتر ہیں جو سوم یگیہ ــــ جشنِ مسرت ــــ پہ گائے جاتے ہیں۔

۴۔ اتھروید:۔ اس وید میں وحدت الوجود کی تعلیم ہے۔ نصف نظم اور نصف نثر میں ہے۔ زیادہ تر مضامین جادو پہ مشتمل ہیں۔ کل چھ ہزار منتر ہیں۔ چھٹا حصہ رگ وید سے لیا گیا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی ہر وید تین حصوں پہ مشتمل ہوتا ہے: ۱۔ منتر بھاگ (دعاؤں کا حصہ)، (۲) براہمن بھاگ، منتروں کی شرح و تفصیل۔ (۳) ارنیک بھاگ ــــ جنگلوں کا حصہ یعنی غالباً جنگلوں میں پڑھا جانے والا حصہ۔

ویدوں کی تعلیمات

ویدوں کی تعلیم کا وہ حصہ بڑا خوفناک ہے جس میں غیر آریاؤں کو زندہ جلا ڈالنے، درندوں سے پھڑوانے، تڑپا تڑپا کر بے رحمی سے مارنے، پانی میں غرق کرنے، ان کی آبادیوں کو پیوند خاک کرنے کے

احکام ہیں۔ ان احکام میں عورت، مرد بچے بوڑھے مریض، فوجی اور غیر فوجی میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ اب تاریخ کے حقائق سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہندو پاکستان میں جو بے شمار ٹیلے پائے جاتے ہیں اور جن کی کھدائی سے شہروں اور آبادیوں کے نشانات ملتے ہیں۔ یہ آریاؤں نے یہاں کی مقامی آبادی — بھیل، سنتھال، دراوڑ اور سانسی وغیرہ کے دیہات اور شہروں کو جلا کر اور تباہ و برباد کر کے بنائے تھے۔ ویدوں میں آگ، ہوا پانی کے دیوتاؤں اور اندر دیوتا سے التجائیں کی گئی ہیں کہ وہ آریاؤں کے دشمنوں کو ملیامیٹ کریں۔ ویدوں میں عورت کو ایک ثانوی درجے کی انسانی مخلوق بتایا گیا ہے جو بیوفا، احمق اور منافق ہے۔ نکاحِ ثانی کی اجازت نہیں۔ عورت وراثت سے محروم ہے۔ شودر — غیر آریہ — کو برائے نام انسانی حقوق بھی حاصل نہیں۔ وہ ایک قابلِ نفرت مخلوق ہے۔ اس کا کام فقط دوسروں کی خدمت ہے، اسی میں اس کی نجات ہے ورنہ نہیں۔

وید ایک خدا کے تصور سے خالی ہیں۔ ان میں وحدت الوجود کی تعلیم ہے۔ کہیں 33 دیوتا بتائے گئے ہیں اور کہیں 3340۔

ویدوں کی تعلیم کے مطابق ہندو پاکستان کی اصل آبادی کی تباہی و بربادی کا مفصل حال مسٹر عبدالعزیز ایڈووکیٹ کراچی نے اپنی کتاب DISCOVERY OF PAKISTAN میں کچھ تفصیل سے کیا ہے اور اپنے مختلف بیانات کو تصاویر اور نقشوں سے مزین کیا ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غیر آریاؤں کے ساتھ ان ملکوں میں آریہ حملہ آوروں کے ہاتھوں کیا بیتی تھی۔

برہمنا برہمن کی فضیلت و فوقیت اور اس کے مذہبی فرائض و اعمال — مثلاً قربانی کی تاثیر اور ضرورت و اہمیت پر جو کتابیں لکھی گئیں انہیں برہمنا کا نام دیا گیا ہے۔ شاید آب و ہوا کے اثرات کے باعث یا برہمنیت اور اُس کی بلا سبب اجارہ داری کے عقیدہ کے سبب سے آریہ سوسائٹی میں کسی وقت اندر ہی اندر برہمن کے خلاف لاوا اُبل رہا ہو گا۔ آریہ فلاسفروں نے اس چیز کو بھانپ لیا۔ چونکہ ہندو معاشرے کی بنیاد ہی انسانی تقسیم پر تھی اور انہیں سوسائٹی کی بنیادوں میں تزلزل نظر آیا اور انہوں نے برہمن کی فوقیت و فضیلت کا ازسرِ نو اظہار کرنے کے لئے یہ کتابیں لکھیں۔ ان میں قربانی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ سبب یہ کہ قربانی کی سب رسوم برہمن کے ہاتھوں اور اُسی کی زیرِ ہدایت انجام پاتی تھیں۔ نیز بتوں اور دیوتاؤں کے نام پہ چڑھائے جانے والے چڑھاووں اور نذر و نیاز پر بھی اسی کا حق مسلم تھا۔ یہ حقیقت تو کسی دلیل کی

محتاج نہیں کہ ہندو مذہب کی کوئی تاریخ نہیں، غالباً ہوشیار قسم کے لوگوں نے بعض خفیہ اغراض کے تحت اس مذہب کو تاریخ سے بے نیاز رکھا ہے ورنہ شاید برہمنا کا زمانہ وہی ہو جب ہندوؤں میں اصلاحی آوازیں اُٹھ رہی تھیں مساوات کا علم بلند ہو چکا تھا۔ ذات پات کے انسانیت سوز عقیدے کو رد کیا جا رہا تھا اور انسانی احترام و وقار کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ بدھ مذہب اور جین مت کی اصلاحی تحریکوں سے گھبرا کر نئے سرے سے برہمن کا تسلط قائم کرنا مدِ نظر تھا لہٰذا وہ لٹریچر وجود میں آیا جو تناسخ، قربانی اور برہمن کی فضیلت کے گرد گھومتا ہے۔ برہمن کی اجارہ داری نے جادو، ٹونے ٹوٹکے، جھاڑ پھونک، وہم و خرافات بھوت پریت جیسی خرافاتی چیزوں کو جنم دیا کیونکہ ان تمام چیزوں سے برہمن کی اہمیت بڑھتی اور اس کی ضرورت دو چند ہوتی ہے۔

اُپنشد اس لفظ کا لغوی معنی ہے: قریبی نشست۔ قاعدہ یہ تھا کہ گرو یا استاد جنگل میں، کسی درخت کے نیچے یا کسی ندی نالے کے کنارے بیٹھ جاتا، شاگرد اس کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھتے اور اس کا وعظ یا لیکچر سُنتے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنشد ویدوں کی تفسیر ہے۔ یہ بھی ویدوں کی طرح نامعلوم اشخاص کی تصنیف ہیں۔ عام طور پہ انہیں ہندو فلاسفی اور تصوّف کی کتابیں مانا جاتا ہے۔ اندازاً ان کا زمانہ تصنیف 800 قبل مسیح سے لے کر 500 قبل مسیح متعین کیا جاتا ہے۔ یہی دَور ویدک تعلیم کے زوال کی ابتداء اور برہمنی تسلط سے چھٹکارا پانے کی تدابیر سوچنے اور بعض اصلاحی آوازوں کے بلند ہونے کا تھا۔ یہ کل 108 لیکچر ہیں۔ بعض ہندوؤں نے انہیں قدامت میں ویدوں سے بھی زیادہ اہم بتایا ہے۔ خود بعض اپنشد بھی اسی کے مدّعی ہیں۔ تعلیم ان کی بھی وید کی مانند متضاد اور چوں چوں کا مربہ نظر آتی ہے۔ ہر قسم کے خیالات ان میں موجود ہیں۔ ان کی تعلیم میں وحدت الوجود، مراقبہ، گیان دھیان تناسخ، نجات حاصل کرنے کے طریقے، برہمن کی فضیلت، آتما (روح یا روح الارواح) اور برہمن کا اتحاد نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اپنشد کی رُو سے اعلیٰ مرتبہ ان لوگوں کا ہے جو آتما (یا برہمن) میں جذب ہونے کی لیاقت پیدا کر لیں عٰ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا! یہی ہندو وحدت الوجود کا نظریہ ہے جو عقیدۂ توحید کے منافی اور رسولؐ کی تعلیم کے بالکل برعکس ہے۔

پران پراَن لٹریچر کا مقصد بھی غالباً برہمن کی عظمت وفضیلت کا از سرِ نو احیا رہا جو بُدھ مت اور جین مت وغیرہ کی طاقتور اور عوامی آوازوں سے قدرے دب چکی تھی۔ گو بعض لوگوں نے ازراہِ سازش پراَن کو اپنشد اور ویدسے بھی قدیم تر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر جدید نظریہ یہ ہے کہ ان کی تصنیف گپت خاندان کے دَور میں 500 عیسوی میں ہوئی ہے۔ یہ زمانہ بدھ مذہب کے عروج اور برہمنیت کے زوال کا تھا۔ لیکن جلدی ہی معاملہ برعکس ہوگیا اور متحدہ ہندوستان پھر برہمنیت کی گرفت میں آگیا۔ پران کل 18 ہیں۔ ان کی زبان عام فہم ہے۔ ان میں تاریخی قصے، دیوی دیوتاؤں کی دیومالائی MYTHOLOGICAL حکایات، وہم و خرافات، بھوت پریت اور کچھ مذہبی احکام بھی ہیں۔ دنیا کی عمر کے بارے میں بعض مضحکہ خیز اندازے عجیب فلسفیانہ اور پیچیدہ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ کائنات کی تخلیق کا کوئی مقصد نہیں بتایا گیا مگر طریقہ اس کا یہ بیان ہوا ہے کہ برہما — خالق کائنات نے ایک انڈا دیا۔ اس میں سے ایک بچہ نکلا جو کائنات ہے۔ دنیا کے کئی دَور ہیں۔ ہر دور ایک ہزار مہا جُگ کا ہے۔ ہر مہا جُگ ۳۴ لاکھ بیس ہزار برس کا ہے۔ ہر مہا جُگ میں ۴ جگ ہوتے ہیں۔ اس وقت آخری مہا جُگ چل رہا ہے۔ جس کے تین جُگ ختم ہوچکے اور چوتھا جاری ہے۔ اس جُگ کے چار لاکھ 62 ہزار 965 برس ابھی باقی ہیں۔ اب کون عقلمند نہیں جانتا کہ یہ سارا حساب محض رسمی و خرافاتی ہے جس کی کوئی عقلی و نقلی اور سائنسی دلیل موجود نہیں!

ہندو قانونی لٹریچر آریہ قوم جیسی عظیم قوم جس نے ہزاروں سال ہندو پاکستان جیسے عظیم خطے پر حکومت کی تھی، ظاہر ہے کہ کسی قاعدے ضابطے یا قانون کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ قانون تو ہر انسانی معاشرے کی ایک ابتدائی اور اہم ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں بھی قانونی لٹریچر موجود ہے۔ جسے دھرم سُترا اور دھرم شاستر کہتے ہیں۔ دھرم سُترا انفرادی و اجتماعی زندگی کے صرف مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی حصے سے بحث کرتا ہے جب کہ دھرم شاستر جرائم اور ان کی سزاؤں کا ذکر کرتا ہے۔ پس دوسری قسم خالص قانونی ہے، جب کہ پہلی قسم قانونی ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی و اخلاقی اور سیاسی و مذہبی اہمیت کی حامل بھی ہے۔ قانونی کتابوں میں منوسمرتی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ منو خود کوشل خاندان کا ایک حکمران تھا۔ اس کا بنایا ہوا اور نافذ کردہ قانون ہندو مذہب

کی جان ہے۔ منو نے ذات پات کی منظم اور سائنٹفک درجہ بندی کی ہے اور برہمن، کشتری ویش اور شودر کے حقوق و فرائض قانونی نقطۂ نگاہ سے پیش کئے ہیں۔ برہمن برہما جی کے منہ سے پیدا ہوا ہے لہذا مقدس اور لائق احترام ہے۔ اور اکثر و بیشتر قانونی گرفت سے بالاتر ہے۔ خاص طور پہ اس وقت کسی قانونی گرفت کا مستوجب نہیں جب وہ کسی شودر (اچھوت) پہ ظلم و ستم کرے، بلکہ اسے قتل تک کر دے۔ برہمن سارے جہان کا مالک ہے۔ اسے آسمانی و خدائی حقوق حاصل ہیں۔ وہ وید مقدس کو پڑھتا اور اس کی شرح و تفسیر کرتا ہے۔ کشتری کا فرض ہے کہ برہمن کے مشورے سے کاروبارِ حکومت انجام دے۔ حکومت و سلطنت کا کاروبار چلانا، حرب و ضرب کے معرکے اور نظم و ضبط کا قیام کشتری کا فرض ہے۔ وہ برہمن کی تقدیس و احترام قائم کرے گا۔ اور اس کے خلاف کی جانے والی ہر بات کا سخت نوٹس لے گا۔ ویش برہما جی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے جیسا کہ کشتری بازوؤں سے نکلا ہے جو قوت و شجاعت کی علامت ہیں۔ تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کرنا اور معاشی سرگرمیوں کو جاری رکھنا ویش کا فریضہ ہے۔ یہ تینوں ذاتیں آریہ قوم سے تھیں۔ چوتھی ذات جو غیر آریوں کے ظلم و تشدد سے بزورِ شمشیر غلام بنائی گئی وہ شودر ہے جس کے کوئی انسانی حقوق نہیں۔ اس کا کام فقط غلامی اور خدمت ہے۔ اس کی جان و مال اور عزت و ناموس کا مالک برہمن ہے۔ کوئی نیکی یا اخلاق شودر کی ذلت کو گھٹا یا مٹا نہیں سکتا جیسا کہ کوئی برائی یا جرم برہمن کی عظمت و احترام کے منافی نہیں۔ شودر کی پیدائش برہمن کے پاؤں کے نیچے سے ہوئی ہے لہذا وہ ہمیشہ ہمیشہ ذلیل و لپت رہے گا۔

منو کے قانون نے برہمنیت کا تسلط قائم کر دیا۔ ہمیشہ کے لئے ذات پات کا ایسا چکر چلایا جس سے نکل کر ایک قوم کا فرد دوسری قوم میں داخل ہونے کا مستحق نہیں رہتا۔ شادی بیاہ اور تمام معاشرتی معاملات میں یہ امتیاز ضروری ٹھہرا۔ غلامی کی آٹھ اقسام قائم کی گئیں۔ جو سب پھر پھر کر غیر آریاؤں کے گرد گھومتی ہیں۔ منو کے نزدیک یہ لوگ غلام ہیں:

۱۔ آریاؤں کے مفتوح لوگ۔
۲۔ خوراک کی شرط پر غلامی قبول کرنے والا۔
۳۔ کسی جرم کی سزا کے عوض غلامی قبول کرنے والا۔

۴۔ گھر کی خدمت گار داسی کی اولاد (خواہ اُس کے خاوند سے ہوئی ہو یا مالک سے)
۵۔ خریدا ہوا غلام۔
۶۔ موروثی غلام، جو باپ دادا کی طرف سے وراثت میں ملے۔
۷۔ ہر قسم کے غلاموں کی اولاد۔
۸۔ بھگت (غالباً یہ اونچی ذات کے ہندوؤں کا خدمت گزار ہے!)

منوسمرتی وراثت کے حق سے عورت کو محروم ٹھہراتی ہے۔ باپ کی وراثت صرف بڑا بیٹا لے گا۔ وہ نہ ہو تو میت کا باپ اور بھائی حقدار ہے۔ جو بے اولاد مرے اس کی وراثت صرف ماں کا حق ہے۔ منو کے قانون میں مختلف جرائم کی سزائیں یہ ہیں عضو تناسل کاٹنا، پیٹ کاٹنا، دونوں ہاتھ کاٹنا، دونوں پاؤں کاٹنا، دونوں کان کاٹنا، دونوں آنکھیں پھوڑنا، ناک کاٹنا، قتل کرنا، جائداد و املاک کی ضبطی۔ برہمن اور وِدْوَان (عالم جو اکثر و بیشتر برہمن ہی ہوتا تھا!) قتل کی سزا سے بری ہے۔ سخت ضرورت کے وقت معمولی سزا دی جائے یا علاقہ بدر کر دیا جائے۔ شودر اگر اونچی ذات میں زنا کرے تو اسے قتل کر دیا جائے یا بعض حالات میں جائداد چھین کر آلۂ تناسل کاٹ دیا جائے۔ اعلیٰ ذات کے ہندو اپنے ہی وَرن (ذات) میں باہمی رضامندی سے زنا کریں تو معمولی سزا دی جائے یا جرمانہ کیا جائے۔ ویش اگر برہمن سے زنا کرے تو اس کی جائداد ضبط اور ایک سال قید۔ کشتری کو اسی جرم میں ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور گدھے کے پیشاب سے چار ابرو کا صفایا کیا جائے۔

ہندو مذہب کا دورِ اصلاح و ترمیم

ذات پات کے غیر انسانی چکر، برہمنیت کے تسلط اور ہندو معاشرے کی عدم مساوات نے اندر ہی اندر ایک نفرت کا طوفان بپا کر دیا۔ شودر پر جو مظالم کئے جاتے تھے اور اسے حیوانیت سے بھی کم تر درجے پر جس طرح پہنچا دیا گیا تھا اس کے ردِ عمل کے طور پر ہندو مذہب میں کچھ اصلاحی تحریکیں بھی اٹھیں۔ ان میں جین مت اور بدھ مت قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں نے ذات پات کی نفی کی اور انسانی مساوات کا نعرہ بلند کیا۔ گویا یہ غیر انسانی تقسیم کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔ کچھ دیر تک تو ہندو مذہب اور سماج کا انجر پنجر ڈھیلا ہو کر رہ گیا۔ مگر ہندو ذہنیت اور برہمنیت کو داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اُس نے اصلاح کا رُخ کسی اور طرف موڑ کر ان نئی تحریکوں کو ہڑپ کر لیا۔ اور اپنے اندر ایسی کشش پیدا کر لی کہ

یہ تحریکات ہندو مت کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں بلکہ اُلٹا خود اُسی کا ایک حصّہ بن کر رہ گئیں۔ آج ہندوستان کا ہر غیر مسلم۔ معدودے چند عیسائیوں کے سوا۔ ہندو کہلاتا ہے، چاہے وہ بُدھ ہو یا جینی یا شودر یا کچھ اور۔ خلاصۂ گفتگو یہ کہ برہمنیت کا اژدہا پھر از سرِ نو پھنکارنے لگا اور اُس نے تمام اصلاحی آوازوں کا عملاً خاتمہ کر ڈالا۔

اس دَور میں ویدانت کا فلسفہ ایجاد کیا گیا جس کی غرض وید مقدس اور برہمن کا احترام از سرِ نو قائم کرنا تھا۔ اس فلسفے نے لوگوں کی توجہ مجسمہ سازی، بُت پرستی، اہنسا یعنی عدم تشدّد کی طرف موڑ دی۔ اہنسا کا اصول جینیوں اور بُدھوں کی خوشنودی کے لئے وضع کیا گیا تھا جو جاندار کو ستانے اور گوشت خوری کے خلاف تھے۔ ہزارہا سال تک ہندوؤں میں گوشت خوری اور جانداروں کی قربانی کا رواج رہا مگر جدید ہندو مذہب نے نئی احتجاجی آوازوں سے متاثر ہو کر اور انہیں خاموش کرنے کے لئے اسے بطورِ اصول داخلِ مذہب کر لیا قربانی — یعنی جاندار کی قربانی — موقوف کی گئی اور اس کی بجائے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے پھل پھول، غلّہ، شہد اور شراب وغیرہ کی نذر و نیاز کا طریقہ جاری ہوا۔ گئے کی تقدیس کا تصوّر پیدا ہوتا ہے اور بعض قدیم تہذیبوں مثلاً یونانی، مصری اور ایرانی میں اس کا ثبوت ملتا ہے، مگر ہندوؤں نے اسے جو معبود کا درجہ دیا ہے یہ جدید ہندو مت کی ترمیم ہے، ویدوں کے دَور میں اس کا وجود نہیں ملتا۔

ہندو تثلیث جدید ہندو مذہب نے دیوتاؤں اور معبودوں کی ایک تثلیث پیش کی ہے جس کا وجود قدیم ہندوؤں میں نہیں تھا۔ یہ تثلیث برہما، وشنو اور شیو پر مبنی ہے۔ اس تثلیث — یا تگڈم — کی کچھ تشریح یہ ہے:۔

۱۔ برہما جی بقول اُن کے خالقِ عالم ہے مگر پیدائش کے بعد کائنات کا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اب دنیا میں وشنو اور شیو جی کا عمل دخل ہے۔ بعض ہندو فلسفوں کی رُو سے برہما روح الارواح بھی ہے اور اُسی میں جذب ہو جانا معراجِ انسانیت ہے۔ اعلیٰ درجے کی ارواح اُس میں جذب ہو کر اُسی کا حصّہ بن جاتی ہیں اور باقی جونی چکّر (تناسخ آواگون) میں پھنس کر نامعلوم عرصے تک تکلیف اُٹھاتی ہیں، تب کہیں جا کر اُنہیں از سرِ نو نیک اعمال کے باعث

برہما میں جذب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس کا مجسمہ بڑا عجیب و غریب اور ہندو صنمیات MYTHOLOGY کا شاہکار دکھائی دیتا ہے، اس کے چار سر اور چار ہاتھ ہیں۔ ایک ہاتھ میں چمچہ، دوسرے میں لوٹا اور قربانی کا سامان، تیسرے میں تسبیح اور چوتھے میں وید ہے۔ وہ راج ہنس پر سوار دکھایا جاتا ہے۔ اس کی رہائش کا مقام میرو پہاڑ ہے۔ اس کی بیوی سرسوتی دیوی ہے جو فنونِ لطیفہ کی دیوی ہے۔ ہندوؤں میں برہما کی پوجا بہت کم ہوتی ہے۔ اور اس کے نام کے مندر (معبد) بھی بہت کم ہیں۔ ہندو چونکہ فطرتاً مادہ پرست اور بزدل ہیں۔ اور ان کے عقیدے میں تخلیقِ کائنات کے بعد اس کی نیکی بدی دوسرے دیوتاؤں کے سپرد ہو چکی ہے۔ لہٰذا برہما کی پوجا کا فائدہ بھی کیا ہے؟ کیوں نہ وشنو کی پوجا سے مال و دولت حاصل کیا جائے اور شیو جی کو پوج کر ان کے غیظ و غضب سے بچا جائے؟

2۔ وشنو: رحم و مسرت اور خوشحالی کا دیوتا ہے۔ اس کی پوجا سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہندو عقیدے میں سارے ہندو عظیم ہیرو مثلاً رام چندر اور کرشن وغیرہما اسی کے اوتار (مظہر) تھے۔ وشنو انسانوں کے علاوہ کبھی نباتات حیوانات تک میں ظہور کرتا ہے۔ کبھی مچھلی کی شکل میں، کبھی کچھوے کی شکل میں، کبھی سور کی شکل میں، کبھی نرسنگھ کی صورت میں جو شیر اور انسان کی شکل سے مرکب ہے، کبھی آم کے درخت میں، کبھی رام چندر جی کی صورت میں، کبھی کرشن جی کی شکل میں، کبھی مہاتما بدھ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ابھی کالکی اوتار باقی ہے جو سوا چار لاکھ برس میں آئے گا۔ اس عقیدے کی رو سے مہاتما بدھ کو ہندو مذہب میں سمو دیا گیا اور بدھوں کی ہمدردیاں حاصل کی گئیں۔ وشنو مہاراج کی صورت یہ ہے کہ چار ہاتھ ہیں، ایک میں سنکھ، دوسرے میں گرز، تیسرے میں چکر اور چوتھے میں کنول کا پھول اس کی سواری کا جانور انسان اور پرندے کی مرکب صورت میں ہے۔ اس کی بیوی لکشمی ہے جو حسن و جمال اور مال و دولت کی دیوی ہے۔

وشنو مت ہندوؤں کا ایک خاص فرقہ ہے جس کا بانی رامانج سوامی جنوبی ہند کا باشندہ تھا۔ اس فرقے کا دوسرا حصہ بنگال میں اٹھا جس کا بانی کیتانیا نامی شخص تھا۔ اس نے رقص و سرود کو مراقبہ کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ لوگ اسے بھی وشنو کا اوتار کہ کر کرشن اور رادھا کی طرح پوجتے ہیں۔ اس فرقے میں ذات پات کی تمیز نہیں، سنسکرت کی بجائے مقامی زبانوں میں عبادت کرتے ہیں۔ جو

ہندو ماتھے پر ترشول کی شکل سیندھور سے بنا کر اوپر شمھرا چھڑکے وہ وشنو مت کا پیرو ہوتا ہے۔ ان دونوں وشنو فرقوں کے افراد کے علاوہ بھی بے شمار ہندو وشنو کے پجاری ہیں۔ وشنو مندروں کی تعداد کافی ہے۔

۳۔ شیو جی ہندو تثلیث میں یہ تباہی، بربادی، جنگ اور طوفانوں کا دیوتا ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک تیسری آنکھ ہوتی ہے جسے ترلوچن کہا جاتا ہے۔ اس سے غیظ و غضب کے شعلے نکلتے ہیں کہتے ہیں، عشق کا دیوتا کام دیو اس کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر ایک مرتبہ جل گیا تھا اور پھر بڑی ہی مشکلات سے عالم وجود میں آسکا۔ شیو جی کی علامت شیو لنگ ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے۔ اسے شکتی پوجا (طاقت کی پوجا) کہا جاتا ہے۔ بعض مقامات سے پرانی عمارتوں یا کھنڈروں کی کھدائی کے وقت لنگ برآمد ہوا ہے۔ اس کی بیوی کالی دیوی ہے جو پاربتی، اوما اور درگا کہلاتی ہے۔ تینوں نام تین صفات کی بنا پر ہیں۔ اسے زندگی اور موت کی دیوی کہا جاتا ہے۔ اس کی تصویر اور مجسمہ بڑا خوفناک ہے۔ زبان باہر کو نکلی ہوئی، رنگ کالا سیاہ، منہ کھلا ہوا، گلے میں سانپوں اور کھوپڑیوں کا ہار، انسانی لاشوں پر ناچتی ہوئی دکھائی جاتی ہے۔ چھاتیاں اور چہرہ خون آلود ہے۔ اوما کی حیثیت میں وہ ایک رحمدل ماں ہے۔ جس نے دونوں ہاتھ آگے کو پھیلا رکھے ہیں۔ درگا ایک غضبناک حسین عورت ہے جو شیر پر سوار ہے۔ شیو کے نام پر بھی کئی فرقے وجود میں آئے مثلاً پسوپتیار شیو سدھانت، لنگاتی اور نتارا — تیسرا جنوبی ہند میں اور چوتھا بنگال میں پایا جاتا ہے۔ شیو جی کی اولاد بھی بتائی جاتی ہے۔ ایک بیٹے کا نام کارتکے ہے جو دیوتاؤں کے لشکر کا سپہ سالار ہے۔ دوسرا گنیش ہے جو ہاتھی اور انسان کا مرکب ہے۔

جدید ہندو مذہب — جو مقبولِ عام مذہب کہلاتا ہے اس میں ان تین دیوتاؤں کی تثلیث کے علاوہ کچھ اور دیوتاؤں کی پوجا بھی ہوتی ہے، انہیں آپ ثانوی دیوتا کا نام دے لیں مثلاً (۱) اپسرائیں، جنت کی رقاصہ عورتیں (۲) انسان اور پرندے کا مجموعہ کنتر دیوتا جسے آسمانی موسیقار کہتے ہیں۔ (۳) ناگا یعنی سانپ (۴) وکرش دیوتا، درختوں کے محافظ (۵) یکشن اور یکش، دولت کے دیوتا (۶) راکشس یعنی رہزن اور بدمعاش مثلاً راون۔ علاوہ ازیں گھر، کھیت، تالاب، باغ، درخت، آبادی اور جنگل میں بکھرے ہوئے بے شمار دیوتا ہیں جن کی کل تعداد ۳۳ کروڑ ہے!

گائے کی پوجا ویدوں کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ہزاروں سال تک گائے پرستی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اتنا ضرور ہے کہ بعض لوگ جو یونانی اور مصری تہذیب و روایات یا لٹریچر سے روشناس ہوئے انہوں نے اس جانور کو مفید اور بھولا بھالا سمجھ کر اس کی حفاظت کی۔ جدید ہندو مذہب میں گائے پرستی کی شدت پائی جاتی ہے، اس سوال پر ہزاروں فسادات ہو چکے ہیں اور شاید لاکھوں جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ گاندھی جیسا پڑھا لکھا ہندو لیڈر بھی گائے کا عظیم پجاری تھا۔ ہندو گائے کے پیشاب اور گوبر تک کو مقدس سمجھتے ہیں۔ بعض اس کا پیشاب پی جاتے ہیں۔ بہر صورت بے شمار دیوتاؤں کی صف میں گائے کا بھی اضافہ کر لیا گیا ہے۔ گائے پرستی ہو یا کسی اور حیوان، درخت، پتھر یا فرضی دیوتا کی پوجا، اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی شرف و احترام کے خلاف ہے۔

ہندو مذہب کا ورن سسٹم یا ذات پات کی تقسیم انسانوں کی مختلف طبقوں میں تقسیم تو دوسرے ممالک اور دوسری تہذیبوں میں بھی ملے گی مگر یہ تقسیم جن قواعد و ضوابط اور جن مقاصد کی مرہونِ منت ہے، وہ ہندو سوسائٹی کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ آریاؤں کے اس ملک میں فاتحانہ داخلے پر مقامی آبادی کی طرف سے جس شدید مزاحمت کا سامنا ہوا اس نے فاتحین کے دلوں میں مفتوحوں کے خلاف نفرت و حقارت اور عداوت کے شدید جذبات پیدا کر دیئے۔ حکومت و سلطنت کی ذمہ داریاں سنبھالنے، اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھنے اور پیش آمدہ معاشرتی مسائل کے حل کی ضرورت کے پیشِ نظر بھی کچھ قواعد و ضوابط درکار تھے۔ سالہا سال کے تجربوں کے بعد ہندو عالموں نے وہ فارمولا ایجاد کیا جسے عرفِ عام میں (WORN SYSTEM) کہا گیا ہے۔ اس سسٹم کی قانونی تشریح منوسمرتی میں ملتی ہے۔ آریاؤں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا: برہمن، کشتری اور ویش۔ ان تینوں کے حقوق و فرائض مقرر کیے گئے اور انہیں مذہبی سند سے سرفراز کرنے کے لئے برہمن کو برہما جی کے منہ سے، کشتری کو بازوؤں سے اور ویش کو پیٹ سے پیدا شدہ بتایا گیا۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی برہمن کے سپرد ہوئی۔ حکومت و سلطنت اور حرب و ضرب کے معاملات کشتری کو سونپے گئے اور تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کے کاروبار کی ذمہ داری ویش پر ڈالی گئی۔ ظاہر ہے کہ تینوں طبقات کو جو کام دیئے گئے

تھے وہ معزز و محترم تھے اور ان کی خواہش و پسند کے مطابق۔ اب خدمت و چاکری اور غلامی کا معاملہ باقی تھا جو غیر آریاؤں ــــ شودر، اچھوت ــــ کے سپرد ہوا۔ شودر کا لفظ ہی نفرت انگیز ہے جس سے حقارت ٹپکتی ہے۔ منوجی کے مطابق شودر برہما جی کے پاؤں کے نیچے سے پیدا ہوا ہے لہٰذا ہر قسم کے حقیر و ذلیل کام کرے گا۔ خدمت بجا لائے گا، غلاظت اٹھائے گا، اور آریاؤں کی مسرت و راحت کے سامان مہیا کرے گا۔ یہی اس کی قسمت ہے جس پر اسے شاکر رہنا چاہیئے۔ اس کے سوا وہ کسی اور قسم کی زندگی کی آرزو کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے لئے سخت سے سخت سزائیں مقرر کی گئیں، اس کی خودی کو مردہ کر دیا گیا تاکہ وہ کچھ اور سوچ ہی نہ سکے۔ شاید یہ انتقام تھا اس سے اس گناہ کا لیا گیا کہ اس نے آریہ حملہ آوروں کی مزاحمت کیوں کی تھی؟

ذات پات کی تقسیم کا بندھن ہندوؤں میں نہایت شدید ہے۔ بہت سے ہندو مصلح سر پٹخ کر رہ گئے ہیں مگر اس بندھن کو توڑ نہیں سکے۔ ہندو قوم مصلحین کی پوجا تو بخوشی کرتی ہے، انہیں مہاتما بھی ٹھہراتی ہے اور خدائی کا درجہ دے کر ان کے بت بھی بناتی ہے۔ مگر مساوات کے سلسلے میں ان کی بات سننے کو ہرگز تیار نہیں ہوتی۔ ماضی قریب میں گاندھی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس شخص نے ہندو قوم کو پستی کے گڑھے سے نکال کر تختِ حکومت پر لا بٹھایا، قوم نے اسے مہاتما، باپو اور خدا جانے کیا کیا القاب دیئے لیکن اس کی بات نہیں مانی اور آخر کار وہ ایک متعصب ہندو ناتھو رام کی گولی کا شکار ہو گیا۔

ہندو مذہب کے فلسفیانہ نظام فلسفہ بڑا وسیع مضمون ہے جس کا موضوع ہر چیز کو بنایا جا سکتا ہے، لیکن ہندو مذہب کے حوالے سے جب ہم فلسفے کی بات کرتے ہیں تو تین چیزیں خاص طور پر مدنظر ہوتی ہیں، ۱۔ معاشرت، ۲۔ تصوف، ۳۔ خالص مذہبی مباحث۔ ہندوؤں میں فلسفے کی بھرمار ہے، اور اس کے بہت سے نظام وضع کئے گئے ہیں، سبب اس کا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس مذہب کا کوئی متعین عقیدہ، نظامِ حیات، متعین مذہبی عبادات و رسوم نہیں ہیں۔ لہٰذا بار بار تہذیبی و معاشرتی خلا پیدا ہوتا رہا اور بار بار عوام کو کسی اور طرف لگانے، انہیں بہلانے، ان کی توجہ اصل مسائل سے پھیرنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان فلسفیانہ نظاموں میں معروف معنوں میں الہٰیات کا عنصر برائے نام ہے۔ دیو مالائی خرافات بہت ہیں

اور پیچیدگی بے حد و حساب پائی جاتی ہے۔ ان فلسفوں میں سے بعض میں مکمل اور بعض میں جزوی مماثلت بھی موجود ہے، مگر کوئی مرکزی عقیدہ اور مرکزی شخصیت نہ ہونے کے باعث جس کسی کو بھی موقع ملا اس نے ایک فلسفہ گھڑ لیا اور اس کی اشاعت شروع کر دی۔ مندرجہ ذیل فلسفے زیادہ معروف ہیں۔

۱۔ نیائے کا فلسفہ:- نیائے کا لفظی معنی عدل و انصاف ہے۔ اس کا مدمقابل انیائے (بے انصافی) ہے۔ اس فلسفے کا بانی گوتم نامی ایک شخص تھا — گوتم بدھ کے علاوہ — جس نے نیائے سوترا نامی کتاب میں اس فلسفے کی شرح و تفصیل لکھی ہے۔ اس کی بنیاد بالعموم منطق و استدلال پر ہوتی ہے۔ زیر بحث لائی جانے والی چیزوں میں عقل، نفس، جان، رنج و راحت کو اہمیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں اس کے مباحث یہ ہیں: مادہ، مابعد الطبیعیات، تناسخ اور زمان و مکان۔ یہ فلسفہ خدا کو خالق نہیں مانتا لیکن زندہ اور زندگی دینے والا اور پھر موت لانے والا ضرور مانتا ہے۔

۲۔ ولبتیسکا: اس فلسفے کا بانی کناڈا نامی کوئی شخص ہے۔ اس فلسفے میں مادہ اور روح پر بحث ہوتی ہے، مادیات کو زیادہ تر بیان کیا جاتا ہے اور مابعد الطبیعیات کو کم۔ روح اور مادہ دونوں کو حقیقت مانتا ہے، دونوں الگ الگ ہیں مگر ان میں تعاون نہیں۔ زیادہ مباحث نفس، جان، آسمان، ہوا، پانی، مٹی روشنی اور زمان و مکان کے پائے جاتے ہیں۔

۳۔ سانکھیا: اس فلسفے کا مبلغ اعظم کپیلا یا کپلا گرو تھا۔ اس کے نزدیک روح اور مادہ دونوں موجود تو ہیں مگر دونوں میں تضاد ہے۔ جب تک دونوں میں سمجھوتہ ہے حیات ہے، جب دونوں جدا ہو جائیں تو موت اور فنا ہے۔ مادے کا جوہر پراکرتی یا پرکرتی ہے جو تین حصوں میں بٹ کر اجسام کو زندگی دیتی ہے، ستوہ جو نور و مسرت کا منبع ہے۔ راجس حرکت کا مرکز ہے اور تمس جمود و تعطل کا ——— یہ فلسفہ عملی نہیں محض خیالی و نظری ہے۔ اس میں خدا کا کوئی تصور نفیاً یا اثباتاً نہیں پایا جاتا۔ روح اور مادہ ہر دو قدیم ہیں اور کائنات میں انہی کی فرمانروائی ہے۔

۴۔ یوگ کا فلسفہ: یہ فلسفہ عملی ہے جس میں اصولِ صحت، طریقہ ہائے ریاضت صفائی، نظر جمانے کی مشق، سانس روکنے اور پھر تنفس

چلانے کی مشق، دماغی و ذہنی ریاضت، سمادھی لگانا، برہم چاریہ (عفت و پاکدامنی) کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ مشق و ریاضت سے جوگی اور راہب لوگ بعض عجیب و غریب شعبدوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اس فلسفے میں خدا کا تصور موجود ہے، علاوہ ازیں سچ بولنا (ستیہ) اور اہنسا (عدم تشدد) پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اس کی رُو سے سمادھی لگا کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو جانا اور خدا میں مگن ہو جانا ہی بڑا کمال ہے۔ جس سے آخرکار انسان کو بہت اونچا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ یوں کہیے کہ یہ فلسفہ رہبانیت و ریاضت کی (SYSTEMATIC) تعلیم دیتا ہے۔ پتنجلی نامی کسی ماہر ہندو فلاسفر نے پتنجلی سوترا نامی کتاب میں اس فلسفے کے مبادیات و مباحث بیان کئے ہیں۔

۵۔ میماسہ کا فلسفہ کسی دَور میں غالباً ویدوں کی گرفت ہندو معاشرے پر سے ڈھیلی پڑتی نظر آئی ہوگی جو اس مستقل فلسفے کے قیام کا باعث بنی۔ اس میں ویدوں کی عظمت و تقدیس پر بحث کی گئی ہے۔ وید از خود مقدس رشیوں کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ ان کے اوامر و نواہی کا ماننا ہی مسرت و نجات کا سبب ہے۔ اس فلسفے کی رُو سے: ا۔ خدا کوئی چیز نہیں۔ ب۔ کائنات ایک زندہ حقیقت ہے۔ ج۔ ارواح قدیم ہیں۔ د۔ ویدوں کی تعلیم برحق ہے اور اس سے ازلی و ابدی حیات حاصل ہوتی ہے۔ اس فلسفے کا بانی جے منی نامی کوئی ہندو فلاسفر تھا۔

۶۔ کرم کا فلسفہ کرم کا معنی عمل ہے اور مراد اس سے قربانی ہے۔ اس فلسفے کی رُو سے جب تک اچھے عمل نہ کئے جائیں جونی چکتر (تناسخ کے عمل) سے نجات ممکن نہیں۔ نیک اعمال کے ساتھ ساتھ گیان دھیان کی ضرورت ہے۔ صرف اسی طرح کوئی رُوح برہما (روح الارواح) میں جذب ہونے کی قابلیت پیدا کر سکتی ہے۔

۷۔ ویدانت کا فلسفہ اسے آپ ہندو تصوف کا نام دے سکتے ہیں۔ اپنشد ویدوں کی تفسیر و تشریح ہے اور یہ فلسفہ اسی پر مبنی ہے۔ اس میں وحدت الوجود پر زور دیا گیا ہے۔ "ہر چیز میں خدا ہے لہٰذا جس کو بھی پُوجو دراصل تم خدا کے پجاری ہو۔" ویدانت کا فلسفہ دوسرے سب ہندو فلسفوں پر غالب آ گیا ہے۔ اور اس سے ہندو سوسائٹی کو جو فائدہ ملا وہ اُن کا باہمی اتحاد ہے۔

ہندو مذہب کے بعض خاص امتیازی مسائل ۱۔ تناسخ ارواح ۔ ۲۔ روح کی قدامت ۔ ۳۔ مادّہ کی قدامت (۴) بت پرستی ۔ ۵۔ مخلوق پرستی ۔ ۶۔ وہم و خرافات کی کثرت ۔ ۷۔ فرضی دیوتاؤں اور جعلی خداؤں کی کثرت ۔ ۸۔ برہمن کی تقدیس وفضیلت ۔ ۹۔ ذات پات کا شدید بندھن ۔ ۱۰۔ غیر آریاؤں سے شدید نفرت و عداوت ۱۱۔ کوئی متعین عقیدہ نہیں ۔ ۱۲۔ کوئی متعین رہنما نہیں ۔ ۱۳۔ کوئی متعین عمل نہیں ۔ ۱۴۔ بھوت پریت ، جادو اور ٹونے ٹوٹکے پر اعتقاد ۱۵۔ فرضی حکایات اور دیومالائی افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ ۱۶۔ وحدت معبود اور توحید کا کوئی تصور نہیں ۔ ۱۷۔ کوئی متعین کتاب نہیں ۔ ۱۸۔ جزا و سزائے اعمال کا کوئی واضح اور متعین عقیدہ نہیں ۱۹۔ آریہ قوم اور ہندو مذہب کی کوئی تاریخ نہیں ۔

ہندو مذہب میں اصلاحی تحریکات ہندو مذہب میں برہمنیت اور ذات پات کے ظالمانہ بندھن کے جو غیر فطری اور متشددانہ اصول پائے جاتے ہیں ان کے خلاف ویسے تو کئی بار احتجاجی تحریکات اٹھیں مگر اس سخت جان سوسائٹی کی داد دینی چاہیئے کہ یا تو اُس نے ان تحریکوں کو سرے سے مٹا ڈالا اور یا پھر انہیں اپنا کر اپنے اندر جذب کر لیا ۔ پہلی قسم کی تحریک کی مثال بُدھ مذہب ہے ۔ ایک زمانے میں متحدہ ہندوستان پر اس کی حکومت بھی رہ چکی ہے ۔ لیکن آج ہندوستان میں بُدھوں کی تعداد بہت کم ہے اور بُدھ مت اپنے اصلی وطن نیپال اور بھوٹان وغیرہ میں سمٹنے پر مجبور ہو چکا ہے ۔ دوسری قسم کی تحریکیں دراصل متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور اسلام کی تیزی سے اشاعت کے بعد اُٹھیں ۔ ممکن ہے ان میں سے بعض تحریکیں واقعی ہندو سوسائٹی کی اصلاح چاہتی ہوں مگر بعض کا مطمع نظر صرف یہ رہا ہے کہ ہندو مذہب کو اسلام کی زد سے بچایا جائے ۔ اسلام ایک عام فہم اور سادہ دین کا نام ہے جو ہر شخص کی سمجھ میں فوراً آجاتا ہے ۔ اس کی توحید و مساوات کی تعلیم پُرکشش ہے ۔ ظلم و ستم کے تحت پسے ہوئے طبقے اس میں اپنی نجات تصور کرتے ہیں ۔ آج پاکستان بنگلہ دیش اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ باہر سے تو نہیں آئے تھے ، یہیں کے باشندوں نے اسلام کی فطری تعلیم کو بخوشی قبول کیا اور یہ ملک ایک مشترک ملک کے بجائے

مسلم علاقہ کہلانے لگا۔ اسلام کی تیزی سے اشاعت کو دیکھ کر ہندوؤں کے پڑھے لکھے طبقے — بالخصوص برہمن اور کشتری — بوکھلا گئے۔ انہوں نے ہندو مذہب میں اصلاح و ترمیم کو ناگزیر سمجھا۔ بالخصوص نسلی تعصب اور ذات پات کے غیر انسانی امتیاز کو مٹانا یا کم از کم ہلکا کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ اگر یہ تدابیر اختیار نہ کی جاتیں تو آج تاریخ یقیناً مختلف ہوتی۔ خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ یہ اصلاحی تحریکات اسلام کے ایجابی یا سلبی اثر کے پیشِ نظر برپا ہوئیں۔ ذیل میں ان تحریکات کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

شنکر اچاریہ کی تحریک

یہ ذات کا برہمن تھا۔ مالا بار کے ساحلی علاقے میں سنہ ۸ء کے آخر میں پیدا ہوا۔ ہند کے ساحلی علاقے اُس وقت عرب تاجروں کی بکثرت آمد و رفت اور ساحلی علاقوں میں ان کی بعض حکومتیں قائم ہو جانے کے باعث اسلام سے پوری طرح آشنا ہو چکے تھے۔ شنکر اچاریہ ذہین برہمن تھا۔ اس کے سامنے دو راہیں کھلی تھیں۔ ایک یہ کہ اسلام کی پُرکشش اور سادہ تعلیم کو قبول کرے اور دوسری یہ کہ اس تعلیم کے اثرات جو تیزی سے ہندوؤں اور بُدھوں میں پھیل رہے تھے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائے۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور ہندو دھرم کو اسلام کی یلغار سے بچانے کے لئے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ وہ سارے ملک میں گھوما پھرا، وسیع علم و تجربہ حاصل کیا، ہندو مذہب کی کتابوں پر حاشیے اور تفاسیر لکھیں۔ پھر ہند کے چاروں اطراف میں چار خانقاہیں — مٹھ — قائم کیں — گویا یہ چار مورچے تھے جو اُس نے ہندو دھرم کی حفاظت کے لئے بنائے تھے۔ اس کی تعلیم میں توحید کا عنصر نمایاں تھا جو واضح طور پر اسلامی اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کو مایا — حرص و دولت — کہتا تھا اور اُس کی حقیقت کا نام برہما رکھتا تھا۔ اس کے ہاں سب انسان اس حقیقت کے اجزاء ہیں۔ گویا اس طرح وہ ہندو وحدت الوجود کا بھی قائل تھا۔ اُس نے ہندوؤں کو ایک ویدک دھرم میں جمع ہونے کی دعوت دی اور ترکِ دنیا کا درس دیا۔

سوامی رامانج

یہ جنوبی ہند کا دوسرا ہندو مصلح تھا۔ مدراس کے علاقے میں سنہ ۱۰۱۶ء میں پیدا ہوا، شنکر اچاریہ کے شاگردوں سے علم حاصل کیا مگر اُن سے اختلافِ رائے کی بنا پر الگ ہو گیا۔ وہ مایا کے نظریئے کا مخالف تھا۔

توحیدِ الٰہی کا شدت سے قائل تھا اور خدا کو سب اچھی صفات کا حامل بتاتا تھا، روح و مادہ کو مخلوق ٹھہراتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کے اوتار کے عقیدے کا بھی قائل تھا اور ذات پات کے نظریئے کو مانتا تھا مگر شودروں کے کچھ حقوق مثلاً حقِ عبادت کا بھی داعی تھا۔ اُس نے توحید کے ساتھ رواداری، مساوات اور بت پرستی کی شدید مخالفت کو اپنا مذہب قرار دیا۔ نجات کے لئے عبادت و ریاضت کو لازم ٹھہرایا۔ اس کی تعلیمات میں تناسخ وغیرہ ہندو عقائد کا ذکر نہیں ملتا۔

رامانند کی تحریک ذات کا برہمن اور بہت تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس نے شنکراچاریہؔ اور رامانج کی تحریکوں کا گہرا مطالعہ کیا اور انہی کی طرز پر ذات پات کے خلاف تحریک چلائی۔ الٰہ آباد کا رہنے والا تھا اس کا زمانہ ۱۲۹۹ء ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کے مشہور و معروف شاگردوں نے اس کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان کے نام یہ ہیں: سورداس، تلسی داس، بھگت کبیرداس، سیجے دیو اور ناداجی — یہ لوگ نسلی تعصب کے علاوہ بت پرستی کے بھی خلاف تھے اور توحید کا درس دیتے تھے۔

بابا گرونانک ضلع لاہور میں تلونڈی نامی گاؤں کے کالو کھتری کے ہاں پیدا ہوا۔ شروع سے صلح کل اور سادھو منش تھا۔ اس کے استادوں میں مسلمان بھی شامل تھے۔ تعلیم یافتہ نہ تھا مگر فلاسفر قسم کا درویش آدمی تھا۔ عمر بھر سیر و سیاحت اور مختلف ادیان و مذاہب کے بزرگوں کی ملاقات میں لگا رہا۔ اس کا عارفانہ کلام بہت پرُمغز اور جامع ہے۔ اسی زمانے میں سید علی ہجویریؒ، بابا فریدؒ، سید جلال الدین بخاریؒ جیسے مشہور صوفی بزرگ اس سرزمین پر موجود تھے۔ نانک نے ان سے ملاقاتیں کیں اور ان کی تاثیر سے ان کے خیالات اور کلام میں اسلامی اثر جھلکنے لگا۔ گرونانک نے مسلم اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کی اور کعبۃ اللہ کا حج بھی کیا۔ ان کی زندگی ہی میں ہندو مسلمان ہر دو اقوام بابا نانک پر اپنا اپنا حق جتانے لگی تھیں۔ گرنتھ جو سکھ مذہب کی مقدس ترین کتاب ہے اس میں مسلمان بزرگوں مثلاً بابا فریدؒ، حضرت میاںؒ میر وغیرہما کے ملفوظات بھی درج ہیں۔ بابا نانک نے ارکانِ اسلام کی تعریف و توصیف اور عقائدِ اسلام کی تصدیق میں بہت کچھ کہا ہے۔ بابا نانک اگر مسلمان نہیں تو کم از کم اسلامی عقائد و اعمال کے رنگ میں رنگے ہوئے ایک صلح کل درویش ضرور تھے اور ان کی تعلیم پر اسلام کی گہری چھاپ بالکل واضح ہے۔

ست نامی فرقہ اس فرقہ کا بانی ایک مشہور ہندو سادھو بیربھان تھا جو مشرقی پنجاب میں ۱۵۴۳ء میں پیدا ہوا۔ یہ ایک موحد شخص تھا اور اسلامی تعلیمات سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ ست نامی غیر متعصب اور ذات پات کے جھگڑے سے آزاد ہیں۔ ان کی اصولی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان (۲) خوش اخلاقی اور زہد و پرہیز گاری (۳) بداخلاقیوں مثلاً جھوٹ، چوری، بدنظری اور بری سوچ سے گریز کرنا (۴) زبان کو لغو کلام سے اور کان کو فضول باتوں کے سننے سے بچانا (۵) حرص سے پرہیز کرنا (۶) ذات پات کے تعصب سے گریز کرنا (۷) ہمیشہ سفید لباس پہننا (۸) نشہ آور چیزوں سے مکمل پرہیز کرنا (۹) قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے پرہیز کرنا۔ (۱۰) شادی کرنا مگر صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنا اور یہ کہ مرد عورت سے افضل ہے۔ (۱۱) سادہ زندگی بسر کرنا اور خود نمائی، غرور اور تکبر سے پرہیز (۱۲) جادو، ٹونے ٹوٹکے، بدشگونی اور وہم و خرافات سے گریز کرنا۔

موہن داس کرم چند گاندھی متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں گاندھی کا نام ہمیشہ مشہور رہے گا۔ اس شخص نے ہندو قوم کو بام ترقی پر پہنچانے اور اسے آزادی دلانے میں بے پناہ جدوجہد کی۔ گاندھی گجرات کاٹھیاواڑ میں ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ قانون میں بارایٹ لا کرنے کے بعد نیم مذہبی نیم سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ ہمیشہ ایک لنگوٹی نما دھوتی باندھتے رہے۔ عدم تشدد اور ستیہ ان کے مشہور اصول تھے۔ جنہیں انہوں نے سیاست میں بھی داخل کیا۔ ہندو قوم کی سربلندی کے ساتھ ساتھ وہ آزادئ وطن کے لئے ہندو مسلم اتحاد کے بھی حامی تھے۔ ذات پات کے شدید مخالف تھے۔ ہندو قوم نے انہیں مہاتما کہا، ان کی مورتی کی پوجا کی، انہیں باپو کا نام دیا مگر آخر کار ایک ہندو ناتھو رام گاڈسے نے ہی انہیں "مسلم دوستی" کے جرم میں گولی کا نشانہ بنا ڈالا۔ آج ہندو قوم کو جو اقتدار اور حکومت کا تخت حاصل ہے اس میں گاندھی کی کوششوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔

برہمو سماج اس فرقے کا بانی رام موہن رائے بہت بڑا عالم و فاضل تھا۔ اس نے ہندی و سنسکرت کے علاوہ عربی و فارسی کی تعلیم بھی پائی تھی۔ ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک معزز برہمن خاندان میں پیدا ہوا۔

وہ شروع سے بت پرستی کا مخالف تھا اور لڑکپن سے ہی اس کا رد کرتا رہا تھا۔ مقامی زبانوں کے علاوہ انگریزی، فرنچ، لاطینی اور عبرانی کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ سن پیدائش 1772ء اور سن وفات 1833ء ہے۔ وہ مورتی پوجا کا شدید مخالف اور توحیدِ الٰہی کا قائل تھا۔ ذات پات کا شدید دشمن تھا۔ برہمن ہونے کے باوجود مساواتِ انسانی کا علمبردار تھا۔ اسی کی کوششوں سے ستی جیسی ظالمانہ اور عورت کے حقوق کی نفی کرنے والی رسم بند ہوئی۔ پڑھے لکھے ہندو رام موہن رائے کے خیالات و نظریات سے بہت متاثر تھے۔ وہ کثرتِ ازواج اور بچپن کی شادی کا بھی مخالف تھا۔ رام موہن رائے کی موت کے بعد دیوندر ناتھ ٹیگور برہمو سماج کا سربراہ ہوا۔ اس کے نزدیک بت پرستی خلافِ عقل و فہم تھی۔ وہ ویدوں کو بھی خالی از نقص نہیں جانتا تھا۔ برہمو سماج والوں کو عبادت کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے کی آزادی تھی۔ بشرطیکہ عبادت فقط اللہ کی ہو۔ ٹیگور کے ساتھ ہی برہمو سماج کی قیادت میں کیشب چندر سین کا بھی بڑا حصہ تھا۔ سین سماج کے دوسرے معروف نظریات کی اشاعت کے علاوہ بیواؤں کی شادی پر زور دیتا تھا۔ بت پرستی کا مخالف اور توحید خداوندی کا حامی تھا۔ اس نے مختلف ذاتوں بلکہ فرقوں کے درمیان شادی بیاہ کا اصول قائم کیا۔ بعد میں ٹیگور کے ساتھ اس کے کچھ اختلافات ہو گئے اور سماج دو حصوں میں بٹ گئی۔ سین نے سماج کے نظام اور عقائد کو مزید وسعت دی۔ اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں پر اس کے دروازے کھول دیئے۔ مشرقی ممالک کے علاوہ بعض مغربی ممالک بلکہ امریکہ میں بھی برہمو سماج کی تبلیغ ہوئی اور سین نے خود مغربی ممالک کے دورے کئے۔ برہمو سماج کی تحریک ایک آزاد خیال فلسفیانہ قسم کی تحریک تھی۔ اس میں توحیدِ الٰہی پر زور دیا جاتا تھا۔

آریہ سماج اس فرقے کا بانی سوامی دیانند سرسوتی 1824ء-1883ء گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن میں گھر سے نکل بھاگا اور مذہبی تعلیم حاصل کی۔ کافی مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بت پرستی کے خلاف اور اصلی ویدک دھرم کو زندہ کرنے کے ارادے سے "آریہ سماج" نامی تحریک جاری کی۔ سوامی دیانند کی سرگرمیوں، خیالات اور کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب بالخصوص اسلام کے شدید مخالف تھے۔ انہوں نے مذاہبِ عالم کا رد نہایت دلآزارانہ انداز میں کیا ہے۔ ان کے زمانے میں متحدہ ہندوستان کی ہر آبادی میں فرقہ وارانہ اور متعصبانہ مذہبی مناظرے شروع ہوئے۔ ان کی تحریک کا انداز جارحانہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو غلیظ گالیاں دی جانے لگیں۔ مسلمانوں میں شدید اشتعال پیدا ہوا۔ اور بعض جوشیلے نوجوانوں نے آریہ سماج کے بعض سرگرم اور بے لگام لیڈروں مثلاً شردھانند، لیکھرام اور راجپال کو دن دہاڑے ملک کے مختلف مقامات

پر مٹھ کلنے لگا دیا۔ یہ انگریزی حکومت کا دُور رَس کام تھا۔ مقامی آبادی کی باہمی کشمکش حکومت کے حق میں جاتی تھی۔ اس لئے حکومت نے ہوشیاری اور سیاست دانی کے تقاضوں کے پیش نظر اس مناقشت کی درپردہ حمایت بلکہ سرپرستی کی۔ دانشمندوں کا خیال ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی اور مرزا غلام احمد قادیانی ہردو کو حکومتِ وقت کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل تھی۔ تاکہ وہ مذہبی کھٹ پٹ جاری رکھیں اور غیر ملکی حکومت کی جڑیں مضبوط ہوں۔ سوامی دیانند نے ویدوں کی شرح لکھی اور ایک مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش میں تمام مذاہب کا کھنڈن (ردّ) کیا۔ اس کتاب کے چودھویں باب میں اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ پر بڑے رکیک اور ناروا حملے کئے گئے تھے۔ علماء نے اس کتاب کا مدلل اور متوازن جواب لکھا۔ آریہ سماج صرف چار ویدوں کو مانتی ہے۔ اور سوامی دیانند نے ویدوں کی من مانی شرح و تفسیر کی ہے۔ جس پر انہیں بڑا اصرار بھی تھا۔ ذات پات کی تمیز سماج کے نزدیک غلط تھی۔ علم کے دروازے ہر شخص پر کھولے گئے۔ بت پرستی، دیوی دیوتا، اوتار وغیرہ خاص ہندو مسائل کا ردّ کیا۔ اور توحید کا اعلان کیا۔ مگر خدا کو ایک ماننے کے ساتھ ساتھ وہ روح اور مادہ کی قدامت کا بھی قائل تھی۔ پس اگر روح اور مادہ ہر دو قدیم ہیں تو مخلوق نہ ہوئے۔ اس طرح ایک خدا کی توحید قائم نہ رہی۔ اور کم و بیش تین خدا ثابت ہوئے۔ علاوہ ازیں سماج تناسخ جیسے غیر عقلی نظریئے کو بھی مانتی ہے۔

جَین مت

جَین مت آج کل ہندو مذہب کا حصہ شمار ہوتا ہے۔ جینیوں کو بالعموم ہندو ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور مردم شماری میں وہ ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ گنے گئے ہیں اس میں شک نہیں کہ مذہب ہونے کے لحاظ سے یہ ایک الگ مذہب تھا۔ مگر ہندو سوسائٹی کا اژدہا جس طرح مختلف ادوار میں کئی مذاہب کو ہڑپ کر جاتا رہا ہے۔ اور اب وہ اپنی انفرادیت مٹا کر ہندوؤں کا ایک جزو بن چکے ہیں۔ اسی طرح جَینی بھی اس اژدہا کا شکار ہوئے۔ اب ان کی انفرادیت اور امتیاز کو پہچاننا مشکل ہے۔ جَین مت ہندوستان کے قدیم مذاہب میں سے ہے۔ اس کے پیروؤں کے بقول اس مذہب میں ۲۴ متفکر — رہنما — ہوئے ہیں۔ جن کی عمروں قدامت اور تعلیمات کے متعلق کئی مبالغہ آمیز دیومالائی حکایات مشہور ہیں۔ آخری دو راہنما پرسوناتھ اور مہاویر بہت معروف ہیں۔ ان سے پہلے کے رہنماؤں کے حالات پر ظلمت و گمنامی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ پرسوناتھ کا زمانہ ۸ ویں صدی قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ وہ بنارس کے ایک کشتری راجہ کا بیٹا تھا۔ عیش و عشرت کی زندگی سے منہ موڑ کر اُس نے رہبانیت اختیار کی۔ کافی عرصہ ریاضت اور سیاحت کے بعد نروان پایا اور پھر عدم تشدد، صداقت اور خوش اخلاقی کا مُبلغ بن کر ظاہر ہوا۔

جینیوں کا ۲۴واں رہنما مہاویر تھا۔ وہ ۵۴۰ قبل مسیح میں ہندوستان کے شہر پٹنہ کے قریب ایک کشتری خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ اور ماں کا تعلق بھی مگدھ دیش کے شاہی کشتری خاندان سے تھا۔ مہاویر نے تیس سال کی عمر میں رہبانیت اختیار کی اور بارہ سال تک بالکل عریاں رہا۔ پھر ایک دریا کے کنارے ۴۲ سال کی عمر میں اسے معرفت اور گیان حاصل ہو گیا۔ اُس نے خواہشات دنیوی پر فتح حاصل کی تھی۔ اس لئے جینی (فاتح) کہا گیا اور یہی نام اس کے پیروکاروں نے اپنا لیا۔ مہاویر کے فلسفے میں نروان دو طرح سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک طریقہ منفی ہے اور دوسرا مثبت ہے۔ منفی یہ کہ دکھ کا منبع خواہشات ہیں۔ جب خواہشات کو مٹا دیں تو دکھ مٹ جائے گا۔ اور دل مسرت سے لبریز ہو جائے گا۔ مثبت طریقہ یہ ہے کہ عقیدے، علم اور عمل کو درست کیا جائے۔ عمل کی درستی پانچ باتوں سے ہوگی۔

۱۔ اہمسا یا اہنسا (عدم تشدد) کسی جاندار کو تکلیف نہ دینا، بلکہ نباتات تک کو تکلیف دینے سے گریز کرنا۔

۲۔ ستیام یعنی راست بازی، قول و فعل میں صدق و راستی اختیار کرنا۔

۳۔ کسبِ حلال، رزق حاصل کرنے کے ناجائز طریقوں سے پرہیز کرنا۔

۴۔ برہمچاریام، یعنی پاکبازانہ زندگی گزارنا۔

۵۔ اپری گراہر، مادی لذتوں پر غلبہ پانا اور حواسِ خمسہ کو کنٹرول میں رکھنا۔

جین مت کا لٹریچر بارہ کتابوں پر مشتمل ہے جنہیں انگس کہتے ہیں۔ پہلے پہل یہ مت بڑا سادہ تھا۔ اس کی بنیاد عبادت و ریاضت پر نہیں بلکہ تزکیۂ نفس پر تھی۔ کوئی عبادت گاہ نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ مندر اور معبد تعمیر ہوئے۔ جس میں اپنے بزرگوں اور رہنماؤں کے مجسّمے رکھے گئے۔ پھر ان کی پوجا شروع ہو گئی۔ اور یہ مذہب بھی ہندو دھرم کی مانند مورتی پُوجا کے چکر میں پھنس کر رہ گیا۔ جینیوں کے دو حصّے ہوتے ہیں۔ ایک تارک الدنیا سادھو اور دوسرے دنیا دار کاروباری لوگ۔ ہندوؤں کی مانند وہ آواگون کے بھی قائل ہیں۔ مکتی شانتی اور نروان کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی آواگون کے چکر سے چھوٹ جائے۔ یہ صرف اچھے اعمال سے ہو سکتا ہے۔

جین مت کا گہرا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں ایک طرف تو ہندو مذہب سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے مثلاً مندروں میں مورتی پُوجا کرنا، آواگون پر یقین رکھنا اور دوسری طرف اس میں بُدھ مت سے کافی مشابہت ملتی ہے۔ مثلاً عدم تشدد، ستیہ، خواہشات

کو مٹا کر یا ان پر غلبہ حاصل کر کے نروان ۔نجات ۔ پانا ۔ بدھ مت اور جین مت کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہے ۔ دونوں میں ذات پات کی تفریق کی نفی پائی جاتی ہے ۔گویا دونوں برہمنیت سے نجات کے خواہاں تھے ۔

بدھ مذہب

بدھ مذہب

برہمنیت کے بت کو توڑنے اور ذات پات کی ظالمانہ تفریق کے خلاف سب سے زیادہ طاقتور اور بلند آواز مہاتما بدھ کی تھی ۔ ہندو سوسائٹی کے خلافِ فطرت اصول اور ہندو مذہب کے پیچ در پیچ فلسفوں کے خلاف بدھ سے پہلے بھی کئی آوازیں بلند ہوئیں مگر وہ وسیع و عریض ہندو غلبے کے گنبد میں گونج کر خاموش ہو گئیں ۔ بقول جواہر لعل نہرو ہندو مذہب کا ناپیدا کنار دریا سب اصلاحی آوازوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا رہا ۔ مگر بدھ کی آواز نے کافی عرصے تک ہندو سوسائٹی کے وسیع جنگل میں تہلکہ مچائے رکھا ۔ ایک وقت ایسا آیا کہ متحدہ ہندوستان میں ہر طرف بدھ ہی بدھ نظر آتے تھے ۔ بدھوں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور کچھ عرصے تک دنیا نے برہمنیت کے ظلم و ستم سے نجات پائے رکھی ۔ مگر آہستہ آہستہ یہ اژدہا پھر نیم مدہوشی کی کیفیت سے ہوشیار ہوا اور بدھ مذہب کو نگل گیا ۔ اب ہندوستان میں چند لاکھ بدھوں کے سوا اس مذہب کا نشان تک نہیں ملتا اور یہ مذہب دور دراز کے ممالک میں پناہ گزین ہونے پر مجبور ہو گیا ۔

بدھ مت کے ظہور سے قبل ہندوستان کے احوال

موجودہ ہندو معاشروں کا اگر ذرا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ بدھ مت کے ظہور سے پہلے ہندو سوسائٹی کا کیا رنگ ہو گا ۔ اس سوسائٹی میں کثیر التعداد فرضی دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی ۔ ایک مقدس مذہبی گروہ برہمن معاشرے کو پوری طرح گرفت میں لے چکا تھا ۔ اسے تقدس و طہارت کی سند مذہبی کتابوں سے بہم پہنچ گئی تھی ۔ وہ خدا کے منہ سے پیدا ہوا تھا لہذا کوئی گناہ یا کوئی ظلم و ستم اسے ناپاک نہیں کر سکتا تھا ۔ اسے قانون اور حکومت کی پوری مادی قوت کی مدد کے علاوہ آریہ نسل کی اخلاقی و عملی تائید بھی حاصل تھی ۔ پاکیزگی کے اس غیر انسانی اور غیر فطری تصور نے اسے بدکاری، قتل و غارت اور بداخلاقی کا مجسمہ بنا رکھا تھا ۔ اس کے ظلم و ستم کے خلاف کسی کو چوں کرنے کی ہمت نہ تھی ۔ غیر آریائی نسلیں نیم حیوانی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں ۔ انہیں خدا نے پیدا ہی ذلت اٹھانے اور

اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی خدمت کرنے کے لئے کیا تھا۔ ان کے کوئی انسانی حقوق نہ تھے۔ برہمن خدائی کے مقام پر فائز تھا۔ ساری دنیا اور اس کی تمام مادّی و روحانی لذتیں اُس کی ملکیت میں تھیں۔ عورت کو عزت و احترام اور برابری کا مقام حاصل نہ تھا۔ ویدک تعلیم اسے احمق، بیوفا اور منافق قرار دے چکی تھی۔ نجات کی اجارہ داری مذہبی ٹھیکے داروں کے قبضے میں تھی۔ مذہب پیچیدہ رسم و رواج کا ایک خفیہ نظام بن چکا تھا۔ جب تک لاکھوں کروڑوں دیوی دیوتاؤں کو خوش نہ رکھا جائے دنیوی زندگی کی راحت و مسرت محال تھی۔ اور انہیں خوش کرنے کی کنجی برہمن کے قبضے میں تھی۔ معاشرے کو ایک بندھن میں جکڑے رکھنے کے لئے عجیب و غریب پیچ در پیچ ناقابلِ فہم فلسفے ایجاد کئے گئے تھے۔ عام آدمی کو یہ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ ہندو مذہب دراصل ہے کیا، اور اس کے اصول و مبادی کون کون سے ہیں۔ شراب خوری اور جوئے بازی کو مذہبی سند حاصل تھی۔ فرضی قصّے کہانیاں اور فرضی معبود انسانی ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ بہت سے ذہین لوگ اس صورتِ احوال سے برگشتہ خاطر تھے۔ مگر بولنے کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ انسانی فطری جذبات اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتے تھے۔ ننگے سادھوؤں اور بیکار مذہبی اجارہ داروں کی فوج ظفر موج بیچارے محنت کش طبقوں اور غلاموں کی خون پسینے کی کمائی کو ہڑپ کر جاتی تھی، کمانے والے بھوکے رہتے تھے، وہ قہر آلود نظروں سے اس صورتِ حالات کو دیکھتے مگر خون کے آنسو پی کر خاموش رہنے پر مجبور رہتے۔ ہمارے نزدیک مہاتما بدھ کا عظیم ترین کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے مظلوم اور دُکھی لوگوں کی مظلومیت کو ایک زبان بخشی۔ ہم بُدھ مت کو مذہب سے زیادہ برہمنیت کی انسانیت سوز (DOMINATION) کے خلاف ایک مؤثر صدائے احتجاج سمجھتے ہیں۔

مہاتما بدھ کی اخلاقی تعلیمات اور مساواتِ انسانی کے نظریئے نے ایک طویل عرصے کے لئے برہمنیت کے ظالم بُت کو پاش پاش کر دیا۔ اُن کی اصل تعلیمات کو — بعد کی آمیزشوں سے جدا کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے شرک اور بُت پرستی پر چوٹ لگائی، بے شمار فرضی دیوتاؤں کے تصوّر کو باطل کیا، ذات پات اور جُونی چکر سے انسانوں کو آزاد کیا۔ بے شمار لایعنی اور پیچیدہ مذہبی و معاشرتی رسوم و خرافات کا ابطال کیا، نجات کے لئے ناقابلِ فہم نذر و نیاز اور قربانیوں کا عقیدہ توڑا، عورت کا احترام بحال کیا اور انسان کو نیکی، خوش اخلاقی، محبت اور مساوات کا سادہ درس دیا۔ اس بروقت اور برمحل تعلیم نے ہندوستان کی مذہبی کایا پلٹ دی اور بہت جلد ہندو اقتدار کے بجائے بُدھ مذہب کو سیاسی بالادستی حاصل ہو گئی۔

اس زمانے کا ہندوستان مذہبی انتشار، مظاہر پرستی، اخلاقی بے راہ روی، شراب خوری

جنسی آزادی، فواحش و عریانی کی کثرت، معاشرتی اونچ نیچ اور معاشی بے انصافی کے گہرے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ مہاتما بدھ کی بے لوث اور طاقتور آواز نے اسے جھنجھوڑا اور خوش خلق عدل و انصاف اور احترام انسانیت کا پیغام دیا۔ انہوں نے ظالمانہ ہندو قوانین کے تانے بانے کو تار تار کر دیا اور معاشرے کی بنیاد عدل و احسان پر استوار کرنے کی جدوجہد کی۔ غرض ہندوستان کی تاریخ گوتم بدھ کی ٹکر کے کسی اور مصلح، فلاسفر اور اخلاقی و مذہبی رہنما کو پیش کرنے سے عاجز ہے۔

مختصر حالاتِ زندگی گوتم بدھ کا اصل نام سدھارتھ تھا۔ ساکھیامنی، گوتم بدھ جیسے القاب بعد میں ملے۔ باپ کا نام شدھودھن تھا۔ نیپال کی راجدھانی کپل وستو میں جہاں ان کی خاندانی حکومت تھی، مہاتما بدھ ۵۶۵ قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ وہ باپ کے ولی عہد بھی تھے۔ لہٰذا ان کی تربیت شاہانہ انداز میں ہوئی۔ وہ ابتدا سے بہت حساس، ذہین اور غور و فکر کے عادی تھے۔ گرد و پیش کے حالات نے ان کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا۔ گو ان کی شادی نوجوانی میں ہو چکی تھی۔ اور وہ ایک بچے کے باپ بھی بن چکے تھے۔ مگر اندر سے طبیعت بے چین رہتی تھی۔ کہتے ہیں کہ سیر و سیاحت میں ان کے سامنے چار ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے ان کی زندگی کا دھارا یکسر بدل دیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک بوڑھا دیکھا، کمر جھکی ہوئی، چہرے پر جھریاں، ہاتھوں میں رعشہ، لاٹھی کے سہارے لڑکھڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ خادم نے بتایا کہ یہ بوڑھا آدمی ہے اور زیادہ بڑی عمر میں آدمی کا یہی حال ہو جاتا ہے۔ گوتم بدھ پر بڑا اثر ہوا کہ حسن و جمال اور طاقت و جوانی کا یہ انجام ہے؟ پھر ایک دفعہ ایک بیمار آدمی کو دیکھا جو مرض کی شدت سے نڈھال تھا۔ اور کرب و بے چینی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ گوتم نے سوچا کہ آہ! صحت کا یہ مآل ہے۔ پھر ایک دن ایک لاش دیکھی جسے جلانے یا دفنانے کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔ اور پیچھے پیچھے عورتیں بین کر رہی تھیں۔ گوتم بدھ کو ایک دھکا سا لگا۔ اس نے سوچا کہ زندگی کا یہ انجام ہے۔ وہ کھویا کھویا سا پریشان حال رہنے لگا۔ ایک دن اس نے ایک سادھو کو دیکھا جو گودڑی پہنے، کشکولِ گدائی ہاتھ میں لئے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت واطمینان کے آثار تھے۔ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ گوتم بدھ اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ سکون و اطمینان پانے کے لئے تاج و تخت چھوڑ کر جنگل کی راہ لوں گا۔ اور نروان حاصل کروں گا۔ وہ ایک دن چپکے سے رات کو دبے پاؤں بیوی بچے کو سکون کی نیند میں چھوڑ کر محل سے نکل گیا۔ اور رہبانیت اختیار کر لی۔ بعض علماء مثلاً سر رادھا کرشنن سابق صدرِ جمہوریہ بھارت کے خیال کے مطابق یہ گوتم بدھ کا حقائق دنیا سے

فرار تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں راحت و سکون حاصل کرنے کو گھر بار چھوڑ کر نکل گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خیال کسی حد تک درست ہو مگر گوتم بدھ کی آئندہ زندگی اس خیال کی پوری تائید نہیں کرتی۔ وہ حصولِ نروان کے بعد پھر دوبارہ دنیا میں داخل ہوا۔ دکھی انسانیت کے دکھ درد میں شریک ہوا۔ اور انہیں راحت و مسرت کا پیغام دیتا رہا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی والہام کا کوئی متوازن پیغام سامنے نہ ہونے کے باعث گوتم کو یہ پُر مشقت طویل راستہ اختیار کرنا پڑا۔ مگر اس کی عظمت و رفعت سے انکار کرنا بہت مشکل ہے۔

گوتم بدھ اندرونی سکون واطمینان کی تلاش میں پھرتا پھراتا مگدھ دلیش میں جا داخل ہوا۔ وہاں اس کی ملاقات چند غارنشین سادھوؤں سے ہوئی۔ اس نے ان کی گفتگو سُن کر ریاضت اور نفس کشی شروع کر دی۔ چھ سال یہی حال رہا۔ وہ سُوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا۔ مگر اس کا مطلب بر نہ آیا۔ اس پر بیہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ مگر دل کی دولت میسّر نہ آئی۔ اس نے از سرِ نو غذا کا استعمال شروع کر دیا۔ ساتھی اور مرید ساتھ چھوڑ گئے مگر وہ اپنی دھن میں مست رہا۔ یہ وقت بڑا نازک تھا۔ آخر کار تفکّر و تدبّر کے عالم میں گیا نامی شہر کے باہر ایک بڑ کے درخت کے نیچے اس کا دل روشن ہو گیا۔ اور اس پر موت و حیات، مسرّت و مضرت اور نفع و ضرر کا راز کھل گیا۔ اب اسے نروان حاصل ہو چکا تھا۔

وہ واپس بنارس آیا اور جن سادھوؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ان سے بحث و مناظرہ کر کے انہیں قائل کر لیا کہ دکھ درد کا راز کیا ہے۔ اور اس سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ گوتم بدھ کا یہ پہلا وعظ تھا جس کا نام رکھا گیا ہے: راست بازی کا پہیّہ متحرک کرنا۔ غالباً یہیں سے پہیّہ بدھ مذہب کا شعار بنا اور آگے چل کر اس مذہب کے فرقوں کے نام میں بھی پہیّہ داخل ہو گیا۔ اس کا دوسرا وعظ "وعظِ آتشیں" کے نام سے موسوم ہے جو ایک جنگل میں سادھوؤں کو مخاطب کر کے دیا گیا تھا۔ اس میں اس نے بتایا کہ حرص و ہوا، غیظ و غضب اور فریب و نفرت جلتی آگ کی چتا ہے اس آگ کو بجھا دیں تو نروان حاصل ہو جاتا ہے۔

پھر گوتم اپنے سادھو مریدوں سمیت مگدھ دلیش میں داخل ہوا۔ یہاں کے حاکم نے اس کا بڑا احترام کیا اور اس کا مرید بن گیا۔ جب شہرت کپل وستو میں پہنچی تو گوتم بدھ کو اس کے باپ کا دعوت نامہ ملا کہ وطن آؤ۔ گوتم کپل وستو پہنچا تو باپ نے اس کی فقیرانہ زندگی کو پسند نہیں کیا، نہ اس کی آؤ بھگت کی اور نہ کھانا پوچھا۔ گوتم بدھ سادھوؤں کو لے کر شہر میں گھر گھر بھیک مانگنے کو نکلا تو باپ کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ اسے شاہی محل میں لے گیا۔ اور بہت عزت کی۔ وہ اپنی بیوی سے بھی ملنے کو خود گیا۔ وہ اس کی مرید ہو گئی اور سنگھ (خانقاہی سلسلہ)

کی نسوانی شاخ کا انتظام سنبھال لیا۔ اسی طرح اس کا اکلوتا بیٹا راھل اور کئی رشتہ دار اس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

کپل وستو سے گوتم بدھ واپس مگدھ دیش کی راجدھانی کو روانہ ہو گیا۔ راستے میں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ اور اس کا حلقۂ ارادت وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ایک بار وہ پھر وطن لوٹا۔ اس دفعہ اس کا باپ مر گیا جس کی آخری رسوم سے فارغ ہو کر وہ پھر سیاحت کو نکل گیا۔ جنگلوں، بیابانوں اور آبادیوں میں پھرتا اور اپنا پیغام سناتا رہا۔ اس کا وعظ بڑا سادہ اور انسانی نفسیات سے قریب تر ہوتا تھا۔ آخر کار کم و بیش ۴۵ سال کی تبلیغی زندگی کے بعد بعمر ۸۰ سال گورکھ پور کے قریب کسی جنگل میں گوتم بدھ کی وفات واقع ہو گئی۔

مہاتما بدھ کی تعلیمات

مہاتما بدھ کی زندگی تک ان کے فلسفیانہ سادہ اخلاقی مشن نے اصطلاحی مذہب کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ نہ انہوں نے کوئی کتاب پیش کی، نہ عبادت گاہ بنوائی، نہ عبادت و ریاضت کا کوئی خاص طریقہ بتایا۔ یہ چیزیں ان کی موت کے کافی عرصہ بعد وجود میں آئیں۔ اب تو بدھ کی صاف اور سادہ تعلیم میں ہر ملک و ملت کی رسوم و روایات کا انبار نظر آتا ہے۔ بدھ مذہب جہاں بھی گیا اس پر وہیں کی چھاپ لگ گئی۔ یہی سبب ہے کہ اس مذہب کے دو بڑے گروہوں میں بڑے بڑے اصولی اختلافات موجود ہیں۔ اور بت پرستی دیوی دیوتاؤں کا تصور، تصویر کشی، مجسمہ سازی، تناسخ، جادو منتر وغیرہ، اس مذہب کے پیروؤں میں عام ہے۔ مندر بھی بنا لئے گئے۔ اور ان میں ہندو، تاؤمت، شنتو مذہب اور کنفیوشسنش کے مذہب کی اکثر چیزیں اختیار کر لی گئی ہیں۔

بدھ کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے: (۱) سب سے زیادہ زور نروان — نجات پانے پر دیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے ایک سادہ اور صاف طریقہ بتایا گیا ہے۔ اسے ہشت پہلو طریقہ کہتے ہیں: عقیدے کی سچائی، ارادے کی سچائی، اقوال کی سچائی، افعال کی سچائی، حلال ذرائع سے کھانا، پختہ یقین، توجہ کی سچائی اور تصور کی سچائی۔ (۲) شہوات و خواہشات کو ترک کر دینا۔ (۳) اس تعلیم میں نفیاً یا اثباتاً خدا کا کوئی ذکر نہیں آتا، اسی لئے محققین بدھ مت کو ایک اخلاقی خانقاہی نظام سمجھتے ہیں جس کا مقصد طہارت باطن اور تزکیۂ نفس کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ مشہور فرنچ مستشرق موسیو بارتھ کا بھی یہی خیال ہے۔ اور وہ اسے اپنے بدھ مت کے طویل اور دقیق مطالعہ کا نچوڑ بتاتا ہے۔ (۴) مذہبی عقائد، رسوم عبادت اور قربانی وغیرہ کے ذکر سے بھی یہ تعلیم خالی نظر آتی ہے۔ (۵) اس میں جنت و دوزخ، آخرت کی زندگی اور عذاب و ثواب نیز تناسخ کا بھی کوئی ذکر نہیں ملتا۔ (۶) اس تعلیم نے زندگی کے معاشی و معاشرتی اور سیاسی پہلو پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ ان شعبوں

کے نظم و ضبط سے یہ تعلیم خالی ہے۔ اگر کہیں ان کا ذکر آیا ہے تو اخلاقیات کے ضمن میں آیا ہے۔ (۶) بنیادی طور پر یہ نفس کشی اور اخلاقی تربیت کی تعلیم ہے۔ اسی کے نتیجے میں نروان۔ سکون و اطمینان اور راحت و مسرت کا حصول بتایا گیا ہے۔ (۸) نروان فنا کا نام تو ضرور ہے مگر فنائے کامل کا نہیں۔ بلکہ فنار و بقا کی درمیانی حالت کا نام ہے۔ (۹) بدھ کی تعلیم حصول نروان کے لئے کسی بیرونی سہارے مثلاً مذہبی عقائد و اعمال، عبادات، قربانی، توبہ و کفارہ کی قائل نہیں، بلکہ نجات کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ اخلاقی رفعت اور تزکیۂ باطن کے ذریعے سے ہی نجات ملتی ہے۔ نجات کے لفظ سے غلط فہمی نہ ہو۔ اس سے مراد عذاب اخروی سے نجات نہیں بلکہ شہوات و خواہشات کے بکھیڑوں سے نجات ہے۔ (۱۰) نسلی امتیازات کی مکمل نفی اور انسانی مساوات کا اعلان (۱۱) عورت ذات کا احترام، جسے ویدک تعلیم نے منافق، احمق اور بیوفا کے خطاب دیئے تھے۔ اور ہندو اُسے مردہ خاوند کے ساتھ جلا دیا کرتے تھے۔ (۱۲) مہاتما بدھ نے رُوح، آتما اور دیوی دیوتاؤں میں لوگوں کو نہیں الجھایا، نہ وحدت الوجود کا پیچیدہ اور ناقابل فہم فلسفہ پیش کیا۔ ہندو فلاسفی کی تمام موشگافیوں سے انہوں نے قطعی گریز کیا اور ایک سادہ، واضح اور عوامی ضابطۂ اخلاق پیش کرنے پر اکتفا کیا۔

بدھ مت کی مقبولیتِ عامہ کا راز

آگے بڑھنے اور بدھ مت کی اشاعت اور اس کے فرقوں وغیرہ کے ذکر سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں پر اس کی عام اشاعت اور مقبولیت پر مختصر بحث کرلی جائے۔ یہ مت بہت تیزی سے پھیلا اور ہندوستان، پاکستان، لنکا، سیام، نیپال، کشمیر، وسط ایشیار، تبت، ملائیشیا، انڈونیشیا، چین، فلپائن، برما، بھوٹان اور جاپان وغیرہ تک جا پہنچا۔ مہاراجہ اشوک اور کنشک جیسے فرمانرواؤں نے اس کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ اس مت کی مقبولیت کے اسباب یہ تھے۔

۱۔ گوتم بدھ کے ذاتی احوال، ان کی شہزادگی اور ولی عہدی کے باوجود رھبانیت کو اختیار کرنا اور سخت ترین ریاضتوں کے بعد حصولِ نروان کا دعویٰ۔ شاہی سے گدائی، خدمتِ خلق کا جذبہ، انسانیت سے محبت یہ سب چیزیں خاص و عام کے لئے باعثِ کشش تھیں۔ بانیٔ مذہب اور داعی کا ذاتی کردار اس کے پیش کردہ مشن اور دعوت کو مقبولِ عام بنا دیتا ہے۔

۲۔ برھمنیت کے خلاف عوامی جذبات میں ایک گھٹن تھی۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے تھے۔ مگر برہمن کے آہنی پنجے کی مضبوط گرفت سے آزادی نہایت مشکل

سمجھتے تھے۔ بدھ نے ایک سادہ سی آواز بلند کر کے ان دبے ہوئے جذبات کو زبان بخش دی۔

۳۔ عورت کا احترام اور اس کے مقام کی بلندی مہاتما بدھ کے پیغام کا ایک عملی حصّہ تھی۔ عورت صدیوں سے ذلیل و حقیر اور مجبور و مقہور چلی آتی تھی، اس نئی آواز نے اسے برابر کا درجہ دیا اور یہ چیز بھی بدھ کے پیغام کی کامیابی کا باعث بنی۔

۴۔ مہاتما بدھ کا پیغام چند سادہ اور فطری باتوں پر مشتمل تھا۔ لوگ پیچیدہ فلسفوں، لایعنی مابعد الطبیعیاتی بحثوں، بیکار رسوم و مظاہر، پیچ در پیچ عبادات، دیو مالائی فرضی کہانیوں سے اکتا چکے تھے۔ یہ چیزیں ان کی روزمرہ کی زندگی سے غیر متعلق تھیں۔ لوگوں کے ذہن و دماغ نت نئے فلسفوں کے الجھاؤ سے بیزار تھے۔ مہاتما بدھ کی سادہ تعلیم ان کی زندگی کے حالات و واقعات سے متعلق تھی لہٰذا وہ اس آواز کو سنتے ہی اس کی طرف لپکے اور سکون کا سانس لیا۔

۵۔ مہاتما بدھ کا پیغام پیچیدہ عبادات، ہزاروں لاکھوں دیوتاؤں کی پوجا اور ان کی خدمت میں قربانیاں پیش کرنے سے قطعاً خالی تھا۔ اس کے برخلاف انہوں نے سادہ خوش اخلاقی اور تزکیۂ نفس پر زور دیا۔ یہ تبدیلی لوگوں کے لئے باعثِ اطمینان اور قرینِ عقل و فہم تھی۔

۶۔ وقت کے حکمرانوں نے بھی مہاتما بدھ کے ذاتی کردار اور شاہی سے گدائی کی عملی مثال کے باعث اس پیغام کو قبول کیا۔ عوام میں اس مسلک کی تائید کا فطری رجحان ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ سیاسی طاقت اور حکومت کا زور ہو۔ اشوک اور کنشک جیسے عظیم راجاؤں نے بدھ مذہب کی اشاعت کو زندگی کا مشن بنائے رکھا۔ اس سبب سے بھی بدھ مذہب بڑی تیزی سے کئی ملکوں کا مذہب بنا۔

بدھ مذہب کی کتابوں کی تدوین

بدھ مذہب کا انحصار ابتداء میں زبانی وعظ و تلقین پر تھا۔ مہاتما بدھ نے کوئی لکھی ہوئی چیز پیش نہیں کی تھی۔ ان کی تعلیمات کی اشاعت زبانی روایات پر مبنی تھی۔ بدھ کی وفات کے بعد کتابوں اور مذہبی نظام کی تنظیم کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس مقصد کے لئے وقتاً فوقتاً کم و بیش چار مجالس شوریٰ قائم ہوئیں۔ پہلی مجلس مہاتما بدھ کے فوراً بعد منعقد ہوئی۔ جس میں مہاتما بدھ کے خیالات و مواعظ کی تدوین کا کام ان کے تین شاگردوں کے سپرد کیا گیا۔ بدھ مت کی رسوم و اخلاق کی تدوین کا بیڑا بدھ کے ایک خاص شاگرد اپالی نے سنبھالا۔ عقائد کے بارے میں بدھ کے خیالات کو مرتب کرنا دوسرے خاص شاگرد انند کے سپرد ہوا۔ ایک

تیسرے شاگرد نے بدھ مذہب کے لئے اس کے ماننے والوں کا ضابطۂ زندگی مرتب کرنے کا ذمہ لیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کام کتنے عرصے میں انجام پایا اور مرتب شدہ مواد کس کی تحویل میں رہا۔ لیکن یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ بدھ کے پیروکاروں میں اس کے اصل خیالات و ملفوظات کی جمع و ترتیب اور ان کی شرح و تفسیر میں خاصا اختلاف پیدا ہو گیا اور مختلف الخیال لوگ اپنے اپنے طریقے سے بدھ کے پیغام کی اشاعت اور شرح و تفسیر کرتے رہے۔ جب اختلاف اور تضاد حد سے گزرنے لگا تو مہاتما بدھ کے تقریباً سو سال بعد ایک دوسری مجلس منعقد ہوئی۔ مگر بحث و تمحیص کے نتیجے میں اختلاف اور بڑھ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مجلس میں تضاد کو رفع کرنے کے لئے دس متفقہ نکات بھی طے پائے تھے۔ مگر اختلاف پھر بھی دور نہ ہوا۔ مہاراجہ اشوک کے دورِ حکومت میں ۲۴۳ ق م ایک تیسری مجلس شاہی انتظام اور سرپرستی میں منعقد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اس مجلس نے ۶۰ ہزار سادھوؤں — بھکشوؤں — کو خارج از مذہب قرار دیا۔ اور اس کے بعد تبلیغی کوششیں تیز تر کر دی گئیں۔ بیرونِ ہندوستان بھی مبلغ روانہ کئے گئے۔ اب بظاہر اختلافات دب گئے تھے — مٹے نہیں — پھر پہلی صدی میں پنجاب، کابل اور کشمیر کے مہاراجہ کنشک کی زیر سرپرستی ایک چوتھی مجلس منعقد ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں متنازعہ فیہ مسائل کا تصفیہ کیا گیا۔ اشوک اور کنشک کا کردار بدھ مذہب کے لئے اسی قسم کا مددگار سہارا بنا جس طرح شاہِ روم قسطنطین اعظم کے قبولِ عیسائیت کے بعد اس کی تبلیغی سرگرمیاں اور حکومتی سرپرستی عیسائیت کے فروغ و ارتقاء کا سبب بنی تھی۔

بدھ مذہب کی کتابیں آج کل جو بدھ مذہب ہمارے سامنے ہے اس کی کتابیں فرقوں کی تقسیم کے لحاظ سے مرتب ہوئی ہیں۔ ایسی کتاب شاید ہی کوئی ہو جس پر بدھ مت کے دونوں فرقوں ہنایانہ اور مہایانہ کا کامل اتفاق پایا جاتا ہو۔ بالفرض اگر کوئی کتاب اس نوع کی مل بھی جائے تو اس کی شرح و تفسیر اور توضیح مطالب میں شدید اختلاف ہو گا۔ مناسب تو یہ ہے کہ دونوں فرقوں کی کتابوں کا ذکر ان کے عقائد و اعمال کے ضمن میں کیا جائے۔ ہنایانہ کا معنیٰ ہے چھوٹا پہیہ، یہ سادھوؤں راہبوں اور تارک الدنیا درویشوں کا فرقہ ہے۔ گویا یہ ایک چھوٹی گاڑی ہے۔ جس پر سوار ہو کر کافی دیر کے بعد صرف خواص ہی نروان حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ فرقہ مہاتما بدھ کی ابتدائی تعلیمات سے قریب تر ہے۔ اور لنکا، برما اور سیام میں پایا جاتا ہے۔ مہایانہ کا معنی ہے بڑا پہیہ، گویا یہ ایک بڑی گاڑی ہے جس میں سوار ہو کر عوام اور ہمہ شما بھی جلدی منزلِ مقصود تک

پہنچ سکتے ہیں۔ یہ فرقہ وسطِ ایشیا، تبت، منگولیا، کوریا، چین، جاپان، نیپال، بھوٹان اور انڈونیشیا میں پایا جاتا ہے۔ ہندو پاکستان میں بھی اسی دوسرے فرقے کے لوگ ہیں جن کی تعداد چند لاکھ سے زائد نہیں۔ بدھ مذہب کے پیروؤں کے بارے میں مبالغہ آمیز اعداد و شمار مشہور کیے گئے ہیں۔ محققین کے نزدیک اس مذہب کے دعویداروں کی تعداد آج سے سترہ برس پہلے سولہ کروڑ سے زیادہ نہ تھی۔ اگر آبادی میں اضافہ کی رفتار کو ملحوظ رکھا جائے تو آج کل یہ تعداد بیس کروڑ تک بمشکل ہی پہنچی ہوگی۔

ھنایانہ بدھ مذہب اور اُس کے عقائد و کتب اس فرقے میں جو بدعات رائج ہوگئی ہیں اگر انہیں نظرانداز کر دیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ فرقہ مہاتما بدھ کی تعلیمات کے قریب تر ہے۔ اس فرقے کے نزدیک بدھ کو الوہیت کا مقام حاصل ہے۔ تاہم وہ سب انسان ہی۔ یہ لوگ اب بے شمار دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں مگر امتیاز کی خاطر اُن کے نزدیک دیگر تمام دیوتا تو نقائص سے پاک نہیں مگر مہاتما بدھ گرو دیوتا اور نقائص سے مبّرا اور پاک ہے۔ دیگر تمام دیوی دیوتا نقائص سے پُر ہیں۔ بدھ عارف کامل اور لودھ ہے۔ سب دیوتا اُس کے عقیدت مند اور باجگذار ہیں کیونکہ اس نے بڑی محنت و مشقت سے دُکھ اٹھا کر نروان حاصل کیا اور تسکین و اطمینان کی راہ دریافت کی تھی۔ اس فرقہ کے نزدیک خدا، وحی، الہام، آخرت اور رُوح وغیرہ کوئی چیز نہیں۔ مستقل ہستی کوئی چیز نہیں۔ زندگی عارضی اور فریب نظر ہے۔ نروان کا مطلب یہ ہے کہ خواہشات کو مٹا کر سکون و اطمینان حاصل کیا جائے۔ نروان کے حصول کی خاطر خود اعتمادی اور محنت کی ضرورت ہے۔ کسی خارجی سہارے مثلاً عبادت، توبہ و استغفار، کفارہ یا قربانی کی ضرورت نہیں۔ اس فرقے کے لوگ بدھ کے تبرکات و آثار کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اور بدھ کے طویل و عریض بُت بناتے ہیں۔

اس فرقہ کی کتابیں تری پتاکا (تین ٹوکرے) کہلاتی ہیں۔ ا۔ ونیہ پتاکا یعنی بدھ بھکشوؤں کے لئے بدھ کے بنائے ہوئے اصول و قواعد۔ ب۔ سُتا پتاکا یعنی مہاتما بدھ کے مواعظ و ملفوظات ج۔ ابھی دھماپتاکا یعنی بدھ کا فلسفہ اور نفسیات۔ یہ کتابیں پالی زبان میں ہیں۔ اس لئے قابل فہم اور نسبتاً آسان ہیں۔

مہایانہ بدھ مذہب اور اُس کے عقائد و کتب مہایانہ کا معنی ہے بڑی گاڑی یا عظیم پہیہ، یعنی اس میں سوار ہو کر بہت سے لوگ بیک وقت جلدی نروان کے حصول کی منزل تک جا پہنچتے ہیں۔ اس فرقہ کے نزدیک

بُدھ خود خدائی کا مقام رکھتا ہے۔ وہ انسان کی شکل میں آیا تھا تاکہ نروان کے حصول کا طریقہ بتائے۔ وہ ازلی و ابدی تھا جو بُدھی اور علم کے نور سے ظاہر ہوا تھا۔ وہ انسان سے بالاتر تھا۔ بُدھی تین صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ (۱) دھرم کایا یعنی فانی و عارضی دنیا کے پیچھے ایک دائمی حقیقت ہے۔ جو کسی وقت کسی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ (۲) دلسے نرمان کایا (۳) سمبھوک کایا یعنی مجسمۂ رحمت جو بدھ کے ذریعے اس کے پیروؤں پر سایہ فگن ہے۔ ظہور کی یہ صورتیں بُدھی سیتوا ہیں۔ یعنی ایک شخص خود کامل اور نجات یافتہ ہے۔ مگر دوسروں کی خاطر اُسے قبول نہ کرے اور اُن کی رہنمائی کرنے کو دُکھ اٹھائے۔ بُدھی سیتوا بار بار ظہور کرتا ہے۔ کبھی بُدھ میں اور کبھی کسی اور طرح۔ بدھ سے قبل بھی بُدھی سیتوا ہوئے ہیں۔ اور بعد میں بھی ہوں گے۔ یہ عقیدہ ہندوؤں کے عقیدۂ اوتار جیسا ہونے کی بناء پر ہندوؤں کے لئے باعثِ کشش تھا۔ اس کی وجہ سے بے شمار دیوی دیوتا اور اوتار بُدھ مذہب میں آ داخل ہوئے۔ اور وہ بھی ہندو مذہب سے متاثر ہو کر ایک چیستان بن گیا۔ اس عقیدے کے باعث بدھ مذہب کی انفرادیت و امتیاز جلد ہی زوال پذیر ہو گیا۔ مہایانہ فرقہ کے لوگ تین بدھی سیتوا پُوجتے ہیں۔ (۱) میترَیا یعنی رحم کا بدھی سیتوا (۲) مجوسری یعنی عقل و تدبر کا مجسمہ (۳) اولوکیشٹ سوارا مصائب سے بچانے والا۔ بُدھوں میں اس کی پوجا سب سے زیادہ ہے۔ جیسے ہندوؤں میں شیو کی پوجا۔ کہتے ہیں کہ تبت میں اسے دلائی لامہ کا نام دیا گیا ہے۔

اس فرقے کی کتابیں کم ہیں۔ جو سنسکرت میں ہیں۔ اور ان کا ترجمہ چینی، جاپانی اور تبتی زبانوں میں کیا گیا ہے۔ نام یہ ہیں۔ دی منڈ شترا، لنکا وِاترا شترا، قانونِ کامل کا پدم، سورنگما شترا، سوکھا وتی یوکا یاسترا، بیداریٔ ایمان کا شترا۔

بُدھ مذہب کی تبلیغ واشاعت

بدھ مذہب ابتداء سے ہی ایک راہبانہ اور خانقاہی نظام تھا۔ مہاتما بُدھ نے خود اس نظام کی ابتدا کی تھی۔ مرید بنتے اور خانقاہی سلسلے میں داخل ہوتے وقت سب سے پہلے یہ حلف لیا جاتا تھا: میں بُدھ میں پناہ لیتا ہوں، میں دھرم میں پناہ لیتا ہوں میں خانقاہی سلسلے میں پناہ لیتا ہوں۔ ان اشخاص کو داخلہ نہیں ملتا تھا: فوجی، مقروض، غلام، تپ دق، مرگی، کوڑھ، برص جیسے امراض کا مریض، بیس سال سے کم عمر کا شخص، ماں باپ کی اجازت کے بغیر آنے والا۔ سلسلے میں داخل ہو جانے کے بعد اس پر دس اخلاقی احکام کی پابندی لازم تھی۔ قتل، چوری، شہوت پرستی، دغا فریب اور نشئی اشیاء سے پرہیز، دن چڑھے کھانا کھانا، زینت و آرائش سے گریز، زمین پر چٹائی ڈال کر سونا، ناچ رنگ سے پرہیز، سونے چاندی کے استعمال اور انہیں پاس رکھنے

سے پرہیز۔

سلسلے میں داخل ہونے کے بعد درویشوں کو مجرّد رہنا پڑتا تھا۔ وہ زرد لباس پہنتے اور گھر گھر جا کر بھیک مانگتے تھے۔ جس کا طریقہ یہ تھا کہ کشکول گدائی لے کر یا جھولی پھیلا کر گھر کے آگے کھڑے رہتے تھے۔ اگر کوئی چیز ڈال دی جاتی تو بہتر ورنہ یونہی آگے بڑھ جاتے۔ یہ لوگ اپنی زندگی مراقبہ و مطالعہ میں گزارتے تھے۔ خانقاہ کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ انہیں شب و روز کے پروگرام پر عمل پیرا ہونا پڑتا تھا۔ پہلے عورتیں سنگھ میں داخل نہ تھیں۔ سوتیلی ماں کے اصرار پر گوتم نے داخلے کی اجازت دے دی۔ اور ان کا انتظام اپنی بیوی جسودھرا کے سپرد کر دیا۔

گوتم بدھ کے بعد ساتویں صدی عیسوی تک بدھ مت کا عروج رہا مگر پھر زوال شروع ہو گیا۔ اس میں جادو منتر، ٹونے ٹوٹکے، وہم و خرافات، دیومالائی وہم و خرافات، بُت سازی اور بت پرستی، دیوی دیوتاؤں پر عقیدہ اور دوسری بدعتی رسوم داخل ہو گئیں۔ وہ ہر علاقے اور ہر قوم کے الگ الگ سانچوں میں ڈھل گیا۔ مہاراجہ اشوک اس مذہب کا پرجوش حامی و مبلغ تھا۔ اس کی حیثیت بدھ مت میں ایسی ہی ہے جیسی کہ شاہ روم قسطنطین کی عیسائیت کے باب میں۔ اس زمانے کی کامیابی کو ہم ہنایانہ بدھ مت کی کامیابی کہہ سکتے ہیں۔ گویہ مذہب مہاتما بدھ کے زمانے والا نہ تھا مگر اس کے قریب ضرور تھا۔

مہایانہ فرقہ کو اس وجہ سے تیزی سے پھیلنے اور عروج پانے کا موقع ملا کہ اس میں ہندو عقائد و اعمال اور فلسفے کی بہت کچھ آمیزش ہو گئی تھی۔ اس طرح یہ کامیابی خالص بدھ مذہب کی نہیں بلکہ ملاوٹی بدھ مت کی تھی۔ جلد ہی اس کی صورت مسخ ہو گئی اور مندرجہ ذیل ہندوانہ خیالات اس میں داخل ہو گئے۔ ظہورِ عالم کی علت ایک اعلیٰ اور بلند تر حقیقت ٹھہرائی گئی۔ گوتم بدھ کو اس اعلیٰ حقیقت کا دنیوی اور عارضی مظہر ٹھہرایا گیا۔ بعض نے اسے بشریت سے ماورا قرار دیا۔ عرفانِ کامل یا نروان کا حصول بہت لوگوں کے لئے ضروری نہ رہا بلکہ جو اس مقام پر فائز نہ ہو سکیں وہ خدمتِ خلق، رحمدلی اور جانداروں کو اذیت نہ دینے کو ہی اپنا مقصدِ حیات بنالیں تو ان کے لئے یہی کافی ہے۔ اسی دَور میں جنت و دوزخ، عذاب و ثواب اور دوسری زندگی کا تصور قائم کیا گیا۔ اب بدھ کے پیروؤں کے لئے رہبانیت، دنیا سے فرار اور مایوسی ضروری نہ رہی بلکہ گوتم بدھ پر ایمان لانا ہی نروان کے لئے کافی طاقتور وسیلہ ٹھہرا۔ اب بت گری، مجسمہ سازی، تصویر کشی اور پیکر محسوس کی پوجا عام ہو گئی۔ یوں یہ سادہ سا اخلاقی ضابطہ اور شرک کی آمیزش سے پاک مذہب شرک و بت پرستی کا اکھاڑا بن گیا۔

بعض بدھوں نے ایک فرضی "رحم کی دیوی" کو وہی معبودانہ حیثیت دے دی جو عیسائیوں میں مریم عذراء حاصل ہے۔

مہایانہ بدھ مت کے ذیلی فرقے

مہایانہ فرقہ کچھ اور ذیلی وضمنی فرقوں میں بھی تقسیم ہوا۔ ان فرقوں کے عقائد واعمال میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

(ا) ایک فرقہ صرف فکر ومراقبہ کو اصل مذہب جانتا ہے۔ ان کے نزدیک معرفت علم ومطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ جس کسی کے مقدر میں ہو اسے کسی وقت اچانک مل جاتی ہے۔ دوسرے فرقے کے نزدیک معرفت — نروان — کا حصول دشوار بلکہ عملاً تقریباً ناممکن ہے۔ لہٰذا صرف بدھ کی بزرگی وعظمت پہ ایمان لانا کافی ہے۔ (ج) ان میں ایک باطنی فرقہ بھی ہے جو اپنے تمام مذہبی امور کو پردۂ اخفاء میں رکھتا ہے۔ یہ تبت اور منگولیا کے لاماؤں کا مذہب ہے۔ ان کے اوراد وظائف میں ڈرامائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک نروان حاصل کرنے کے لئے صرف ایمان اور فکر ومراقبہ کافی نہیں بلکہ مذہبی اعمال کی بجاآوری بھی ضروری ہے۔

بدھ مت کے چار اصولی حقائق

بعض محققین کا خیال ہے کہ بدھ مت کا سارا فکر وعمل اور نظامِ تربیت وتزکیہ صرف ان چار چیزوں کے گرد گھومتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حقائق خود گوتم بدھ کے قول سے ماخوذ ہیں۔ (۱) دنیوی مصیبت۔ (۲) دنیوی مصیبت کی جڑ (۳) دنیوی مصیبت کا علم ہونا (۴) اس مصیبت کے علم کا طریقہ + بھارت کے ایک سابق صدر اور ہندو مذہب کے عظیم مفکر ڈاکٹر رادھا کرشنن کا قول ہے کہ گوتم میں انتہائی مایوسی پائی جاتی تھی۔ اور وہ انسانی تقدیر پریقین کے زوال سے شدید متاثر ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترکِ دنیا کی آسودگی میں راحت واطمینان — نروان — کی تلاش کرتا پھر

پیروانِ بدھ مت کی تقسیم

مہاتما بدھ نے اپنے ابتدائی مریدوں کے لئے جو نظام خانقاہی — سنگھ — قائم کیا تھا اور دوسرے دنیادار لوگوں کو جس طرح کام کاج میں مصروفیت کی اجازت دی تھی۔ اس کے پیشِ نظر بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ بدھ مت کے پیرو دو حصوں میں منقسم تھے۔ (۱) تارک الدنیا راھب و درویش۔ ۲۔ بدھ مت کے عام پیروکار۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے ترکِ دنیا اور رھبانیت اختیار کرنا لازم تھا۔ ان کے قواعد وضوابط اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ دوسری قسم والوں کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ:

(۱) نیکی کی زندگی اختیار کریں (۲) راھبوں کو دان دیں (۳) اپنے اسلاف کی پرستش کریں۔ (۴) ہر ماہ میں چار روزے رکھیں (۵) عمر بھر مذہبی احکام کی پابندی کریں اور یہ عہد کریں کہ

،کسی جاندار کی جان نہ لیں گے، جو خود بخوشی نہ دے اس سے کچھ نہ لیں گے، جھوٹ نہ بولیں گے، زنا نہ کریں گے، منشیات سے مکمل پرہیز کریں گے۔

بدھ مت کا زوال اتنی سرعت سے پھیلنے والا مذہب جب شاہی سرپرستی سے محروم ہوا تو بہت جلدی زوال کا شکار ہو گیا۔ اس کے زوال کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اسلام جیسے ٹھوس، متوازن اور جامع دین کے ساتھ اس کی ٹکر ہو گئی۔ یہ تصادم محمد بن قاسم کے حملے سے شروع ہوا اور فتح کے ساتھ ساتھ اس کی شدت و وسعت میں ترقی ہوتی گئی۔ اسلام کی سادہ، متعین، ٹھوس اور فطری تعلیم میں بہت کشش پائی جاتی تھی۔ اس وقت بدھ مت میں ہندو بدعات کی کافی ملاوٹ ہو چکی تھی۔ اسلام کا ریلا اس ملاوٹی زوال پذیر مذہب کو بہا لے گیا۔ مسلم فاتحین کے ذاتی اخلاق اور عدل و مساوات کے عظیم تصوّر نے تبلیغ اسلام کا راستہ کھول دیا۔ زوال کا تیسرا سبب یہ تھا کہ بدھ مذہب ایک ڈھیلا ڈھالا اخلاقی تربیت کا نظام تھا، معروف معنوں میں دین و مذہب نہ تھا۔ چنانچہ یہ جہاں بھی گیا وہاں کے مقامی مذاہب سے صلح کر لی اور انہی میں مخلوط ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ چین میں تاؤ مت اور کنفیوشزم کے ساتھ، جاپان میں شنتو مذہب کے ساتھ اور لنکا و برما میں برہمنیت کے ساتھ گڈمڈ ہو گیا۔ اس میں شرک و بت پرستی کی آمیزش ہو گئی۔ جلد ہی مہاتما بدھ کی مورتی اور بہت سے اور بت پوجے جانے لگے۔ بے شمار دیوی دیوتاؤں کو شامل عقیدہ کر لیا گیا۔ ہندو علم الاصنام اس سادہ سے اخلاقی ضابطے کو چاروں طرف سے گھیر کر ہڑپ کر گیا۔ اب یہ مذہب ہر ملک کی رسوم و روایات کا ملغوبہ بن گیا اور ہر جگہ کا بدھ مذہب دوسری جگہ کے مذہب سے جدا ہو گیا۔ زوال کا چوتھا سبب یہ تھا کہ بدھوں کے دو بڑے فرقوں ہنایانہ اور مہایانہ میں خود بدھ کی شخصیت اور ان کا مقام متنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا۔ یہ اختلاف کبھی رفع نہیں ہو سکا۔ پھر فرقہ در فرقہ کی نوبت آئی۔ یہ لوگ ہر وقت ان مسائل میں بحث و مناظرہ کرتے رہتے جو بدھ نے کبھی نہ چھیڑے تھے، بلکہ اُن میں غور و خوض کو ناپسند کیا تھا۔ پانچواں سبب یہ ہوا کہ ہندو مذہب نے بدھ مت کی یلغار سے متاثر ہو کر اپنے اندر لچک پیدا کر لی۔ بدھوں کو خوش کرنے کی خاطر یا نیک نیتی سے (کیونکہ بت پرست کے لئے ایک سو یا ایک ہزار بُت پوجنے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا) بدھ کو وشنو دیوتا کا اوتار مان لیا اور یوں بدھ مت کو اپنے اندر ضم کرنے کی راہ نکال کر اس پر فتح پا لی۔ ذات پات کی شدت میں بھی کچھ کمی آگئی اور ہندو ایک حد تک روادار بن گئے۔

دنیا بھر میں بدھوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۱۵ اور ۲۰ کروڑ کے درمیان ہے۔ اس سلسلے میں جو مبالغہ آمیز بیان دیئے جاتے ہیں وہ غالباً سیاسی مقاصد کے حامل ہیں۔ واللہ اعلم

زرتشت کا مذہب

دینِ زرتشت کو الہامی مذاہب کی فہرست میں جگہ نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس کے متعلق کتاب وسنت کی واضح ہدایت یا صراحت مفقود ہے۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے دوسرے غیر الہامی مذاہب سے یہ مذہب اپنی ابتدائی تعلیمات کی رُو سے بالکل ممتاز ہے۔ بعد کے دینِ زرتشت — موجودہ پارسیوں کا مذہب — کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اس میں خالص توحید، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، وحی و الہام، آخرت کی زندگی، ملائکہ اور دیگر برحق دینی عقائد — جو ہمیشہ انبیاء و رُسل نے پیش کئے تھے — صاف نظر آتے ہیں۔ پس اس مذہب کو ہم بدھ مت، ہندو مت، جین مت، تاؤ ازم اور کنفیوشسزم کے زمرے میں شمار نہیں کر سکتے۔ مگر مقامِ افسوس ہے کہ آج جنابِ زرتشت کی صحیح تعلیمات بھی دھندلا چکی ہیں۔ اور اُن کے نام پہ مشہور ہونیوالا مذہب آتش پرستی اور مجوسیت بن کر رہ گیا ہے۔

زرتشت کی شخصیت، نام، علاقے اور کام میں شدید اختلاف ہوا ہے۔ اسی بناء پر بعض ماہرینِ مذاہب اسے ایک افسانوی وجود قرار دیتے ہیں۔ لیکن تاریخ کی قوی شہادتوں کے پیشِ نظر یہ خیال غلط ہے۔ ان کا نام زرتشت یا زردشت یا زراتشت یا زرادشت تھا۔ مرورِ زمانہ سے اشخاص کی شخصیت یا نام وغیرہ میں اختلاف کا پیدا ہو جانا قرینِ قیاس ہے۔ بعض مؤرخین نے انہیں جادوگر قرار دیا ہے۔ جس کا سبب یہ ہوا کہ وہ مجوسی قوم میں پیدا ہوئے تھے جو جادوگری، منتر جنتر، فال گیری، مستقبل کی پیش گوئی اور ٹونے ٹوٹکے کے ماہر تصوّر کئے جاتے تھے۔ قدیم ایران میں یہ طبقہ وہی حیثیت اختیار کر چکا تھا جو ہندوستان میں برہمن کو حاصل تھا۔ لفظِ مجوس کی تحقیق میں بعض لوگوں نے MAGIC کا ذکر بھی کیا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زرتشت بھی جادوگر ہوگا۔ زرتشت کی شخصیت ایک تاریخی وجود رکھتی ہے۔ اس کا تعلق آریائی نسل سے تھا، یعنی آریاؤں کا وہ طبقہ جو ایران میں متوطن ہو چکا تھا، اسی طبقے کے ایک خاص گروہ مجوس میں زرتشت کی پیدائش ہوئی۔ آبائی پیشے کے لحاظ سے وہ زمیندار اور کاشتکار تھا۔ شخصیت کی طرح اس کے وطن اور زمانے میں بھی کافی اختلاف ہے۔ بعض نے چھٹی صدی قبل مسیح اور بعض نے ایک ہزار بلکہ دو ہزار برس قبل مسیح تک کہا ہے۔ وطن مغربی ایران یا فلسطین بتایا جاتا ہے۔ ان میں سے پہلا قرین قیاس ہے۔ جہاں تک اس کے زمانے کا تعلق ہے وہ غالباً نویں صدی قبل مسیح ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ زرتشت نام دراصل

ایرانی لفظ زراتشتر ہے جس کا معنی ہے پادری ۔ ان کے خیال کے مطابق وہ اپنے خاندان اور برادری کے آبائی پیشے کے باعث اس نام سے موسوم ہوا اور بعد میں یہی نام مشہور ہو گیا اصل نام دب کر رہ گیا ۔ خاندانی پیشہ وہی مذہبی رسوم کی ادائیگی ۔ مجوسیت ۔۔ تھا ۔ مجوسی طبقہ کسی زمانے میں سیاسی اقتدار کا مالک بھی رہ چکا تھا ۔ مگر بعد میں ان کے پاس صرف مذہبی پیشوائی (برہمنیت) رہ گئی ۔ مگر وہ اس پیشے کی بدولت بہت محترم و معزز تھے ۔ عوام کے علاوہ بادشاہ بھی ان کے علم و فضل ، جنتر منتر اور ٹونے ٹوٹکے وغیرہ کے باعث اکثر ان کے دست نگر رہتے تھے ۔ حکام اور بادشاہ غیر معلوم زمانے سے نجوم و سحر پر عقیدہ رکھتے چلے آئے ہیں ۔ شاہی درباروں میں نجومیوں اور فال گیروں کا بڑا اثر و رسوخ چلا آیا ہے ۔ بعض حکام تو ان سے پوچھے بغیر کوئی کام سرانجام ہی نہیں دیتے تھے ۔ سُنا ہے کہ بھارت میں اب تک برہمنوں سے یہ کام لیا جاتا ہے ۔ اس سبب سے مجوس کو شاہی درباروں میں عمل و دخل حاصل تھا ۔ بادشاہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ اپنی دعاؤں اور بعض عملیات سے بلاؤں کو دفع کرتے ہیں ۔ مجوسی قدیم آریاؤں کی مانند سورج اور آگ کی پوجا کرتے تھے ۔ وہ تعبیر خواب اور علم نجوم شناسی کے بھی ماہر خیال کئے جاتے تھے ۔ ویسے تو سورج پرستی اور آتش پرستی وغیرہ دنیا کی کئی مشرک قوموں میں بطور قدر مشترک جاری رہی ہے ، لیکن ممکن ہے کہ یہ معیت ایران اور ہندوستان میں آریاؤں کے اصل وطن وسط ایشیا سے ان کے ساتھ آئی ہو ۔

ایران قبل از زرتشت

زرتشت کے ظہور سے قبل ایران میں مظاہر قدرت کی پوجا عام تھی سورج ، چاند ، آگ ، پانی ہوا اور زمین کی پوجا ہوتی تھی ۔ کئی جگہ درختوں کو بھی پوجا جاتا تھا ۔ بڑ اور پیپل کے درخت کا تقدس بلکہ معبودیت ہندو مذہب میں بھی رہی ہے ، بلکہ اب تک موجود ہے ۔ اسی طرح اسلاف پرستی بھی عام تھی ۔ بزرگوں کی ارواح کو خوش کرنے اور انہیں راحت پہنچانے کے لئے کئی رسوم ادا کی جاتیں ۔ ان کے نام کے بُت بنائے جاتے ۔ انہیں عبادت گاہوں میں سجایا جاتا اور ان کے سامنے رسوم پرستش بجا لائی جاتی تھیں ۔ مرور ایام کے ساتھ یہ کام ایک خاص طبقہ انجام دینے لگا ۔ غالباً یہی مذہبی طبقہ آگے چل کر مجوس کہلایا ۔ پھر اس لفظ کے معنی اور استعمال میں وسعت پیدا ہوئی ۔ اور مجوسی ایک مذہب کہلانے لگا ۔ ایرانیوں کے معبودوں میں کئی فرضی دیوتا بھی شامل تھے ۔ ان کے لئے قربانیاں دی جاتیں ۔ ان کے ہیکل اور معبد تیار کئے جاتے تھے ۔ بعض دیوتا خاندانی ہوتے تھے ۔ اور بعض عوامی ۔ مثلاً متھرا ایک عوامی دیوتا تھا ۔ متھرا کی پوجا کا وجود ہندوستان میں بھی ملتا ہے ۔ اور متھرا نامی شہر غالباً اسی کے نام پر موسوم ہوا ہے ۔ ہندوستانی اور ایرانی آریاؤں کے معبود اور دیوتاؤں میں

بہت کچھ مشابہت بھی پائی جاتی تھی۔ سبب یہ تھا کہ یہ دونوں طبقے اپنے اصل وطن وسطِ ایشیا میں ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ وہیں سے دیوتا پرستی ان کے ساتھ آئی اور جہاں جہاں یہ لوگ پہنچے ان فرضی خداؤں کو بھی ساتھ لے گئے۔ ایران میں سانڈوں اور بعض مؤنث دیویوں کی پوجا بھی ہوتی تھی۔ زرتشت نے اس صورتِ احوال کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کافی جدوجہد کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے نبیوں عاموص اور یسعیاہ کا ہم عصر تھا۔ جو اپنی قوم کو شرک و خرافات کی دلدل سے نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ عین ممکن ہے کہ زرتشت پر انہی انبیاء کی تعلیمِ توحید کا اثر پڑا ہو اور انہی کی مانند اس نے ایران میں توحیدِ الٰہی کا پرچم بلند کیا ہو۔ واللہ اعلم

حالاتِ زندگی

زرتشت کی پیدائش صحیح تر روائت کی بناء پر سنہ ۶۶۰ قبل مسیح میں اور وفات 583 قبل مسیح میں واقع ہوئی۔ مولد و منشاء مغربی ایران کا شہر رے تھا۔ والد کا نام پوراشاسپ تھا۔ پارسیوں (موجودہ زرتشتیوں) کی روائت کے مطابق مجوسیوں کو اپنے علمِ نجوم کے حساب سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بچہ اگر زندہ رہ گیا تو مستقبل میں ان کے مذہب کی بربادی کا باعث ہو گا۔ اس بناء پر انہوں نے اسے آگ میں ڈال دیا مگر وہ نہ جلا اور صحیح وسلامت الاؤ سے باہر آ گیا۔ اس بناء پر اُسے شبیہ ابراہیمؑ بھی کہا گیا ہے۔ اہلِ ایمان کو آگ میں جلانے کے واقعات تو متعدد بار پیش آئے ہیں۔ مگر الاؤ سے زندہ وسلامت باہر نکل آنے کا ذکر قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے سوا کسی اور کے متعلق نہیں آیا۔ تاریخ نے ایک عظیم یمنی تابعی ابوحازم ذقیس بن سعد کے متعلق بھی بتایا ہے کہ اسے جھوٹے نبی اسود عنسی نے اپنے اوپر ایمان نہ لانے کے جرم میں سپردِ آتش کیا تھا۔ مگر وہ معجزانہ طور پر بچ نکلے اور اسود نے انہیں یمن کی حدود سے نکلوا دیا تھا۔ ابوحازمؒ مدینہ میں آ بسے تھے اور صحاح کی کئی روایات ان سے مروی ہیں۔ وہ بالعموم سہل بن سعدؓ انصاری سے روائت کرتے ہیں۔ امام ابن کثیرؒ نے البدایہ میں ابوحازمؒ کے واقعات درج کئے ہیں۔ یہ امر حیرت ناک ہے کہ بعض دیگر اقوام میں بھی اس سے ملتے جلتے واقعات کا چرچا موجود ہے۔ مثلاً ہندوؤں میں سنت پرہلاد کا اور پارسیوں میں زرتشت کا۔ زرتشت کی زندگی کے حالات بالعموم پردۂ خفا میں ہیں، بالخصوص ابتدائی حالات۔ بعض روایات کے مطابق اس نے اپنے وقت کے ایک عظیم فلاسفر استاد برزین کرزا سے مذہب اور طب وغیرہ کی تعلیم پائی۔ وہ شروع سے ہی سوچ بچار کا عادی اور خادمِ خلق تھا۔ بیس سال کی عمر میں پہاڑوں پر گوشہ نشینی اختیار کر لی اور وہیں پر اُسے عرفان یا الہام حاصل ہوا تھا۔ اب وہ توحیدِ الٰہی کی منادی میں مصروف ہو گیا۔ قوم بت پرستی، وہم و خرافات پرستی اور دیوتا پرستی

کی عادی تھی۔ لہٰذا ایک چچازاد بھائی کے سوا کسی نے اس کا پیغام قبول نہ کیا۔ زرتشت غیر مرئی معبود کی دعوت دیتا تھا۔ جب کہ لوگ پیکرِ محسوس کے خوگر تھے۔ عوام سے مایوس ہو کر آخر وہ شاہِ بلخ گشتاسپ سے ملا۔ اس کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ شاہ نے پہلے تو خود اس سے بحث و مناظرہ کیا اور پھر درباری علماء اور مملکت کے فضلاء سے اس کی گفتگو کرائی۔ اس بحث و مذاکرہ میں زرتشت کی فتح ہوئی۔ درباریوں نے جب دیکھا کہ بادشاہ زرتشت کا مذہب قبول کرنے پر آمادہ ہے تو انہیں خدشہ پیدا ہوا کہ اس صورت میں ہمیں یہ نیا مذہب قبول کرنا پڑے گا۔ ورنہ دربار زداوی اور امارت ووزارت سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ بھرے دربار میں مذہبی علماء کے 33 سوالات کے جواب زرتشت پہلے ہی دے چکا تھا۔ اب سازش کر کے بادشاہ کے کان بھرنے لگے کہ یہ شخص جادوگر اور شعبدہ باز ہے۔ درباری سازشیں اور محلاتی اکھاڑ پچھاڑ بڑی خوفناک چیز ہے۔ بادشاہ نے زرتشت کو گرفتار کرا کے جیل میں ڈلوا دیا۔ اتفاق سے انہی دنوں میں بادشاہ کا نہایت محبوب گھوڑا شدید بیمار ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی چاروں ٹانگیں سکڑ کر پیٹ کے ساتھ چمٹ گئیں۔ بادشاہ بہت پریشان ہوا۔ کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا۔ زرتشت نے شاہ کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ میری چار شرطیں قبول کرلے تو میں گھوڑے کا روحانی علاج کر کے اسے تندرست کر دوں گا۔ بادشاہ کو وہ شرطیں قبول کرنی پڑیں۔ وہ شرائط یہ تھیں۔ پہلی ٹانگ کی درستی پر بادشاہ مجھ پر ایمان لے آئے، دوسری کی درستی پر اس کا بیٹا اسفندیار بھی ایمان لائے۔ اور اس کے مذہب کی حمایت کا وعدہ کرے۔ تیسری ٹانگ کے سیدھا ہونے پر ملکہ بھی ایمان لائے اور چوتھی ٹانگ کی درستی پر اُن سازشیوں کے نام ظاہر کیے جائیں جو اُس کی گرفتاری میں ملوث تھے۔ زرتشت نامہ — پارسیوں کی کتاب — کا بیان ہے کہ گھوڑا تو زرتشت کی دعا سے تندرست ہو گیا مگر بادشاہ نے بھی اس سے چار مطالبے کیے۔ پہلا یہ کہ شاہ کے انجام کا حال بتایا جائے۔ دوسرا یہ کہ آخرت میں اس کا مقام اسے دکھایا جائے۔ تیسرا یہ کہ اسے حاضر و غائب کا علم دلایا جائے۔ اور چوتھا یہ کہ قیامت سے قبل اس کی جان نہ نکلے۔ لکھا ہے کہ فرشتے اپنی نورانی چمک دمک کے ساتھ شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ انہیں دیکھ کر شاہ اور درباری ڈر گئے مگر نوریوں سے آواز آئی کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف تجھے یہ حکم دینے آئے ہیں کہ زرتشت کا دین قبول کر لو کیونکہ وہ سچا ہے۔ اس پر شاہ گشتاسپ اور درباریوں نے زرتشتی مذہب کی قبولیت کا اعلان کر دیا۔ جہاں تک اس افسانے کی حقیقت کا سوال ہے اس کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ مگر تاریخ یہ ضرور بتاتی ہے کہ شاہِ بلخ زرتشت کا پیروکار اور حامی بن گیا تھا۔ شاہی سرپرستی میں دینِ زرتشت نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ بادشاہ نے

اس مذہب کی اشاعت میں ذاتی دلچسپی لی اور حکومت کے ذرائع و وسائل اس مقصد میں لگا دیئے۔ شوقِ تبلیغ میں شاہ نے توران میں بھی یہی مذہب پھیلانا چاہا۔ — معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایران اور توران دو الگ الگ مملکتیں تھیں، شاہ توران کے انکار پر جنگ ہو گئی۔ یہ جنگ زرتشت کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ایک تورانی فوجی نے — جو کسی طرح قتل کی نیت سے اس کے پاس آ پہنچا تھا، خنجر سے اسے ہلاک کر ڈالا۔

زرتشت کی تعلیمات ہمارے پاس جس قدر تاریخی دلائل و وسائل موجود ہیں، بعد میں پیدا ہونے والی بدعات و اختراعات کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو ان کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زرتشت کی تعلیم توحید خداوندی کی بنیاد پر قائم تھی۔ اس نے مظاہر فطرت کی پرستش، بت پرستی، ارواح و اشجار کی پوجا، دیوی دیوتاؤں پر عقیدہ، آگ کی پرستش حیوان پرستی اور تمام مراسم شرک کی سختی سے تردید کی تھی۔ ثنویت — دو خداؤں کا اعتقاد — بھی اس کی تعلیم کا حصہ نہ تھی۔ بلکہ یہی اسے دینِ زرتشت میں آتش پرست مجوسیوں نے داخل کر دیا۔ اسی طرح آج پارسیوں کو آتش پرست مانا جاتا ہے۔ اور اسلامی لٹریچر اور تاریخ میں بھی ان لوگوں کو مجوس ہی کا نام دیا گیا ہے۔ مگر یہ لوگ زرتشت کے بعد ہی اس مجوسی — قدیم مجوسی — شرک کو دینِ زرتشت کا حصہ بنانے میں کامیاب ہو سکے۔ زرتشت کے ہاں اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی ذات و صفات کا واضح تصور، آخرت کی زندگی، جنت و دوزخ، فرشتوں پر ایمان غرض تمام وہ بنیادی عقائد جو شروع سے انبیاء کی تعلیم کی بنیاد رہے ہیں، ہمیں صراحت سے ملتے ہیں۔ وہ خیر کی قوت کے ساتھ شر کی قوت اور شیطان کا قائل تو ضرور ہے مگر شر کی الوہیت و معبودیت کا قائل نہیں۔ قوتِ خیر کا قوتِ شر پر بالآخر غالب آنے کا تصور خود بتاتا ہے کہ پہلی قوت الٰہی ہے۔ اور دوسری شیطانی، لہٰذا معبودِ برحق صرف ایک ہے۔ شیطانی قوت اپنے اندر کوئی خدائی یا معبودیت نہیں رکھتی۔ یہ انسان کی کوتاہی علم و نظر ہے کہ وہ اسے بھی معبودیت کا مقام دے دے۔

یہ بات واقعی افسوسناک ہے کہ دنیا کی بعض دوسری عظیم شخصیتوں کی طرح زرتشت کے گرد بھی دیومالائی حکایات اور وہم و خرافات کے انبار لگا دیئے گئے، جن کی وجہ سے اس کی شخصیت اور تعلیمات کی اصلیت کو پہچاننا دشوار ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب و سنت کی صراحت و وضاحت کی عدم موجودگی کے باعث ہم دینِ زرتشت کو الہامی مذاہب و ادیان کے زمرے میں شمار کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہ کہنا سراسر بے انصافی اور کوتاہی علم پر مبنی ہو گا کہ دینِ زرتشت ثنویت یا آتش پرستی کا مذہب تھا۔ اس کے برخلاف اس کی تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا جائے

تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ دعوت خالص توحید اور اسلامی تعلیمات کی دعوت تھی۔ زرتشت کے نام ونسب اور قبیلہ و وطن کی مانند اس کی تعلیمات میں اختلاف کا باعث ہمارے خیال میں یہ ہوا کہ ثنویت دوسرے تمام ایرانی مذاہب مثلاً مجوسی مذہب، مانوی مذہب اور قدیم آریائی مذہب میں ایک قدرِ مشترک کے طور پر جاری وساری رہی ہے۔ دین زرتشت میں داخل ہونے والوں نے بسے اس مذہب کا بھی جزو بنا ڈالا اور اب یہ مذہب بھی ثنویت سے ہی پہچانا جانے لگا۔ دوسرا سبب وہ انقلابی نشیب و فراز ہیں جن سے زرتشت کے مذہب کو گزرنا پڑا۔ کبھی شاہی سرپرستی حاصل ہوگئی اور اسے سلطنت کا سرکاری مذہب بنا یا گیا۔ کبھی اس کے مخالفوں کا غلبہ ہوا تو انہوں نے بزورِ شمشیر اس کے پیروؤں اور تعلیمات و علائم کو مٹانے کی پوری کوشش کی نتیجہ یہ نکلا کہ اصل تعلیمات یا تو غتر ربود ہوگئیں یا ان میں تحریف اور تغیر و تبدل واقع ہوگیا۔ تیسرا سبب یہ ہوا کہ اس مذہب کے نوشتوں اور کتب وصحائف میں تعلیم وعقائد اور اعمال وعبادات کے باب میں تضاد پایا جاتا ہے۔ انہیں پڑھ کر تشویش ہوتی ہے اور بعض لوگ اس مذہب کو شرک وکفر اور آتش پرستی کا دین ٹھہرا دیتے ہیں۔

ان اسباب میں سے جہاں تک پہلے کا تعلق ہے، ایرانی مذاہب میں ثنویت کا وجود اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کہ دینِ زرتشت کو بھی انہی کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔ عقلی و نقلی دلائل اس کے خلاف موجود ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ زرتشت کے زمانے میں مجوسی اس کے خلاف رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے تو ایک روایت کے مطابق زرتشت کو آگ میں جلا دینے کی بھی کوشش کی تھی۔ اگر زرتشت عقیدۂ ثنویت میں ان کا ہم نوا ہوتا تو وہ کاہے کو ایسا کرتے؟ بعض اہلِ تحقیق کا خیال ہے کہ مجوسی ثنویت اور زرتشت کی ثنویت میں ایک واضح فرق پایا جاتا ہے۔ مجوسی اور مانوی مذاہب تو صریحاً دو خداؤں کے قائل ہیں۔ خالقِ خیر اور خالقِ شر۔ یزدان واہرمن کہ ان کی قوتیں مساوی ہیں۔ اور دونوں متوازی لائنوں پر کائنات کے نظام میں کارفرما ہیں۔ لیکن زرتشت جس ثنویت کا قائل ہے وہ صرف اس حد تک ہے۔ کہ خالقِ خیر اور ہے اور خالقِ شر اور — اہورمزدا اور انگرامینو — اب وہ دونوں کائنات میں اپنا اپنا کام کر رہے ہیں مگر چونکہ خیر بالآخر شر پر غالب آئے گی لہٰذا عبادت کے لائق صرف خالقِ خیر — یزداں اہورمزدا ہے۔ نہ کہ خالقِ شر — آہرمن، انگرامینو — لیکن اگر ہم ان حضرات کی تحقیق کو مان لیں تو اہورمزدا قادرِ مطلق نہ رہا، صرف عبادت کی حد تک تو وہ خدائے برحق ہوگا مگر خلق کی حد تک اُس کی ٹکر کا ایک دوسرا خدا بھی موجود ہوگا۔ یہ بات زرتشت کی توحیدی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ عقیدۂ ثنویت (چاہے وہ کسی شکل میں ہو اور کسی حد تک ہو) زرتشت

کی تعلیم کا حصہ نہ تھا بلکہ بعد کا اضافہ ہے۔

اب رہا دوسرا سبب تو یہ واقعی ایک معقول سبب ہے۔ مگر اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ثنویت تعلیمات زرتشت کا حصہ یا بنیاد رہی ہے۔ انقلابات دہر نے تو یہودیت و نصرانیت جن کا اصل نام اندروسے قرآن صرف اسلام تھا۔ یہ نام بھی بعد کی پیداوار ہیں۔ — جیسے الہامی مذاہب میں تحریف اور ترمیم و اضافہ کر کے شرک و تثلیث اور الوہیت و ابنیت انبیاء کے عقائد ان میں داخل کر دیئے تھے۔ مذہب زرتشت بھی اگر انقلابات دہر کا شکار ہو کر بدل گیا ہو تو لائق تعجب نہیں۔ اردشیر بابکان کے دورِ حکومت میں زرتشتی صحائف و کتب کا جلا دیا جانا اور اس مذہب کے پیروؤں پر مصائب و شدائد کا نزول ایک تاریخی حقیقت ہے بعد میں ساسانی عہد میں جب پھر سرکاری سرپرستی اس مذہب کو حاصل ہوئی تو از سرِ نو اوستا ترو کتب کو مدون کیا گیا۔ اب زرتشت کا زمانہ کچھ بعید ہو چکا تھا۔ مجوسی خود اس مذہب میں داخل ہوئے اور اس پر مجوسیت کی چھاپ لگا دی۔ ان کتابوں میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس کا باعث بھی گردشِ دوراں اور مجوسی سازش کو ہی قرار دیا جانا قرینِ قیاس ہے۔ تحریف و تغیر تو الہامی کتابوں — تورات و زبور اور انجیل — میں بھی راہ پا چکی ہے اور خود یہودی و نصرانی اہلِ علم اس کا کھلا اعتراف کر چکے ہیں۔ پھر ایک ایسا مذہب جس میں توحید کی تعلیم ہونے کے باوجود ہم اسے بدیں سبب الہامی نہیں ٹھہرا سکتے، کہ اس کا کوئی ٹھوس اور یقینی ثبوت نہیں ہے، اس میں اگر تحریف اور ترمیم و اضافہ نے راہ پالی ہو تو لائقِ تعجب نہیں۔

بہرحال ہم ظنِ غالب کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ زرتشت کا مذہب اصل میں توحید کا دین تھا۔ ثنویت اور آتش پرستی، بلکہ دیوی دیوتاؤں تک کی پرستش اس میں بعد میں داخل ہو گئی۔ خیر و شر کی قوتوں کا بالمقابل ہونا اور ابتداء سے ان کا مقابلہ کون نہیں مانتا؟ فقط اتنا ماننے سے ثنویت لازم نہیں آتی۔ زرتشت کی موجودہ تعلیمات کی کتابوں مثلاً وِسپا تیر، گاتھا اور ژند اوستا وغیرہ سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ خیر کے غلبہ پانے کی اُمید رکھتا ہے اور شر کو بحیثیت معبود کے نہیں بلکہ ایک قوت کے طور پر مانتا ہے۔ اسلام نے بھی، نیز یہودیت نے، شر کو شیطان — ابلیس — کی طرف منسوب کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اسلام شیطان کی شخصیت کا قائل ہے۔ جو منبع شرارت و فساد ہے — خالقِ شر نہیں — اور زرتشت اسے ایک قوت ٹھہراتا ہے۔ لیکن صرف اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا جس کی بناء پر اُسے ثنویت کا معتقد قرار دیا جائے۔ پس زرتشت کا موحد ہونا اور خدا کی ذات و صفات کا قائل ہونا ایک ایسا امر ہے جو اس کی تعلیم سے ظاہر ہے۔

زرتشت نے خدا کو آہورمزدا کہا ہے جس کا معنی ہے: خداوندِ نور — قرآن کہتا ہے:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ زرتشت نے خدا کی جو صفات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں: (۱) خالقِ کائنات (۲) ازلی و ابدی (۳) سب سے اعلیٰ و برتر (۴) غیر متغیر (۵) رحیم (۶) پاکیزہ ترین (۷) منبعِ طہارت و نظافت (۸) خود مختار (۹) مالکِ کُل (۱۰) عاقل ترین، عقلِ کُل (۱۱) ہر چیز کو جاننے والا (۱۲) سب کچھ دیکھنے والا (۱۳) رازوں کا جاننے والا (۱۴) واحدِ ذاتی نہ کہ عددی (۱۵) اس کا ہم سر و ہمتا نہیں (۱۶) بے مثل و بے نظیر (۱۷) حواس کی گرفت سے باہر (۱۸) ہم سے ہماری ذات سے بھی قریب تر (۱۹) مہربان و بخشندہ (۲۰) غیر فانی (۲۱) منصف و عادل (۲۲) حافظ و نگران (۲۳) ہر چیز سے قوی تر۔

ان صفات کو پڑھ کر اندازہ کیجئے کہ کیا یہ وہی صفات نہیں جنہیں انبیاء نے اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا ہے؟ اور ان صفات کا ماننے والا کیا ثنویت کا قائل ہو سکتا ہے؟

زرتشت کے مذہبی نوشتے دساتیر میں فرشتوں کے لئے سروش اور فرشتہ کے الفاظ موجود ہیں۔ اور ان کی بعض صفات کا بھی ذکر آتا ہے۔ اسی طرح وہ بعث بعد الموت، آخرت کی زندگی اور ثواب و عقاب، جنت و دوزخ کا بھی قائل ہے۔ یہ تعلیمات بالکل اسلام کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ اگر ان کتابوں میں ان عقائد کی تفصیلات کے سلسلے میں کوئی فرق و امتیاز ہو تو ہمارے گزشتہ بیان کے مطابق وہ بالکل قرینِ قیاس ہے۔

زرتشت کی اخلاقی تعلیمات

زرتشت کی اخلاقی تعلیمات میں طہارتِ افکار، صدق و راست بازی، ظاہری و باطنی صفائی، دوسروں کی مالی و اخلاقی امداد و نصرت جیسے اخلاقی فضائل و شمائل کا ذکر آتا ہے۔ ہر دین و مذہب اور ہر قوم و ملت کے مذہبی سربراہ اور مصلح یہی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ زرتشت نے رہبانیت کی شدید مخالفت کی ہے۔ وہ عائلی زندگی گزارنے اور معاشرتی صلاح و فلاح کا داعی تھا۔ اس کی تعلیمات میں محنت و مشقت کرنے اور ہاتھ سے روزی کمانے کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ مگر یہ امر بڑا افسوسناک ہے کہ اس کے ہاں ــــ موجودہ مذہبی کتب و دساتیر کی رُو سے ــــ محرمات سے نکاح جائز تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شق بھی بعد میں بڑھائی گئی تھی کیونکہ مجوس اور دیگر ایرانی مذاہب میں ایسے نکاح کا عام رواج تھا۔

مذہبِ زرتشت کا ارتقاء

جیسا کہ بیان ہو چکا زرتشت کے زمانے میں شاہِ بلخ گشتاسپ نے اس مذہب کو قبول کیا اور پھر وہ اس کا پُرجوش داعی و مبلغ بن گیا۔ اس کی جدّ و جہد سے یہ مذہب نہ صرف ایران میں بلکہ اس سے باہر بھی اشاعت پذیر ہوا۔ اس مذہب کا دوسرا سرپرست اور سرگرم داعی سائرس (گورش) تھا جو جدید ترین

تحقیقات کے مطابق ذوالقرنین کے نام سے قرآنِ عظیم میں سراہا گیا ہے۔ سورۃ الکہف میں اس کا حال پڑھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ واقعات، یہ کردار و افعال اور یہ اقوال و افکار ایک بندۂ مومن کے ہی ہو سکتے ہیں۔ سکندر مقدونی تاریخ کی معتبر شہادتوں کے پیشِ نظر مشرک و بت پرست تھا لہٰذا جن لوگوں نے اسے ذوالقرنین بتایا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ مذہبِ زرتشت کا تیسرا سرپرست بادشاہ دارا ابن گشتاسپ ہوا ہے۔ (یہ گشتاسپ غالباً اوپر بیان شدہ شاہ بلخ کے علاوہ کوئی اور شخصیت ہے۔) چھٹی صدی قبل مسیح میں ایرانی حدود کے اندر اور باہر بھی مذہبِ زرتشت عروج پر رہا۔ تاریخی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ یہ مذہب یونان تک پھیل گیا تھا۔ زرتشت کے ۲½ سو سال بعد سکندرِ اعظم کا حملہ ہوا۔ ایران پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے سارا زرتشتی لٹریچر نذرِ آتش کرا دیا۔ اب جو کتب و صحائف موجود ہیں یہ اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد زبانی یادداشتوں اور ذہنی کدو کاوش کی بناء پر وجود میں آئیں۔ تیسری صدی عیسوی میں ساسانی خاندان کا دور دورہ تھا۔ اس زمانے میں مذہبِ زرتشت کو از سرِ نو عروج حاصل ہوا مگر یہ عروج اس پہلے غیر مبدل مذہب کا نہیں بلکہ جدید مدوّن شدہ محرّف مذہب کا تھا۔ اسلامی فتوحات کے زمانے تک یہی حالت قائم رہی۔ جب اسلام کا ریلا ایران کی طرف بڑھا تو اس کی سادہ تعلیمات، بے لوث عقیدۂ توحید، مساواتِ انسانی کے نظریئے اور اصل زرتشتی مذہب سے بہت کچھ ملتی جلتی تعلیم کے باعث اہلِ ایران دھڑا دھڑ اسلام لے آئے۔ آج کل پارسی ــــ مذہبِ زرتشت کے مدعی ــــ لوگوں کی تعداد ایران، ہندوستان اور پاکستان میں صرف چند لاکھ تک محدود ہے۔ یہ لوگ آتش پرست ہیں اور دینِ زرتشت میں بہت سی بدعات کو داخل کر چکے ہیں۔

زرتشتی مذہب کی کتابیں یہ تو ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس مذہب کی کتابیں ایک بار بالکل نابود ہو جانے کے بعد از سرِ نو محض زبانی یادداشت کی بناء پر لکھی گئیں لہٰذا تحریف اور ترمیم و اضافہ سے پاک نہیں رہ سکیں۔ اس بات میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ مذہبی کتابوں کو نوکِ زبان حفظ کرنے کا رواج مسلمانوں کے سوا کسی اور قوم میں نہیں رہا۔ لہٰذا نہیں کہا جا سکتا کہ زرتشت مذہب کی کون کون سی کتاب میں کتنی اور کہاں کہاں تحریف ہوئی ہے۔ اور کون کون سا حصہ تغیر و تبدل سے محفوظ ہے۔ جنابِ زرتشت کی اصل تعلیمات کے پیشِ نظر ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان کتابوں میں جہاں جہاں شرک و بت پرستی، آتش پرستی، ثنویت اور دیوی دیوتاؤں کی تعظیم و تکریم کا بیان ہے وہ حصے ضرور الحاقی ہیں۔ مجوسیوں نے اپنے خاص مقاصد کی خاطر اور اپنے قدیم مذہب کی حمایت میں بے شمار وہم و خرافات اور دیو مالائی افسانے تراشے ہوں گے جو آج کل مذہبِ زرتشت کی کتابوں کی زینت

ہیں۔ بہرصورت ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔ (۱) دساتیر خرد (2) دساتیر کلاں (۳) ماوستا خرد (۴) اوستا کلاں۔ ماوستا پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اور ہر حصے کا نام الگ الگ ہے۔ ان میں سے ایک حصہ ژند اور ایک پاژند کہلاتا ہے۔ ایک حصے کا نام گاتھا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ خود زرتشت کی تحریر ہے۔ گاتھا میں شرک کی آمیزش کم ہوئی ہے۔ مگر دوسرے حصے دیوی دیوتاؤں کی مدح وثنا سے لبریز ہیں۔ یہ حصے ضرور مجوسیوں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے آگ کی پوجا، زمین، بادل اور روشنی کے دیوتا وغیرہ کی پوجا بھی اس مذہب کی کتابوں میں داخل کر دی ہے۔ موجودہ پارسیوں میں یہی مذہب رائج ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی لٹریچر میں انہیں مجوس کا نام دیا گیا ہے۔ اس لفظ کا عام معنی آتش پرست ہی سمجھا جاتا ہے۔ ان کتابوں میں جناب زرتشت کے اصل عقیدہ آخرت کو تناسخ اور رجعت سے بدل دیا گیا۔ رجعت کے عقیدے کی رُو سے لوگ ایک بار پھر اس دنیا آئیں گے۔ بعض مسلمان فرقے بھی اس عقیدہ رجعت سے متاثر ہوئے اور دھڑلے سے اپنی کتابوں میں اس کا اظہار کیا۔ مذہب زرتشت میں جنت و دوزخ کا نقشہ بالکل ڈرامائی اور دیومالائی انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اوپر بیان شدہ اوستا کے علاوہ ایک ماوستا اور بھی ہے جسے اوستائے آخر THELATER AWESTA کہا جاتا ہے۔ اس میں دیوی دیوتاؤں کی عظمت اور مدح وثنا کا بیان ہوا ہے۔ زرتشت کا بیان کردہ اہورمزدا اس میں معبود کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض ایک فرضی دیوتا کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ اسے فرشتوں کی عبادت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ صفات خداوندی کو فرشتے ٹھہرایا گیا اور پھر ان میں خدائی صفات رکھ دی گئی ہیں۔ اس کتاب نے قدیم ایرانی آریاؤں کے دیوتا متھرا اور کئی اور دیوتاؤں نیز مظاہر قدرت کی پوجا کو داخل مذاہب کر دیا۔ اب وہ تمام چیزیں جن کی پرستش زرتشت نے موقوف کر دی تھی۔ از سر نو مذہب کا جزو بنا دی گئیں۔ جادو، منتر، ٹونے ٹوٹکے پھر مذہب کا حصہ قرار پائے۔ جس طرح مہاتما بدھ کے بعد خود اسی کو معبود بنا لیا گیا تھا اسی طرح زرتشت کو بھی پجاریوں کا سردار اور نجات دہندہ تصور کیا جانے لگا۔ زرتشت کے مذہب توحید کا یہ خوفناک اور افسوسناک انجام انسانوں کی شرک پسندی اور اوہام پرستی پر ایک واضح بُرھان کی حیثیت رکھتا ہے۔

مذہب زرتشت کا زوال ایک زمانے میں پورا ایران، وسط ایشیا، اور قریبی ممالک کے کچھ حصے زرتشتی تحریک کے زیر اثر آ گئے تھے۔ اس کے اثرات عراق اور یونان تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن بانی مذہب کی وفات کے بعد جلد ہی یہ تحریک زوال پذیر ہو گئی۔ مجوسیت کی قوت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں جو اس نئے مذہب کو یوں

کھا گئی جیسے برہمنیت نے بدھ مذہب کو ہڑپ کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گاتھا زرتشت کی خود نوشت کتاب تھی۔ یہ مناجاتِ الٰہی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ مقدس مجموعہ بھی تحریف سے نہ بچ سکا۔ جہاں تک اس کی شرح و تفسیر کا تعلق ہے، مجوسیوں نے کھینچ تان کر اسے ثنویت، مظاہر پرستی، دیوتا پرستی، آتش پرستی اور بت پرستی سے ملا دیا۔ زرتشت کی کامیابی کے زمانے میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خاموشی سے کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہے۔ جونہی موقع ملا انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اور توحید و خدا پرستی کے ایک سیدھے سادے مذہب کو شرک اور مخلوق پرستی کا اکھاڑا بنا کر رکھ دیا۔ زرتشت نے آہورمزدا کو قادرِ مطلق، خالقِ لم یزل اور معبودِ واحد بتایا تھا مگر بعد میں وہ "خدائے خدائگان" بن کر رہ گیا۔ اس کے تحت اور اس کے جلو میں بے شمار دوسرے خداؤں کی پوجا پاٹ کا رواج ہو گیا۔ مذہبی رسوم و عبادات میں شرک آ گھسا۔ زرتشت سے پہلے مردوں کی لاشوں کو آبادیوں سے باہر لے جا کر رکھ دیتے تھے تاکہ انہیں جنگلی درندے اور فضا کے پرندے کھا جائیں۔ زرتشت نے یہ رسم موقوف کر کے مردے دفنانے کا سلسلہ شروع کر دیا مگر اس کے بعد پھر وہی پہلی وحشت ناک رسم شروع ہو گئی۔ سائرس اور ساسانی خاندان کی سرپرستی میں یہ مذہب پھلا پھولا لیکن سکندرِ اعظم کے حملے نے اس کا حال بہت پتلا کر دیا۔ جب اسلام کے ساتھ اس مذہب کا تصادم ہوا تو یہ ایران سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس کے پیرو آج کل ہندو پاکستان کے ساحلی شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ اور کچھ ایران میں بھی۔ ایران میں ان کی تعداد کا اندازہ دس پندرہ ہزار اور پاکستان و ہند میں تقریباً بارہ ہزار ہے۔ یہ لوگ تاجر ہیں اور بالعموم بڑے شہروں مثلاً کراچی، بمبئی، سورت اور احمد آباد میں بستے ہیں۔ آتش پرستی کے باعث انہیں آتش پرست کہا جاتا ہے۔ اور خود یہ پارسی کہلاتے ہیں۔ واللہ غالب علیٰ امرہ،

کنفیوشس کا مذہب

اس مذہب کو ماننے والوں کی ایک معقول تعداد گو جاپان میں بھی موجود ہے مگر اصلاً یہ چین کا مقامی اور قدیم ترین مذہب ہے۔ نئے سوشل انقلاب کے بعد کا حال ابھی واضح نہیں ہو سکا مگر اس سے قبل کے زمانے میں چین کے اندر بدھ مذہب کے علاوہ دو بڑے مقامی مذاہب کا عمل دخل رہا ہے۔ ایک تاؤ ازم اور دوسرا کنفیوشس ازم۔ مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں مختلف آراء و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ بھی تاحال پوری طرح معلوم نہیں ہے۔ کہ کمیونسٹ انقلاب کے بعد ان کا چین میں کیا حال ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک بڑے صوبے سنکیانگ

غالباً چینی ترکستان ـــــ میں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے۔ پھر اخبارات میں یہ خبریں آتی رہیں کہ یہی صوبہ زیادہ تر ثقافتی انقلاب کی زد میں رہا ہے۔ سالہا سال تک اس صوبہ کو ثقافتی انقلاب کی آماجگاہ بنائے رکھا گیا ہے۔ سوشلسٹ کمیونسٹ اصطلاحات کو سمجھنے والوں کا خیال ہے کہ اب صوبہ سنکیانگ میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں رہی۔ چین سے بھاگ کر قریبی ممالک یا عرب ممالک میں پناہ لینے والے چینی مسلمانوں کے بیانات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

چین کے قدیم مذاہب

بدھ مذہب تو چین میں ہندوستان سے درآمد ہوا مگر اس کے دو مقامی مذاہب میں سے تاؤازم قدیم تر ہے۔ اس کے بعد قدامت میں کنفیوشس کے مذہب کا نمبر آتا ہے۔ لیکن اس امر میں کچھ الجھاؤ موجود ہے، کیونکہ بتایا گیا ہے کہ لاؤزے، لاؤتسے یا لاؤتذے جو تاؤازم کا بانی تھا۔ وہ کنفیوشس کا ہم عصر تھا۔ مؤخرالذکر نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ یہ دونوں مذہب کئی امور میں مشترک بھی ہیں۔ مثلاً مقامی روایات اور قومی و موروثی اوہام و خرافات کی دونوں میں یکساں بھرمار ہوئی ہے۔ تاؤ کا لفظی معنیٰ ہے طرزِ عمل، رویّہ، وطیرہ یا طریقہ۔ پہلے یہ لفظ قانونِ قدرت یا انسانیت کی فطری رفتار کے معنی میں استعمال ہوا مگر بعد میں مذہب کا ہم معنی بن گیا۔ تاؤازم بنیادی طور پر ایک تعلیمی، اخلاقی اور سیاسی ضابطۂ عمل ہے۔ اس ضابطے پر مقامی روایات، موروثی رسوم اور قدامت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ چینی قدامت پرست ہونے کے باعث اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ تاؤازم کا بانی کنفیوشس کی مانند اپنے فلسفیانہ افکار اور حکیمانہ خیالات کے باعث بہت مشہور اور مقبولِ عوام رہا ہے۔ اس کے فلسفیانہ افکار کے ساتھ ـــــ فلاسفۂ یونان کی مانند ـــــ دیوی دیوتاؤں، غیر مرئی ارواح اور بزرگوں کی پرستش کو شامل کر کے ایک مذہب تیار کیا گیا جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ تاؤمت کے نام سے معروف ہو گیا۔

جہاں تک حکیم کنفیوشس کا معاملہ ہے، وہ بھی ایک دانشمند، فلسفی، سیاست دان اور معلّمِ اخلاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ فلاسفۂ یونان کی مانند اس نے مقامی دیوی دیوتاؤں، رسم و رواج، معاشرتی آداب اور بت پرستی کو نہیں چھیڑا۔ نہ مقامی روایات سے تعرض کیا، بلکہ جہاں تک ہو سکا ان کے ساتھ مصالحانہ رویّہ اختیار کیا اور انہیں اپنی اخلاقی و سیاسی افکار و تعلیمات کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ شاید یہ اس لئے کیا کہ لوگ بدک نہ جائیں اور اس کے اصل کام میں رکاوٹ نہ پڑے۔ پھر جس طرح ہمیشہ ہوا ہے آگے چل کر یہ فلسفہ اور دانشمندانہ افکار ایک مستقل مذہب کی حیثیت اختیار کر گئے۔ جس طرح تاؤازم چین کا قدیم ترین مذہب ہے۔ (یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ لاؤزے سے بھی ہزاروں سال

پہلے سے چلا آرہا تھا۔ اُس نے صرف اُسے مرتب و مدوّن کرنے کا کام انجام دیا) اسی طرح کنفیوشسزم موجودہ سوشل انقلاب سے قبل تک وہاں کا عظیم ترین مذہب شمار ہوتا تھا۔ کنفیوشسزم کا نام مغرب سے درآمد ہوا ہے۔ اصل نام کنگ چیو یعنی تعلیماتِ کنفیوشس ہے۔ اسے چیو شیئو بھی کہتے ہیں۔ یعنی علماء کی تنظیم ۔۔ اس گروہ کی تاریخ کا شراغ 25 صدی قبل سے لگایا جاتا ہے۔ اور کم و بیش دو ہزار برس تک چین پر اس کی حکومت بھی رہ چکی ہے۔ لہٰذا ہر آنے والی حکومت اسی کی پیرو ہونے کی مدعی تھی۔

حکیم کنفیوشس 551 تا 476 قبل مسیح چھٹی اور ساتویں صدی قبل مسیح کا زمانہ وہ عظیم دور ہے جس نے دنیا کو مہاتما بدھ (ہندوستان میں) درتشت (ایران میں) اور کنفیوشس (چین میں) جیسے عظیم مصلح، فلاسفہ اور بانیانِ مذاہب دیئے۔ کنفیوشس چین کے ایک ضلعی حاکم شیولیان کے ہاں اس کے بڑھاپے میں پیدا ہوا۔ تین سال کی عمر تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ 15 سال کی عمر میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔ 19 سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ اور اولاد بھی ۔۔ فوراً بعد وہ سرکاری ملازمت میں لے لیا گیا۔ بحیثیت اہل کار اس کا کردار بہت نمایاں رہا۔ اس نے عوام کی خدمت کی اور ان کے دل موہ لئے۔ 22 سال کی عمر میں ملازمت کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ اس نے نوجوانوں کو آدابِ حکومت اور صحیح اجتماعی و سیاسی کردار کی تربیت دینے کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ بہت سے لوگ اس کے شاگرد بن گئے جن میں شاہی خاندان کے بعض نوجوان بھی تھے۔ مزید مطالعہ اور تحقیق کی خاطر وہ دلرالخلافہ پہنچا اور شاہی کتب خانے سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس وقت فنِ موسیقی شاہی سرپرستی میں ترقی پذیر تھا۔ کنفیوشس نے اس فن میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ اسی جگہ اس کی ملاقات تاؤ ازم کے بانی لاؤتسے سے ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کے مداح تھے۔ کنفیوشس نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا اور عمر بھر اس سے متاثر رہا۔

اتفاق سے اسی سال حکومت میں انقلاب آگیا۔ وہ پہلی حکومت کا زبردست حامی تھا لہٰذا ملازمت ترک کر کے گوشہ نشین ہو گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس زمانے میں اس کے مشاغل کیا رہے ہوں گے، کیونکہ اس کی زندگی کا یہ حصہ پردۂ خفا میں مستور ہے۔ 52 سال کی عمر میں اسے دوبارہ ملازمت ملی جس سے اپنی ذہانت و دیانت کے بل پر ترقی کر کے وزیرِ عدالت کے عہدہ تک جا پہنچا۔ اس نے جرائم کو ختم کرنے کے لئے دن رات محنت کی اور بہت کامیاب رہا۔ انصاف کو عام کیا، رشوت ستانی اور سفارش کا قلع قمع کیا۔ لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ اس کے اثر و رسوخ اور ہردلعزیزی کے باعث بادشاہ اس سے خائف رہنے لگا۔ اور اُس سے بے رُخی کا رویہ اختیار کر لیا۔ کنفیوشس

با اصول ہونے کے ساتھ ساتھ قانون پسند پُرامن شہری تھا، جب اس نے شاہی رویّہ بدلا ہوا دیکھا تو سبب کو بھانپ لیا۔ ملازمت ترک کر دی اور سیر و سیاحت کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ حالات موافق ہوئے تو پھر وطن واپس لوٹا اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ 476ھ یا 78ھ قبل مسیح میں اس کی وفات واقع ہو گئی۔

کنفیوشش کی تعلیمات

حکیم کنفیوشس کی تعلیمات میں ہمیں قدرت، آسمان اور نیکی وغیرہ کے الفاظ تو ضرور ملتے ہیں مگر مذہب، خدا، وحی و الہام، آخرت، عذاب و ثواب، آخرت کی زندگی اور حیات و ممات کی حقیقت پر اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر ماہرینِ مذاہب کا خیال ہے کہ وہ مذہبی مقتدا تو نہیں تھا البتہ معاشرتی و اجتماعی اور سیاسی مصلح و رہنما ضرور تھا۔ زندگی کے اجتماعی شعبوں، باہمی ہمدردی، انصاف اچھی حکومت، بہتر حاکم جیسے موضوعات پر اس کے ہاں بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ چونکہ اقتدار کے زمانے میں اس نے خود ایک مثالی نمونہ پیش کیا تھا۔ اور نوجوانوں کو طرزِ جہانبانی اور آداب و رموزِ حکومت سکھانے میں بڑی دلچسپی لی تھی۔ اس لئے آگے چل کر وہ "بانیٔ مذہب" مشہور ہو گیا۔ اہلِ چین کے احوال پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دین و مذہب کے باب میں بڑے آزاد خیال واقع ہوئے ہیں۔ ان میں مذہبی تعصب نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے اپنی اجتماعی زندگی کے معاملات میں حکیم کنفیوشس کی تعلیمات کو ہمیشہ اعلیٰ مقام دیا ہے۔ کنفیوشش عوام میں رائج رسوم و روایات کو مٹانا نہیں چاہتا تھا بلکہ ان کی ایسی اصلاح کرنا چاہتا تھا کہ وہ اجتماعی زندگی میں دوسروں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکیں۔ اس کی تعلیمات مابعد الطبیعیاتی مسائل کے متعلق خاموش ہیں۔ وہ رعایا سے زیادہ حاکم کی اصلاح کا قائل تھا۔ اس کے خیال میں ایک نیک اور مثالی حاکم رعایا کی اصلاح کر کے اُسے مثالی بنا سکتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ "حاکم کو اپنے نام کی لاج رکھنی لازم ہے۔" اس کا یہ بھی قول ہے کہ اچھی حکومت وہ ہے جس میں بادشاہ بادشاہ ہو، وزیر وزیر ہو، باپ باپ ہو، بیٹا بیٹا ہو۔ معاشرہ اس کے نزدیک ایک حکمِ خداوندی ہے جس کی ترکیب پانچ رشتوں سے ہوتی ہے: ۱۔ بادشاہ اور رعایا ۲۔ شوہر اور بیوی ۳۔ باپ اور بیٹا ۴۔ بڑا بھائی اور چھوٹا بھائی ۵۔ دوست اور دوست۔ اس کے نزدیک بری خواہشات انتشار و اضطراب کا باعث ہیں۔ مگر فطرتِ انسانی پر اعتماد رکھنا ضروری ہے۔ جب بھی انسانیت بیدار ہو گی لاقانونیت رخصت ہو جائے گی

کنفیوشس کی جماعت

جماعت سے ہماری مراد یہ نہیں کہ معروف معنوں میں اقتدار حاصل کرنے یا سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے اس نے کوئی

پارٹی بنائی تھی۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنے شاگردوں یا معتقدین کا ایک حلقہ قائم کیا تھا۔ اس جماعت کو وہ رموز دانشمندی، اسرار اخلاق و سیاست اور آداب زندگی سکھاتا تھا۔ ان کی تعداد تین ہزار تک بتائی گئی ہے۔ جن میں سے ۶۵، ۷۵ کو وہ خود غیر معمولی قابلیت کے علماء کہتا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت اس کے پاس حاضر رہتے تھے۔ اس کی زندگی اور اقوال و افعال کا گہرا مطالعہ کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اپنے حقیقی فرزند کی موت پر اس نے رنج و غم کا اظہار نہیں کیا لیکن عزیز شاگردوں کی موت اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس کی موت پر شاگردوں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا، بعض قبر کے نزدیک جھونپڑیاں ڈال کر کئی سال تک وہیں پڑے رہے۔ اس کی قبر کے قریب سنگ مرمر کا کتبہ نصب کیا گیا ہے جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

"بہترین حکیم اور قدیم معلم"۔

کنفیوشس لٹریچر

اس عظیم دانش مند و حکیم کا اہل چین پر گہرا اثر پڑا ہے۔ اس نے معروف معنوں میں کوئی دین و مذہب پیش نہیں کیا بلکہ ایک اخلاقی و معاشرتی اور نیم سیاسی ضابطۂ عمل پیش کیا تھا۔ وہ موروثی رسوم اور صدیوں سے رائج شدہ مذہبی اعمال پر بھی عمل کرتا رہا، مثلاً ارواح پرستی اور آباء پرستی۔ اہل چین ارواح خبیثہ کے بڑے قائل ہیں اور ان سے خائف رہتے ہیں۔ اسی سبب سے وہ ارواح کی پرستش کرتے ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس ان میں فطرت کی پوجا بھی رواج چلا آیا ہے۔ کنفیوشس نے ان کے عقائد یا مراسم عبادت کا کوئی رد نہیں کیا۔ ان کے ہاں شانگٹی نامی ایک فرضی معبود یا خدا کی پرستش ہوتی ہے۔ اور اس کے گرد بے شمار اوہام و خرافات کا ہالہ بنا ہوا ہے۔ تاؤ غیر شخصی خدا ہے جو قوت و قدرت اور فطرت کے معنی میں پوجا جاتا ہے۔ چینیوں میں ایک قسم کی ثنویت کا عقیدہ بھی موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چیز میں ثنویت ہے مثلاً نور و ظلمت، آسمان و زمین اس ثنویت کے مظاہر ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک ثنویت کے متخالف مظاہر باوجود متخالف ہونے کے ہم آہنگ ہیں۔ پہلی قوت — مثلاً روشنی اور آسمان یانگ YANG کہلاتی ہے۔ اس قوت کی صفات یہ ہیں۔ کہ وہ: مثبت ہے، مذکر ہے، سفید ہے، گرم ہے، خوش ہے اور متحرک ہے۔ دوسری قسم کی قوت ین YIN کہلاتی ہے۔ جو پہلی کے بالمقابل: منفی ہے، مؤنث ہے، سیاہ ہے، سرد ہے، نرم ہے اور غیر متحرک ہے۔ یانگ تو آگ اور دھوپ کا جوہر ہے اور ین سایۂ اور پانی کا جوہر۔ یہ دونوں قوتیں بعض حالات میں باہم تبدیل بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً لکڑی ین ہے مگر آگ میں ڈالنے سے یانگ ہو جاتی ہے۔ چینی ان دونوں قوتوں کو ایک دائرے میں ظاہر کرتے ہیں، یانگ کو سفید اور ین

کو سیاہ، دونوں نصف نصف مگر اطراف میں ہم آغوش۔

کنفیوشس کے شاگردوں نے اس کی تقریروں اور مقالات کو جمع کیا تھا کہتے ہیں کہ تاریخی دستاویزات کی ایک کتاب پر کنفیوشس نے ایک مقدمہ لکھا تھا۔ علاوہ ازیں بہار و خزاں پر ایک نظم بھی لکھی تھی جو غیر مکمل رہ گئی۔

حکیمانہ اقوال (۱) اعلیٰ آدمی جو چیز اپنے اندر تلاش کرتا ہے ادنیٰ اسے دوسروں میں ڈھونڈتا ہے (۲) تفکر کے بغیر علم ایک بیکار محنت ہے اور علم کے بغیر تفکر خطرناک ہے۔ (۳) محتاط آدمی سے فاش غلطی نہیں ہوتی۔ (۴) آدمی اصولوں پر غالب آسکتا ہے مگر اصول آدمی پر غالب نہیں آسکتے۔

کنفیوشسزم کے خصائص (۱) وہ مشرق بعید کا قدیم ترین مذہب ہے (۲) یہ دراصل ایک عمرانی و معاشرتی اور سیاسی نظام ہے جسے چین کے حکمرانوں نے اکثر مفید جانا اور اس پہ عملدرآمد کیا ہے۔ (۳) کہتے ہیں کہ موجودہ سوشل انقلاب نے اسے طاقت سے محروم کر دیا ہے۔ مگر وہ عوام کے دلوں سے ابھی تک محو نہیں ہو سکا۔ (۴) اس کی تعلیم عام فہم، سادہ اور لچکدار ہے۔ اس کے ساتھ فطری بھی ہے۔ (۵) چین کے علاوہ جاپان میں بھی اس مذہب کا کافی اثر پایا جاتا ہے۔ کروڑوں جاپانی اس کے معتقد ہیں۔ (۶) یہ معروف معنوں میں مذہب نہیں اس لئے اس کی کوئی متعین بنیاد نہیں۔ (۷) اس قدر لچکدار، ملنسار اور صلح پسند ہے کہ بدھ مذہب کے ساتھ غلط ملط ہو گیا۔ بعد میں جب اسلام اور عیسائیت نے چین کی سرزمین پر قدم رکھا تو بآسانی انہیں وہاں جگہ مل گئی۔ مقامی رائج مذاہب کے ساتھ ان کا کوئی واشگاف تصادم نہیں ہوا۔ چینی لوگ روادار اور غیر متعصب ہیں۔ ہر مذہب کی رسوم و عقائد کو بآسانی قبول کر لیتے ہیں۔ آباء پرستی فطرت پرستی، مظاہر فطرت کی پوجا، وہم و خرافات اور دیوی دیوتاؤں کا تصور ہر چیز ان میں آن گھسی ہے۔ کئی لوگ بیک وقت کنفیوشسزم، تاؤازم اور بدھ مت پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ بعض عبادت گاہیں متصل بلکہ مشترکہ ہیں۔ ایک مذہب کے مطابق عبادت سے فارغ ہو کر ایک دروازے سے باہر نکلے اور دوسرے دروازے سے دوسری عبادت گاہ میں چلے گئے۔ وہاں جا کر دوسرے مذہب کے مطابق عبادت کر لی۔ ''اللہ اللہ خیر صلا''۔ (۸) اس مذہب میں روحانی تسکین و اطمینان کا کوئی سامان نہیں لہٰذا اسے مادی مذہب کہا جاتا ہے۔ غالباً اسی لئے چین میں کمیونزم کا عمل دخل نسبتہً بآسانی ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی ''مذہبی عبادت''، یا مابعد الطبیعیاتی فلسفہ و عقیدہ نہیں پایا جاتا۔ (۹) سیاسی اتار چڑھاؤ

اور حکمرانوں کے اُلٹ پھیر میں یہ مذہب ہمیشہ انقلابات کی زد میں رہا ہے۔ اس کی کتابوں کو ایک دَور میں جلا دیا گیا تھا اور اس کے پیروؤں پر تشدّد بھی ہوا، مگر جب دوسری حکومت آگئی اور اس نے موافقت کا اظہار کیا تو از سرِ نو زندہ ہو گیا۔ پھر حالات کا رُخ پلٹا تو خوابِ غفلت کا شکار ہو گیا۔(۱۵) اس وقت تو معلوم نہیں کہ اس مذہب کا چین میں کیا حال ہے۔ مگر سوشلسٹ انقلاب سے پہلے تک یہ وہاں کے باشندوں کی اکثریت کا مذہب تھا۔ اس سے قبل دو ہزار برس تک یہ مُلک کا سرکاری مذہب بھی رہ چکا ہے۔ اتنی مدّت مدید تک کسی مذہب کے لئے سرکاری سرپرستی تاریخ عالم کا ایک عجیب واقعہ کہلا سکتا ہے۔ اگر انقلاب کے نتائج کو ——— جو نامعلوم ہیں ——— ذہن سے خارج کر دیا جائے تو اس مذہب کے پیروؤں کی تعداد شاید ۲۵ کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ واللہ اعلم

یہودیت

تعارف

یہودیت، دنیا کے قدیم مذاہب میں سے ہے۔ یہودیوں کے خیال میں اس مذہب کی تاریخ کی ابتداء ابراہیمؑ سے ہوتی ہے، مگر قرآن نے یہ کہہ کر ان کا قول ردّ کر دیا ہے کہ: مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو موحّد مسلمان تھا اور مشرکوں میں سے بھی نہ تھا؛ اس مضمون پر مفصّل بحث کا موضوع "اسلام" ہے۔ جہاں ان شاء اللہ مدلّل طور پر ثابت کیا جائے گا کہ تمام پیغمبرانِ برحق اسلام کے پیرو اور داعی تھے۔ دوسرے نام اور مذاہب بعد کی پیداوار ہیں۔ دراصل بنو اسرائیل ——— فرزندانِ اسرائیل ——— کا تصور یعقوبؑ سے شروع ہوتا ہے۔ جن کا لقب اسرائیل ——— عبداللہ ——— تھا۔ ان کی اولاد بنو اسرائیل یا اسباط کہلائی۔ یہ کل بارہ اسباط ——— قبائل ——— تھے۔ آگے چل کر یہودیوں نے اپنا نام اور اپنے مذہب کا نام یہودی رکھ لیا جو یعقوبؑ کے چوتھے فرزند یہودا کی طرف منسوب تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اسباطِ بنی اسرائیل میں اس سبط ——— خاندان یا قبیلہ ——— کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اسی کے نام پر یہودیہ نامی سلطنت قائم ہوئی۔ یہودیوں کی دوسری حکومت ——— شمالی سلطنت ——— اسرائیل کے نام پر تھی۔ شمالی سلطنت مٹ گئی اور یہودیوں کے دوسرے سب خاندان یا تو مٹ گئے یا تقریباً

نابید ہوگئے۔ پہلی سلطنت — یہودیہ — نسبتاً زیادہ دیر قائم رہی۔ اور یہودا کا خاندان پھلا پھولا۔ اس زمانے میں سارے اسرائیلی یہودی کہلانے لگے اور ان کا مذہب یہودیت کہلا۔ جنوبی سلطنت یہودیہ کے اندر یروشلم واقع تھا جس میں بیت المقدس تھا۔ اس مقدس عبادت گاہ کی نسبت سے یہودیہ کو مرکزیت کا مقام حاصل رہا اور قوم و مذہب ہر دو کا انتساب اسی نام کی طرف ہوگیا۔

ماہرینِ مذاہب نے یہودی مذہب کی کئی تعریفیں لکھی ہیں۔ صحیح ترین تعریف یہ ہے "یہودیت وہ مذہب ہے جس میں ایک خدا پر ایمان کے ساتھ ساتھ ایک نسل کی برتری اور فضیلت و عظمت کا عقیدہ بھی داخلِ دین ہے" یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہودی کوئی تبلیغی مذہب نہیں بلکہ نسلی مذہب ہے۔ خود یہودی کسی کو اس مذہب کی دعوت نہیں دیتے، نہ آسانی سے غیر یہودی کو داخلِ مذہب کرتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے، کہ یہودیوں کی تعداد ہمیشہ بہت کم رہی ہے۔ آج کل جب کہ دنیا کی آبادی میں مسلسل اضافہ ایک پریشان کن مسئلہ بن چکا ہے۔ یہود کی تعداد سوا کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ قوم اپنی سازشوں، بیوفائیوں، مکر و فریب اور رسولوں کی نافرمانیوں کے باعث ہمیشہ مغضوب رہی ہے، یہودی کا لفظ ہی نفرت و حقارت کا نشان بن چکا ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ہی شاید ایسا ہو جس میں سے یہ اپنی کرتوتوں کے باعث جلا وطن نہ کئے گئے ہوں۔ ان کی آبادی کا زیادہ تر حصہ آج بھی — جب کہ اسرائیل نامی سلطنت کا ناسور عرب دنیا اور مسلم ممالک کے لئے ایک لاعلاج بیماری کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مختلف ممالک مثلاً امریکہ، برطانیہ اور روس وغیرہ میں سکونت پذیر ہے۔

ویسے تو کئی مذاہب کے متعلق قدامت کا دعویٰ کیا گیا ہے، مثلاً ہندو مذہب، طاؤازم، شنتو مت، کنفیوشسزم، بدھ مت اور زرتشت کا مذہب۔ جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے اس کی نہ کوئی تاریخ ہے نہ کوئی متعین عقیدہ و عمل، ایک قوم کی ہزارہا سالہ تہذیب و ثقافت کے نشیب و فراز میں جو اوہام و رسوم پیدا ہو گئیں وہ سب مل جل کر ہندو مذہب کہلائیں۔ دوسرے مذکورہ مذاہب بھی واقعی قدیم ہیں۔ بدھ مذہب، چینی مذہب اور زرتشت کا مذہب چھٹی ساتویں صدی قبل مسیح کی پیداوار ہیں۔ مگر یہودیت کی قدامت واقعی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ مشرقِ بعید کے مذاہب کو چھوڑ کر یہودیت دنیا بھر کے مذاہب میں سے قدیم تر ہو۔ تینوں الہامی مذاہب — یہودیت، عیسائیت اور اسلام — میں سے بھی

یہودیت کو ہی تقدم حاصل ہے۔ ان تینوں کو سامی مذاہب بھی کہتے ہیں۔

یہودیت کی تاریخ

یہودیت چونکہ ایک نسلی مذہب کا نام ہے لہٰذا اس مذہب کی تاریخ اس ایک خاص نسل کی تاریخ سے جدا نہیں کی جا سکتی۔

اسلام کے علاوہ دنیا بھر کے مذاہب میں سے یہودیت کی تاریخ میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو یہود نے گو بے شمار واہی تباہی روایات سے خلط ملط کر رکھا ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ انہوں نے اپنے مذہب و ثقافت اور تہذیب کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے بے مثال محنت کی ہے۔ یہودیوں کے لٹریچر کے علاوہ ان کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ قرآن مجید میں بھی محفوظ ہے۔ صرف یہی حصہ ترمیم و اضافے اور اوہام و خرافات کی ملاوٹ سے ملوث نہیں ہو سکا۔ اس کا سبب واضح ہے کہ قرآن دنیا کی واحد محفوظ و غیر مبتدل کتاب ہے۔ ہم یہود کی تاریخ کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ حضرت یعقوبؑ سے شروع ہو کر یوشع بن نون کے شام میں فاتحانہ داخلے تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس حصے کے موٹے موٹے واقعات قرآنِ مجید نے سورۃ البقرہ وغیرہ میں بیان کئے ہیں۔ اور تفاصیل خود یہودی لٹریچر میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرا حصہ شام کی فتح سے لے کر اب تک کے واقعات پر پھیلا ہوا ہے۔ کتاب و سنت میں اس حصے کے کچھ اجزاء موجود ہیں۔ اور بعض دوسرے واقعات و احوال کی طرف صرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ اس حصے کی تاریخ کے لئے ہمیں زیادہ تر یہودی روایات بائبل اور تالمود پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ ان کتابوں میں بے شمار مبالغے، اوہام و خرافات، غلط بیانیاں اور واقعات کا توڑ مروڑ موجود ہے، جیسا کہ ہم یہودی لٹریچر پہ گفتگو کے دوران میں ان کی طرف اشارات کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد یہودیت اور اسلام کے تصادم کے نتیجے میں جو واقعات پیش آئے وہ اسلامی کتب اور تاریخ میں محفوظ ہیں۔ یہودیوں نے لوگوں کو اسلام سے روکنے اور اس کی ترقی کی رفتار میں رکاوٹیں ڈالنے کی ازحد زیادہ کوششیں کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تاریخ کے آئینے میں خود ان کو اور دوسروں کو بھی دکھایا کہ اس قوم کی تاریخ انبیاء و رسل کی مخالفت اور احکامِ الٰہی سے بغاوت سے پُر ہے۔ چنانچہ ہم مدنی سورتوں میں بالعموم اور البقرہ میں بالخصوص اس قوم کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قوم کی تاریخ بغاوت و سرکشی اور نافرمانی و بیوفائی کی تاریخ ہے۔ ان کی ان مشہور صفات پر خود انبیائے بنی اسرائیل یسعیاہ، ایمیاہ اور حزقیل و دانیال آنسو بہاتے اور نوحے کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ بائبل کے

مجموعے میں انبیاء کی طرف منسوب جو کتابیں موجود ہیں ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ جس تناسب سے اس قوم پر اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات بے حد و حساب تھے۔ اسی نسبت سے ان کی بیوفائیاں اور نافرمانیاں بھی شمار و قطار سے باہر ہیں۔ انبیائے بنی اسرائیل کی زبان سے (اور بعض جگہ خدائے تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہوئے) ان لوگوں کے لئے باغی قوم، سرکش قبیلہ بیوفا گھرانا اور احسان فراموش گروہ کے الفاظ ادا ہوئے ہیں جو صحائف انبیاء کی زینت ہیں۔ اور ہر وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔

قرآن کی رُو سے — اور تاریخ کی تصدیق و تائید سے — آدمؑ کے بعد نوحؑ اور ان کے بعد ابراہیمؑ مشہور و معروف عالمی و آفاقی پیغمبر تھے۔ ان کی نسل کی دو شاخیں تھیں: ہاجرہ کے فرزند اسمعیلؑ کی شاخ جو مکہ میں سکونت پذیر ہوئی، اور سارہ کے فرزند اسحاق کی شاخ جو شام و فلسطین میں متوطن ہوئی۔ اسحاق کے بیٹے یعقوبؑ تھے۔ جو اسرائیل کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اور ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ یعقوبؑ کے ایک بیٹے یوسفؑ تھے جنہیں سوتیلے بھائیوں نے ازراہِ حسد و عداوت پہلے کنوئیں میں پھینک کر باپ سے جدا کیا اور پھر مصر جانے والے ایک تجارتی قافلے کے ہاتھ چند سکوں کے عوض بیچ کر ان سے گلو خلاصی کرانی چاہی۔ یوسفؑ کو اللہ تعالیٰ نے سلطنت کا اقتدار بخشا اور انہوں نے اپنے تمام خاندان کو کنعان — فلسطین — سے مصر میں بلوا لیا۔ یہ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیحؑ کا واقعہ ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق مصر میں اس وقت قبطی فرعونوں کی نہیں بلکہ چرواہے بادشاہوں کی حکومت تھی۔ جو کچھ عرصہ قبل صحرائے عرب و شام سے آ کر مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ انہیں ہم وطنی کی بناء پر یوسفؑ اور ان کے خاندان سے فطری ہمدردی تھی۔ چنانچہ جب تک یہ حکومت قائم رہی بنی اسرائیل بڑی عزت و احترام اور اقتدار و وقار کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اور سرزمین مصر میں خوب پھلے پھولے۔ تقریباً پانچ سو برس کے بعد مقامی قبطی قومیت کے زیر علم انقلاب آ گیا۔ اور فراعنہ کی حکومت کا دور شروع ہوا۔ پہلا شاہی طبقہ — عمالقہ شام مصر سے بیدخل بلکہ جلاوطن ہو گیا۔ اس وقت سے بنی اسرائیل پر ظلم و ستم اور ان کی تذلیل و تحقیر کا دور شروع ہو گیا۔ فرعون کے حکم سے بنی اسرائیل کا زور گھٹانے اور انہیں بے دست و پا بنائے رکھنے کی خاطر دو مرتبہ ان کی نسل کشی کی گئی۔ ایک مرتبہ بعثت موسوئی سے قبل، اور اسی زمانے میں موسٰی کی پیدائش ہوئی۔ اور دوسری مرتبہ بعثتِ موسوئی کے بعد جب کہ فرعون کو موسٰی جیسے لیڈر سے خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔

بنی اسرائیل دراثتہً تو حنیف تھے مگر مصر کی طویل رہائش کے زمانے میں ان میں مصری دیوتاؤں، حیوانات اور دوسرے جعلی خداؤں کی پرستش کا مرض پیدا ہو گیا۔ پھر یہ جہاں کہیں گئے مقامی لوگوں کے شرک سے متاثر ہو گئے۔ بائبل کی کتابیں اس پر گواہ ہیں۔ بنی اسرائیل میں ہزارہا نبی معبوث ہوئے۔ ان سب نے توحید کا درس دیا مگر یہ بگڑی ہوئی قوم سنبھل نہ سکی پیغمبروں کا اثر ان پر دیرپا نہیں ہوتا تھا۔ نبیوں کی نافرمانی اور ان کا استہزاء ان کا شیوہ تھا۔ بعض پیغمبروں کو انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے قتل بھی کر ڈالا اور اس پر فخر کرتے رہے۔ زکریاؑ و یحییٰؑ ہر دو کو قتل کیا اور عیسیٰؑ و محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی کئی بار سازش کی۔ عیسیٰؑ کے متعلق تو انہوں نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا کہ: "ہم نے اللہ کے رسول مسیحؑ بن مریم کو قتل کر دیا ہے" مگر قرآن نے اس کی شد و مد سے تردید کر دی۔ گائے پرستی کا مرض یہودیوں کو مصر سے لگا تھا۔ سامری نے موسیٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے زمانے میں دھات کا سنہری بچھڑا بنایا اور بنی اسرائیل نے علی الاعلان دھڑلے سے اس کی پرستش کی۔ گائے کی معبودیت و تقدیس کا تصور موسیٰؑ نے بڑے جتنوں سے ان سے ایک گائے ذبح کرا کے ان کے اذہان و قلوب سے محو کیا۔

موجودہ بائبل میں خدائے واحد کا عقیدہ تو موجود ہے مگر واضح اور خالص نہیں، کافی حد تک دھندلایا ہوا اور اوہام و خرافات سے ڈھکا ہوا ہے۔ مثلاً خدا کا یعقوبؑ سے کشتی لڑنا، بنی اسرائیل کے قافلے کے آگے آگے چلنا، پہاڑ میں انہیں آگ میں نظر آنا۔ بجلی کی چمک اور گرج سے ظہور کرنا، کبھی جھاڑیوں میں سے شعلہ بن کر دکھائی دینا، عہد کے صندوق میں یہوواہ (خدا) کا رہنا اور جنگ کے موقع پر ان کے ساتھ رہ کر تسلی دینا وغیرہ۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل نے یہوواہ (خدا) کو دوسری مشرک قوموں کی طرح سب سے بڑا خدا — الٰہ آلالھہ یا اپنے عظیم ترین قومی معبود کا درجہ دے دیا تھا۔ یہیں سے بائبل کی ان آیات کا مطلب واضح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خداوند خدا، بنی اسرائیل کا خدا، تیرا اور تیرے بزرگوں کا خدا، کہہ کر پیش کیا گیا ہے۔ غالباً اسی سے ان کے نسلی تفاخر اور برگزیدہ نسل کا راز کھل جاتا ہے۔ یہوواہ کے معنی میں بڑا اختلاف ہے۔ بائبل میں: "میں جو ہوں سو ہوں" "وہ جو ہے" لکھا ہے۔

الغرض فراعنہ کی یہ پالیسی کہ بنی اسرائیل کو زندہ تو رکھا جائے مگر بے دست و پا اور مفلوج بنا کر، غیر قبطیوں سے نفرت و عداوت پر مبنی تھی۔ وہ بنی اسرائیل کی تعداد اور سابق

اقتدار سے بھی خائف تھے۔ لہٰذا صرف غلام بنا کر مزدوری کرانے، اینٹیں بنواتے، گارا بنوانے گندگی اٹھانے اور بوجھ اٹھوانے کی خاطر ان کی کچھ تعداد کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ عورتوں کو اس لئے زندہ رکھا جاتا کہ ان سے قبطی اولاد پیدا کی جائے۔ انہی خوفناک حالات میں موسیٰ بن عمران پیدا ہوئے۔ ان کی ماں — یوکابد — نے بالہام خداوندی انہیں صندوق میں بند کرکے دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کے ملازموں نے صندوق پکڑ لیا۔ اور وہ شاہی محل میں لے جایا گیا۔ آگے کا قصہ مشہور ہے اور اُس کے بعض ضروری اجزاء قرآن نے بھی بیان کئے ہیں۔ ہوش سنبھالنے پر انہیں اصل صورت احوال کا پتہ چلا۔ انہوں نے نوجوانی کے عالم میں بنی اسرائیل پر برسر عام مظالم ہوتے دیکھے اور مظلوموں کی مدد کرنے لگے۔ ایک قبطی ظالم اتفاق سے ان کے ہاتھ سے مارا گیا تو وہ بھاگ کر ملحقہ ملک مدین جا پہنچے۔ وہاں ایک بوڑھے بزرگ شعیب یا یترو (حسب روایت بائبل) کی دس سال خدمت کی۔ اسی کی بیٹی سے نکاح کیا اور مدت ملازمت ختم کرکے مع اہل و عیال مصر کو واپس لوٹے۔ راستے میں طور پر انہیں نبوت ملی اور اُدھر مصر میں ان کے بڑے بھائی ہارون کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ دونوں بھائی مل کر بامر خداوندی فرعون کے دربار میں گئے اور اُسے خدا کا پیغام پہنچایا۔ اس پیغام کے دو حصے تھے: پہلا یہ کہ فرعون خود ایمان لائے، بصورتِ دیگر بنی اسرائیل کو غلامی سے رہا کرے تاکہ موسیٰ باذنِ الٰہی انہیں واپس ملک شام کو لے جائیں۔ فرعون نے دونوں مطالبے ٹھکرا دیئے اور اُن سے بڑی ترشروئی اور تندخوئی سے پیش آیا۔ پھر جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرایا جس میں فتح موسیٰ کی ہوئی۔ عصائے موسیٰ جادوگروں کے جعلی سانپوں کو نگل گیا اور جادوگر خدائے واحد پر ایمان لاکر سربسجود ہوگئے۔ فرعون اس واقعہ سے بڑا جھلایا اور بنی اسرائیل کی نسل کشی اور ان پر مظالم توڑنے کا نیا دور شروع ہوا۔ آخر کار موسیٰ بنی اسرائیل کو بحرِ احمر کی راہ سے مصر سے نکلنے اور دریا پار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ فرعون لاؤ لشکر سمیت غرق ہوگیا۔ مگر اس کی لاش محفوظ رہی جو آج بھی مصری عجائب گھر کی زینت ہے۔

اب بنی اسرائیل کی قومی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ فرعون سے نجات پاتے ہی انہوں نے موسیٰ سے ایک محسوس خدا کا مطالبہ کر دیا۔ وادیٔ سینا میں بحر احمر سے لے کر شام کی سرحد تک بنی اسرائیل کئی نشیب و فراز سے گزرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعامات کی بارش ان صورتوں میں فرمائی: (۱) فرعون جیسے دشمن سے نجات اور اُس کا ان کی آنکھوں کے سامنے غرقِ سمندر ہونا۔ (۲) راستے میں بادلوں کا سایہ کیا جانا (۳) من و سلویٰ کا

نزول تاکہ کھانا تیار کرنے کی زحمتوں سے بچے رہیں۔ (۸) صحرا میں پانی نہ ملا تو ایک چٹان سے بارہ چشموں کا نکلنا تاکہ ہر قبیلہ ایک ایک چشمے پر قبضہ کرکے کام چلائے۔ ان انعامات الٰہی کے بالمقابل یہود کا رویّہ یہ تھا (۱) ناشکری (۲) نافرمانی (۳) بغاوت (۴) بات بات پر موسیٰ کے گلے شکوے کہ اس شخص نے ہمیں مبتلائے مصائب کیا ہے (۵) موسیٰ و ہارون سے تمسخر و استہزاء کا رویّہ (۶) گوسالہ پرستی (۷) نزولِ تورات کے بعد اس پر عمل کرنے سے گریز (۸) خدا کو روبرو دیکھنے کا مطالبہ (۹) من و سلویٰ کے بجائے ہاتھ کی پکی ہوئی شہری غذائیں اور چٹ پٹی چیزیں طلب کرنا (۱۰) گائے ذبح کرنے کے حکم پر تعمیل میں پس و پیش کرنا (۱۱) یریکو یا اریحا کی فتح اور باذنِ الٰہی اس شکر کے بجائے تمسخر و استہزاء کا رویّہ (۱۲) بیت المقدس میں داخلے کا حکم اور یہود کی بزدلی۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہود پر چالیس سال بیابان نوردی مسلط کی۔ اسی دوران میں ہارون و موسیٰ کی وفات واقع ہوگئی۔ مصر میں پلی ہوئی بزدل نسل مرکھپ گئی اور صحرائی آب و ہوا میں پل بڑھ کر ایک جدید نسل تیار ہوئی جس نے یوشع بن نون کی سربراہی میں بیت المقدس (اس زمانے کا یروشلم) فتح کیا۔ اس فتح کے ساتھ ہی تاریخ بنی اسرائیل کا دوسرا پڑاؤ شروع ہوا جیسا کہ ہم نے ابتداء میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

فلسطین اس زمانے میں مختلف قوموں کا ملک تھا۔ بائبل کی کتابوں میں ان قوموں کے یہ نام آئے ہیں۔ حتی، اموری، کنعانی، فرزی، حوی، یبوسی اور فلستی۔ یہ اقوام بت پرست تھیں۔ سب سے بڑا دیوتا ایل تھا جو سانڈ کے مشابہ تھا۔ اس کی بیوی عشیرہ تھی۔ دونوں کی نسل میں ستر کے قریب دیوتا اور دیویاں تھیں جو سب معبود تھیں۔ مشہور جعلی خدا بعل بھی ایل کی اولاد سے بتایا جاتا تھا۔ اور اسے بارش، سبزی ترکاری اور زمین و آسمان کا مالک مانا جاتا تھا۔ اس کی بیوی اُناث یا عستارات کہلاتی تھی۔ یہ دونوں دیویاں عشق و محبت اور جنسیات کی دیویاں کہلاتی تھیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، جتنے انسان اُتنے خدا اور خدانیاں۔ خدائے واحد کی خدائی کو ان سب میں بانٹ دیا گیا تھا۔ زناکاری کو مذہبی سند حاصل تھی۔ اور عبادت گاہیں بدکاری کے اڈے بن گئے تھے۔ بنی اسرائیل جب ان مشرک قوموں سے گھل مل گئے۔ جو صریحاً حکم تورات کے خلاف تھا۔ تو ان میں شرک و بت پرستی اور اخلاقی گراوٹ کی تمام بیماریاں گھس آئیں۔ بنی اسرائیل میں قبائلی اختلاف بھی پیدا ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی وہ آبادی جو ابھی غیر مفتوح تھی اس نے گٹھ جوڑ کرکے بنی اسرائیل کو فلسطین کے ایک بڑے حصے سے نکال دیا۔ مقامی فاتحین بنی اسرائیل

سے عہد کا صندوق ـــ تابوتِ سکینہ ـــ بھی چھین لے گئے ۔ وقت کے پیغمبر سموئیل نے یہود
کے مطالبے پر طالوت ـــ توراۃ کا ساؤل ـــ کو ان کا حاکم مقرر کیا اور اس نے بنی اسرائیل کو
منظم کر کے دوبارہ فتح پائی ۔ تابوتِ سکینہ بھی واپس مل گیا ۔

اب بنی اسرائیل کی اس مضبوط سلطنت پر طالوت ، داؤدؑ اور سلیمانؑ نے یکے بعد دیگرے
حکومت کی ۔ یہ حکومت B.C. 1020 سے لے کر B.C 926 تک قائم رہی ۔ طالوت 16 سال،
داؤدؑ 39 سال اور سلیمانؑ ۴۰ سال ، اس عرصے میں نظامِ سلطنت اور معاشرہ درست رہا ۔

سلیمانؑ کے بعد خود غرضی اور دنیا پرستی کے سبب سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے ۔
اسرائیل اور یہودیہ ۔ پہلی کا حلقۂ اثر شمال کا علاقہ بشمول شرقِ اردن تھا ۔ اور دوسری کا جنوبی
علاقہ بشمول ادوم ۔ پہلی کا پایۂ تخت سامریہ اور دوسری کا یروشلم تھا ۔ دونوں میں شدید عداوت
و رقابت تھی ۔ پہلے اسرائیل میں شرک و بت پرستی پھیلی اور پیغمبروں الیاسؑ و الیسعؑ کی بھی نہ
سنی گئی ۔ بلکہ الیاسؑ کو جلاوطن کر دیا ۔ ان حالات میں اشوری حملے متواتر شروع ہوئے ۔ عاموسؑ نبی
اور ہوسیعؑ نے بھی ناکامی کا منہ دیکھا ۔ عاموسؑ کو تو سلطنت سے ہی نکل جانے کا حکم مل گیا ۔ آخر کار
B.C 721 میں سارگون نامی آشوری بادشاہ نے سامریہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہود
کو آشوری علاقوں میں بکھیر دیا ۔

یہودیہ میں بھی شرک اور مراسمِ کفر و بت پرستی پھیلی ۔ آشوریوں نے حملے تو کئے مگر یہ سلطنت
کچھ دیر پا ثابت ہوئی ۔ یسعیاہ اور یرمیاہ نبیوں نے بہتیرا زور لگایا مگر یہود اپنی کرتوتوں سے
باز نہ آئے ۔ اور آخر کار B.C 587 میں بخت نصر بابلی نے بیت المقدس (یروشلم) سمیت ساری
سلطنت یہودیہ پر قبضہ کر لیا ۔ یہود نے کچھ مدت بعد بغاوت کی تو اب کی بار بخت نصر نے شہر اور
معبد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ۔ اور بے شمار یہودیوں کو غلام اور قیدی بنا کر عراق لے گیا ۔
ہیکلِ سلیمانی کو پیوندِ خاک کر دیا اور تورات کے نسخے کو بھی جلا دیا ۔

آخر کار B.C 539 میں ایرانی فاتح سائرس (خورس ، خسرو یا گورش) نے بابل فتح کیا
اور بنی اسرائیل کو غلامی سے چھڑایا ۔ بیت المقدس کو B.C 522 کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا ۔ نگرانی کا کام
حجی نبی اور زکریاہ نبی نے کیا ۔ B.C 458 میں عزیرؑ نے یہودی کتب بشمول تورات کی کتب
خمسہ از سرِ نو ترتیب دیں ۔ B.C 445 میں نحمیاہ نے باذنِ شاہ ایران یروشلم کی فصیل بنائی ۔
شمالی فلسطین (اسرائیل) والوں نے کوہِ جرزیم پر اپنا معبد تعمیر کر لیا ۔ اس سے دونوں فریقوں میں
عداوت اور بڑھ گئی ۔ 198 ق م میں انٹیوکس ثالث شاہِ انطاکیہ نے فلسطین پر قبضہ کر لیا اور

یہودیوں کو یونانی تہذیب و تمدن اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اندر کے غداروں نے اس کا ساتھ دیا۔ 175 B.C میں اینٹوکس چہارم نے بیت المقدس میں بت رکھوا کر یہودیوں سے بت پرستی کرائی۔ اسی زمانے میں مکابی تحریک اٹھی اور اس نے سارا فلسطین یونانیوں سے آزاد کرا کے ایک بڑی سلطنت قائم کر لی جو یہلی دونوں پر مشتمل تھی اور کچھ مزید علاقے بھی اس میں شامل تھے یہ سلطنت 67 ق م تک قائم رہی۔

یہود میں پھر اختلاف و شقاق پیدا ہوا اور انہوں نے رومیوں کو خود فلسطین پر حملے کی دعوت دی۔ 63 ق م میں پومپی نے فلسطین پر حملہ کر کے اسے رومی سلطنت کا جزو بنایا مگر عملاً حکومت مقامی لوگوں کو دے کر مطمئن رہا۔ ۵ ق م سے ۱۸ ق م تک فلسطین پر ہیرود یہودی کے ذریعے سے رومی حکومت کرتے رہے۔ ہیرود رومیوں کا تابع تھا لہٰذا ان کی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیتا رہا۔ یہود کی مذہبی و اخلاقی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور وہ زوال کی آخری حد تک پہنچ گئے۔ اسی زمانے میں یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام مبعوث ہوئے۔ یحییٰ کا تو یہ انجام ہوا کہ ان کے وقت کے یہودی بادشاہ (ہیرود انٹی پاس) نے اپنی ایک فاحشہ محبوبہ کی فرمائش پر — جس کے باعث یحییٰ نے بادشاہ کو احکام الٰہی سے روگردانی پر سرزنش کی تھی۔ انہیں پہلے محبوس کیا اور پھر سر کاٹ کر ایک تھالی میں رکھ کر اس کنجنی کو پیش کر دیا۔ عیسیٰ کو اس جرم کی پاداش میں (بزعم یہود و نصاریٰ) قتل و صلب کی منزلوں سے گزرنا پڑا کہ انہوں نے یہودیوں کی ظاہر پرستی اور شدید فسق و فجور پر جلا یہ تنقید کی تھی۔ یہود نے کہا کہ یہ کنواری ماں کی ناجائز اولاد (معاذ اللہ) اسی لائق تھا۔ کہ اسے صلیب کی لکڑی پر لعنتی موت مار کر اس کی نبوت کا ڈھونگ غلط ثابت کیا جائے۔ اسی طرح انہوں نے ذکریا کو بھی ایک جھوٹا الزام لگا کر عین بیت المقدس کے اندر سنگسار کیا۔ یہود کی ان بدکاریوں اور بداعمالیوں کے باعث پہلے تو ایک دفعہ پھر ان کی سلطنت کے تین ٹکڑے ہوئے اور پھر یہودیوں اور رومیوں کی ملی مجگت کے نتیجے میں ۷۰ء میں رومی بادشاہ طاطس نے ان کی سلطنت کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک روند ڈالا۔ یروشلیم کو فتح کر کے یہود کا قتل عام کیا۔ سوا لاکھ سے زیادہ یہودی مارے گئے۔ جو بچ گئے انہیں غلام بنا لیا گیا۔ اور ان سے نہایت ذلیل کام لئے گئے۔ بعض کو درندوں سے پھڑوایا گیا۔ عورتوں کی کھلی بے حرمتی کی گئی۔ بیت المقدس کو پیوند خاک کر دیا گیا اور وہ ہزاروں سال کے لئے دنیا کے تختے سے ناپید ہو گیا۔

یہود کے کردار کا ایک نہایت تاریک پہلو دنیا کے ہر دین و مذہب کے ماننے والے بانیانِ مذاہب کی عزت واحترام اور توقیر و اعزاز کے قائل ہیں۔ دلی عقیدت و محبت اس وقت تک کسی بزرگ یا رہنما کے متعلق ہو ہی نہیں سکتی جب تک اس کی اخلاقی برتری اور رفعتِ کردار کا پختہ یقین نہ ہو۔ لیکن یہودی قوم کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے۔ وہ ایک طرف جن لوگوں کو نبی و رسول اور فرستادہ الٰہی مانتے ہیں دوسری طرف ان کے اخلاق و کردار پر ایسے ایسے شرمناک الزام لگاتے ہیں جن کا تصوّر بھی تو کجا کسی معمولی شریف انسان کے متعلق بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل ہوا یوں کہ جب اس مغضوب قوم کے عوام و خواص، علماء و مشائخ اور ہر طبقے اور ہر شعبۂ زندگی کے لوگ اخلاقی زوال کی انتہائی پستیوں میں گر گئے تو اپنی اصلاح کرنے کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے انہوں نے بزرگانِ دین، اولیاء اللہ اور انبیاء و رسل تک کو ہر قسم کی بدعملی کا مرتکب ٹھہرا دیا تاکہ اپنی بدکاریوں کے لئے وجہِ جواز نکالی جا سکے۔ اس سلسلے میں کوئی قوم اگر یہودیوں کی ہمسر و ہم نوا ہو سکتی ہے۔ تو وہ ہندو قوم ہے۔ انہوں نے بھی اپنے رہنماؤں بلکہ دیوی دیوتاؤں تک کو اپنی بداعمالیوں میں ملوّث کر کے دکھایا ہے۔

موجودہ بائبل کی کتابوں کے وہ مقامات پڑھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے جس میں جلیل القدر پیغمبروں پر شراب خوری کا، بت پرستی، دھوکا فریب، غیر عورتوں کی تاک جھانک، غیر محرم خواتین سے عشق و محبت کی پینگیں بڑھانا، زناکاری، جھوٹ اور کھلے ظلم و ستم کے غلیظ الزامات لگائے گئے ہیں۔ نوح علیہ السلام پر شراب خوری اور عریانی کا گندا بہتان کتاب پیدائش کے باب ۹ آیت ۲۰۔ ۲۵ میں موجود ہے۔ لوط علیہ السلام پر شراب خوری اور خود اپنی بیٹیوں سے بدکاری کرنے کا غلیظ الزام کتاب پیدائش کے ۱۹ویں باب میں مفصل مذکور ہے۔ یعقوب علیہ السلام پر بے صبری و ناشکری کا بہتان بائبل کی کتاب پیدائش اور تالمود میں موجود ہے۔ نیز اسی کتاب میں ان کے رات بھر خدا سے کشتی لڑنے کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس میں خدا اور پیغمبر دونوں کی توہین و تنقیص ہے، یوسف علیہ السلام پر بھائیوں کی چغل خوری کا الزام کتاب پیدائش میں لکھا ہے۔ پھر بائبل کی کتاب خروج میں حضرت موسیٰ پر قتلِ عمد اور مقتول کی لاش کو ریت میں چھپا کر چلے جانے کا الزام ہے۔ تالمود میں حضرت موسیٰ پر خفیہ عشق بازی اور بدکاری تک کا الزام لگایا گیا ہے۔ قرآن نے سنہری گو سالہ بنانے کا قصہ بیان کرتے ہوئے اسے سامری کی کارستانی بتایا ہے۔ مگر بائبل کی کتاب خروج باب ۳۲ میں یہ شرک و کفر اور صنعت کاری ہارون علیہ السلام

کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ بچھڑا بنا کر اس کی پوجا کرنے اور کرانے میں سب سے زیادہ ہاتھ انہی ہارونؑ کا تھا۔ داؤد علیہ السلام پر اپنے ایک ملازم سرکار اور یاحتی کی خوبرد جوان بیوی کی تاک جھانک اُسے عریاں نہاتے دیکھ کر مبتلائے عشق ہونے، اُسے بلوا کر بدکاری کرنے اور اُس کے خاوند کو دھوکے سے مروا کر بعد اُسے اپنے گھر ڈال لینے کا غلیظ بہتان کتاب سموئیل باب ۱۱-۱۲ میں بڑی تفصیل سے مزے لے کر لکھا گیا ہے۔ سلیمان علیہ السلام پر بت پرستی، مشرک عورتوں سے نکاح کرنے اور ان کے عشق میں محو ہو جانے کا الزام کتاب سلاطین باب ۱۱ میں شرمناک طریقے سے لگایا گیا ہے۔ یہودی لٹریچر داؤدؑ و سلیمانؑ کی تصویر پیغمبروں کی حیثیت سے نہیں بلکہ دنیا دار عیش پرست بادشاہوں کی حیثیت سے کھینچتا ہے۔ قرآن نے ان تمام برگزیدہ پیغمبروں کی عظمت و عصمت کا اعلان کیا ہے۔ اسلامی عقیدے میں پیغمبر معصوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں صحیح تر مسلک یہی ہے کہ نبی و رسول قبل از نبوت اور بعد از نبوت ہر قسم کے صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ خلافِ اَولیٰ افعال اور لغزش کو گناہ کی تعریف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی ضمن میں ایوبؑ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ جنہیں قرآن نے فہرست انبیاء میں داخل کیا اور ایوبؑ صابر کا معزز لقب عطا کیا ہے۔ بائبل کی کتاب ایوب اس کے برخلاف انہیں جھگڑالو، بے صبر اور غیر ثابت قدم ٹھہراتی ہے۔

الغرض اس بھارتی قوم سے نہ خدا بچا نہ اُس کے انبیاء و رُسل ؏

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

اسلام اور یہود

اس موضوع پر گفتگو بڑی اذیت ناک ہے۔ اس کا تصور آتے ہی اسلام اور اہلِ اسلام کے سینکڑوں ہزاروں زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔

جو قوم خدا اور اُس کے پیغمبروں سے وہ سلوک کر چکی ہو جس کا ذکر اوپر گزرا، اُس سے کوئی خیر کی توقع رکھنا عبث ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اسلام نے یہود کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کیا۔ پیغمبر اسلام نے ان سے بے شمار دُکھ اٹھا کر بھی نہایت نرم اور رحیمانہ برتاؤ کیا۔ اہلِ اسلام نے اپنی سلطنتوں اور حکومتوں میں انہیں ہر قسم کے وہ حقوق عطا کیے جن کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ مگر حیف ہے اس بیوفا اور سرکش قوم پر کہ اس نے نہ کبھی اسلام کو بخشا، نہ پیغمبرؐ کے احسانات کو یاد رکھا اور نہ اہلِ اسلام کی رواداری اور رحمدلی کو کبھی پیش نظر رکھا۔ یہودیوں میں عقربی ذہنیت پائی جاتی ہے۔ شیخ سعدیؒ نے بچھو کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ اس قوم پر حرف بحرف صادق آتا ہے ؎

نیش عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

اس قوم کی تاریخ پڑھ کر ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ دو حال سے کبھی خالی نہیں رہی: یا ظالم ہو گی یا مظلوم۔ درمیان کا کوئی مقام انہیں بھاتا ہی نہیں!

اوپر بیان کردہ تاریخ یہودیت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ شاہ روم کے ہاتھوں پہلی صدی عیسوی میں یہودیوں پر کیا بیتی۔ اس کے بعد یہ قوم دنیا کے کئی ممالک میں تتر بتر ہو گئی اور موجودہ صدی کے وسط تک اس کا یہی حال رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد "یہودی صلیبی" گٹھ جوڑ کے نتیجے میں مغربی اقوام اور روس کی مقاربت کے باعث اسرائیل (جدید) نامی سلطنت کا ناجائز بچہ متولد ہوا۔ جس نے آج ساری دنیا کے امن کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔ اب ہم مختصراً اسلام اور یہود کے تعلقات پر کلام کریں گے۔

۷۰ء کے بعد یہودیوں پر ایک اور افتاد آ پڑی اور اس کے نتیجے میں رومیوں نے انہیں فلسطین سے بالکل بے دخل کر دیا۔ ۱۳۵ء میں رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ اور باقی ماندہ یہود بھی شام سے خارج ہو کر آوارۂ جہاں ہو گئے۔ کچھ یہودی اسی زمانے میں حجاز میں آ داخل ہوئے۔ اور یہاں کے سرسبز و شاداب مقامات اور وادیوں پر قابض ہو بیٹھے۔ حجاز ان کے سابق وطن کے متصل جنوب میں واقع ہے۔ نقشہ دیکھیں تو سمجھ میں آ جائے گا کہ انہوں نے ایلہ، مقنا، تبوک، تیماء وادی القریٰ فدک اور خیبر کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیوں کیا تھا۔ تین مشہور قبائل جن کا تاریخ اسلام میں بار بار ذکر آتا ہے۔ یعنی: بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع بھی اسی زمانے میں آ کر یثرب میں بس گئے تھے۔ یہودیوں کے علاوہ یثرب کے دوسرے باشندے، قبائل (اوس وخزرج) دراصل یمن کے باشندے تھے۔ یمن کی سدِّ مارب ٹوٹ جانے کے باعث جو سیلاب آیا اُس کی وجہ سے یمنیوں کو وطن سے بھاگنا پڑا۔ یہ دو قبیلے یثرب میں آ بسے لیکن آتے ہی ان کی یہود سے ٹھن گئی۔ اپنے سابق ہم وطن غسانیوں کی مدد سے انہوں نے یہود کو یثرب سے بے دخل کر دیا۔ اور خود شہر پر قابض ہو گئے۔ یہودی مدینہ سے باہر بستیاں بنا کر رہنے پر مجبور ہوئے۔ بنو قینقاع نے خزرج کی مدد سے شہر کے اندر جگہ حاصل کر لی۔ باقی دونوں قبیلے اوس کے حلیف بن گئے۔ مگر شہر کے باہر ہی رہائش اختیار کی۔ ان لوگوں میں نسلی غرور اور دنیوی و اخروی فضیلت کا بلا جواز دعویٰ تھا۔ اور یہ عربوں میں سوائے ظاہری لباس اور طریقِ بود و باش کے غلط ملط نہیں ہوئے۔ یہ سودی کاروبار کرتے اور تعویذ گنڈے، ٹونے ٹوٹکے اور جادو کے بل

پر اپنی علمیت جتاتے تھے۔ بعض افراد کے سوا عربوں نے یہودیت اختیار نہیں کی۔ وہ بیرونی دخل اندازی ہونے کی بناء پر بطور پالیسی یہ عربوں کو لڑاتے رہتے تھے۔ تاکہ ان کے خلاف متحدہ عرب محاذ نہ بن سکے، لیکن تعداد میں کم ہونے کے باعث خود بھی اس بات پر مجبور تھے کہ کسی نہ کسی طاقتور عرب قبیلے کے حلیف بنیں اور اس کی حمایت میں رہیں۔ یوں عربوں کی باہمی لڑائیوں میں یہودی بھی شامل ہوتے اور ایک یہودی قبیلہ دوسرے کے خلاف بھی نبرد آزما رہتا۔

اہلِ کتاب ہونے کے باعث یہودی خاتم النبیین کے منتظر تھے۔ اور حضورؐ کی بعثت سے قبل انہوں نے یہ بات بالعموم مشہور کر رکھی تھی کہ آخری نبی مبعوث ہوا چاہتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ لوگ سب سے آگے بڑھ کر حضورؐ پر ایمان لاتے۔ مگر دنیوی مفادات اور نسلی تعصبات کے پیشِ نظر انہوں نے نہ صرف اسلام کی دعوت کو رد کیا بلکہ بغض و عناد اور عداوت و سرکشی کا رویّہ اختیار کیا۔ حضورؐ نے ان کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے انہوں نے ایک ایک کر کے توڑ ڈالے۔ اسلام کے خلاف نفرت پھیلانا، پیغمبرِ اسلام کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرنا، مسلمانوں کو باہم لڑانے کی کوشش کرنا، اسلام کے خلاف شرک و کفر کی مدد کرنا۔ بار بار اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف لشکر کشی کرانا، حضورؐ کو قتل کرنے کی بار بار کوشش کرنا، دشمنانِ اسلام کو حضورؐ اور مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہنا، مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرنا، عام گفتگو اور سلام و کلام میں اپنے پوشیدہ بغض و عناد کا ثبوت دینا، حضورؐ پر الزام تراشی اور سب و شتم کرنا، یہ ان لوگوں کا اسلام کے متعلق رویّہ رہا۔ منافقین کی جماعت میں ان کا خاصا دخل اور حصہ تھا۔ مسجدِ ضرار انہوں نے بنوائی تھی۔ حضورؐ کو پتھر گرا کر قتل کرنے کی سازش کی۔ جنگِ خیبر کے بعد حضورؐ کو زہر دلوایا۔ جنگِ تبوک سے واپسی پر راستے میں ایک تنگ گھاٹی کے اندر حضورؐ کے خلاف قتل کے لئے کمین گاہ بنائی، آپؐ کے گھر والوں پر بہتان لگوائے۔ غرض کوئی ایسا حربہ نہ تھا جو انہوں نے اسلام کے خلاف استعمال نہ کیا ہو۔ انہی شرارتوں اور عہد شکنیوں کے باعث بنو قینقاع اور بنو نضیر کو خود اُن کی مرضی سے جلاوطن کیا گیا۔ اور بنو قریظہ کے قابلِ جنگ مردوں کو خود انہی کے پسند کردہ ثالث کے فیصلے کے مطابق قتل کرایا گیا۔ مدینہ سے جلاوطن ہونے والے یہودی خیبر جا پہنچے جہاں پہلے سے یہود کی ایک طاقتور آبادی موجود تھی۔ یہ لوگ آئے دن کوئی نہ کوئی سازش یا شرارت کرتے رہتے تھے۔

ہجرت کے ساتویں سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نت نئی کارستانیوں سے تنگ آکر خیبر کے درجنوں قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر لئے۔ مگر یہود کی درخواست پر انہیں بطور کاشتکار

باغوں اور زمینوں پر رہائش پذیر رہنے دیا۔ ان کی عقربی فطرت کے پیش نظر معاہدۂ صلح میں یہ شرط رکھ دی گئی کہ جب بھی مسلمان چاہیں گے انہیں خیبر سے بالکل بیدخل کر کے نکال دیں گے۔ لیکن ابھی معاہدے کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی ہو گی کہ انہوں نے حضورؐ اور اصحابؓ کو کھانے میں زہر ملا کر کھلا دیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک انصاری مسلمان عبداللہؓ بن سہل کو خفیہ طور پر قتل کر کے ایک نہر کے کنارے پھینک دیا۔ خلافتؓ فاروقی میں ان کی سرکشی اور بڑھی حتیٰ کہ انہوں نے عبداللہؓ بن عمرؓ کو بحالت خواب کوٹھے سے گرا دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ آخر صحابہؓ کے مشورے سے انہیں خیبر سے نکال دیا گیا۔

زمانۂ حال کے یہودی

"تاریخ اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح واضح کرتی ہے کہ فلسطین یہودیوں کا اصل وطن نہیں ہے۔ موسیٰؑ کے بعد یہ لوگ بزورِ شمشیر اس ملک پر قابض ہوئے۔ اور اصل آبادی کا قتل عام کیا تھا۔ شمالی فلسطین میں ان کی مدّتِ قیام صرف چار پانچ سو سال اور جنوبی فلسطین میں آٹھ نو سو برس رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں عرب اس علاقے میں ڈھائی ہزار برس سے متوطن چلے آئے ہیں۔ اور انہیں آشوریوں نے اس وقت اس علاقے میں بسایا جب کہ پہلی مرتبہ یہود کو یہاں سے نکال کر مختلف ممالک میں بکھیر دیا تھا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ یہ علاقہ ہماری پرانی میراث ہے محض یادہ گوئی ہے۔ مسلمانوں نے دنیا بھر میں جہاں کہیں ان کی حکومت رہی (بشمول شام و فلسطین) ہمیشہ یہودیوں کے ساتھ فیاضانہ اور غیر متعصبانہ رویّہ رکھا۔ اس کا صلہ مسلمانوں کو یہ دیا گیا کہ یہودیوں نے اپنے پرانے حریف بلکہ دشمن مغربی ممالک کے عیسائیوں اور روس سے گٹھ جوڑ کر کے یہ علاقہ ہتھیا لیا اور آج یہ مسئلہ دنیا بھر کے لئے ایک خطرناک چیلنج بن چکا ہے۔

مسلمانوں کی کمزوری اور اعدائے اسلام کی ان کے ممالک پر یلغار اس سازش کا فوری سبب بنی کہ ۱۸۵۵ء سے یہود نے فلسطین میں جائدادیں بنانے اور دھیرے دھیرے ادھر ادھر سے وہاں آکر بسنا شروع کر دیا۔ ۱۸۹۷ء میں ایک یہودی لیڈر ہرزل نے باقاعدہ صیہونی تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد فلسطین پر قبضہ اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں یہودی لیڈر ڈاکٹر وائزمین نے انگریزی حکومت کو یہودی سرمائے اور یہودی قوم کی ہر قابلیت کو اس کے لئے وقف کر دینے کا وعدہ کیا۔ بشرطیکہ جنگ کے اختتام پر فلسطین کو یہودی وطن بنانے کا پختہ وعدہ کیا جائے۔ ۱۹۱۷ء میں وہ ملعون اور رسوائے عالم دستاویز شائع ہوئی جسے اعلانِ بالفور کہتے ہیں۔ اس دستاویز کی رُو سے یہودیوں کو فلسطین میں بسانے

اور انہیں جان و مال کی حفاظت کا یقین دلایا گیا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام نے فلسطین کو انگریزی قبضے میں دے دیا تاکہ یہودیوں کو بسانے اور اعلان بالفور کو روبعمل لانے میں آسانی ہو۔ چند ہی سال میں لاکھوں یہودیوں کو دنیا کے دوسرے ممالک سے لا کر وہاں بسایا گیا۔ اب ان کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک جا پہنچی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں یہودی دھڑا دھڑ ہر قسم کا ساز و سامان اور اسلحہ حاصل کرنے اور لاکھوں دوسرے یہودیوں کو فلسطین میں لا بسانے میں کامیاب ہو گئے۔ آخر سنہ ۱۹۴۷ء میں مجلس اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کا ملعون فیصلہ کر دیا اور یہودیوں کو قومی وطن نہیں بلکہ ایک قومی سلطنت ہاتھ آ گئی۔ اس سلطنت کو مغربی اقوام اور روس دونوں کی اشیرباد حاصل تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک امریکہ اور دیگر اقوام مغرب یہودیوں کی سرپرست بن چکی ہیں۔ روس بھی عملاً اس یہودی ریاست کا حامی ہے گو مسلم ممالک کو کمیونزم کے جال میں پھانسنے کے لئے بظاہر کبھی کبھی اس کے خلاف بھی کہتا رہتا ہے۔

بعد کے واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ مسلم ممالک کی ناف پر اس ناسور کو مسلط کرنے اور مسلمانوں کو ہر طرح کمزور کر کے یہودیوں سے مروانے کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں مستقبل میں کیا ہو گا لیکن اس بات کا خدشہ موجود ہے کہ شاید کسی وقت یہ اسرائیل کا مسئلہ ہی تیسری خوفناک عالمی جنگ کا پیش خیمہ بن جائے گا۔

یہودی لٹریچر یہودی لٹریچر سے ہماری مراد قوم یہود کا مذہبی ذخیرۂ کتب ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب مثلاً خالص تاریخی یا ادبی (نظم و نثر) پر بحث مطلوب نہیں۔ یہود کے مذہبی ذخیرۂ کتب کی بنیادی کتاب بائبل کا پہلا حصہ ہے۔ جسے عہد نامۂ قدیم یا عتیق کہا جاتا ہے۔ بائبل کا دوسرا حصہ یعنی عہد نامۂ جدید یہودی کتب پر نہیں بلکہ عیسائی انجیل اور دیگر مذہبی صحائف پر مشتمل ہے۔ بائبل کا لفظی معنی کتاب مقدس کیا گیا ہے۔ اصل نسخے کا حال تو اللہ جانے مگر اس کے تراجم دنیا کی بیشتر زبانوں میں ملتے ہیں اور ان میں وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافہ اور تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ عہد نامۂ قدیم کی کتابوں کی ترتیب یہ ہے: (۱) تورات — جس کا لفظی معنی قانون ہے — اس میں یہ پانچ کتابیں شامل ہیں۔ پیدائش، خروج، احبار، اعداد، استثناء معلوم رہے کہ یہ تورات اصل تورات نہیں جو کم و بیش چار پانچ بار دنیا سے جل کر اور تباہ و برباد ہو کر ناپید ہو چکی ہے۔ یہ بعد کی پیداوار ہے کہا جاتا ہے کہ عزرا کاھن — عزیر نبی — نے اسے اسیری بابل سے رہائی کے بعد موسیٰ سے کافی عرصہ بعد اپنی زبانی یادداشت سے لکھا تھا۔ اس کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے۔

(۲) نبیئیم: جس میں بائیس کتابیں شامل ہیں۔ بعض خالص تاریخی اور بعض انبیاء کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً یوشع، قضاۃ، سموئیل اوّل و دوم، سلاطین اوّل و دوم، تواریخ اوّل و دوم، یسعیاہ وغیرہ۔ (۳) کتبیم: جس میں بارہ کتابیں شامل ہیں۔ زبور، امثال سلیمان، ایوب، یرمیاہ، نحمیاہ، دانیال، حزقیل، نوحہ وغیرہ۔ یہ کل ۹ کتابیں ہوئیں۔ ان کے علاوہ یہود کی مذہبی کتابوں میں تالمود کا ذکر بار بار آتا ہے۔ یہ ان روایات، قصص و حکایات، مذہبی احکام، اجتہادات وغیرہ کے مجموعے کا نام ہے جو یہودیوں میں سینہ بسینہ چلا آیا اور دوسری صدی عیسوی میں ایک یہودی عالم یہوداہ نے اسے جمع کر ڈالا۔ اس کا نام مشنا تھا۔ بالفاظ دیگر اسے تورات کی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ اس مجموعے کی مزید تشریح ہوتی رہی اور اسے جمع کیا گیا تو اس کا نام گمارا رکھا گیا۔ ان دونوں مجموعوں کو تالمود کہا جاتا ہے۔ تالمود کی دو اقسام ہیں۔ ایک شامی جو فلسطین میں تیار ہوا دوسرا بابلی جس کا مواد بزمانہ اسیری بابل اکٹھا ہوا۔ یہودیوں میں دونوں معتبر اور مستعمل ہیں۔ مگر اختلاف کے وقت ترجیح شامی کو دیتے ہیں۔

یہ بھی معلوم رہنا لازم ہے کہ عہد نامۂ قدیم کے دو نسخے ہیں۔ ایک عبرانی نسخہ جو یہودیوں میں مستعمل اور لائق استناد ہے۔ دوسرا نسخہ یونانی ہے جسے سبعینیہ کہا جاتا ہے اور عیسائیوں میں معتبر و مستند ہے۔ عیسائیوں کے معتبر نسخے میں بھی پھر ان کے دو بڑے فرقوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے نزدیک ۹ کتب متنازعہ فیہ ہیں۔ کیتھولک انہیں صحیح مانتے ہیں۔ اور پروٹسٹنٹ جعلی قرار دیتے ہیں۔ جو کتب صرف یونانی نسخے میں زائد ہیں انہیں اپاکرِفا یا خفیہ تحریریں کہا جاتا ہے۔

موجودہ بائبل کی کتابوں میں بعض ان کتب یہود کا ذکر یا حوالہ موجود ہے جو شامل مجموعہ نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کتابیں گم ہو چکی ہیں۔ ان کی تعداد ڈیڑھ درجن تک جا پہنچی ہے۔ غرض بائبل کی کتب موجودہ و غیر موجودہ کا معاملہ بہت مشکوک ہے۔ ان کتابوں میں بے شمار تناقضات بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کی تفصیل علامہ ابن حزم ظاہری نے الفصل میں درج کی ہے۔ اس سے بھی زیادہ تفصیل و وضاحت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق میں موجود ہے۔ یہ کتاب واقعی لاجواب ہے۔ اور اس کا اردو ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ ابتدائی پانچ کتابیں ــــ یعنی تورات ــــ بھی تحریف اور ترمیم و اضافہ کا شکار ہوئی ہیں۔ اس میں کئی تضاد ہیں۔ خود موسیٰ کی وفات کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ: آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کتاب موسیٰ کی وفات کے کافی عرصہ

بعد مدّون ہوئی تھی۔ اس کتاب میں بعض ایسے واقعات بھی درج ہیں جو بعد میں پیش آئے۔ تورات اور کتب بائبل کی تحریف و تضاد کو خود مسیحی علماء بھی تسلیم کرتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی۔

یہود کی عبادت گاہیں

موجودہ تورات کے بیان کے مطابق جب تک سلیمانؑ نے شہر یروشلیم میں وہ مشہور معبد تیار نہیں کیا جس کا نام بیت المقدس ہے، اُس وقت تک یہودیوں کی کوئی مستقل عبادت گاہ نہیں تھی۔ مصر سے نکل کر جب تک فلسطین میں فاتحانہ داخلہ نہیں ہوا، سفر و حضر میں مراسم عبادت ایک عارضی معبد کے سامنے ادا کی جاتی تھیں۔ اس کا انتظام ہارونؑ کے ہاتھ میں تھا جو ان کی وفات کے بعد وراثتہً ان کی اولاد کو منتقل ہوا۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ کعبۃ اللہ اور بیت المقدس کی تعمیر کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ تھا۔ ان احادیث کو اس لحاظ سے نہایت مشکل سمجھا گیا ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر سلیمانؑ نے کی جن کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام کے سینکڑوں برس بعد کا ہے۔ بعض اہلِ تحقیق کی یہ رائے نہایت درست معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ بیت المقدس بالکل اُسی مقام پر تعمیر ہوا ہے جہاں پر تورات میں حضرت یعقوبؑ کا بیت ایل بنانا وارد ہوا ہے۔ اور تعمیر کعبہ سے لے کر یعقوبؑ کے اس واقعہ تک چالیس ہی برس ہوتے ہیں۔ بیت المقدس کے علاوہ یہودیوں کی اور کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ جب تک سامریہ اور اسرائیل دو متقارب سلطنتیں وجود میں نہیں آگئیں اس زمانے تک تمام یہودی زیارت اور قربانی وغیرہ کی خاطر بیت المقدس ہی میں آیا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں جب ایک حکومت کی دو بن گئیں تو پہلی رسم پر عمل ممکن نہ رہا۔ اسی طرح جو یہودی اسیری بابل کے زمانے میں بیت المقدس سے دُور تھے۔ یا دُنیا میں اِدھر اُدھر منتشر تھے ان کے سامنے دوسری عبادت گاہوں کا سوال آیا۔ چنانچہ سامریہ والوں، بابل میں قید ہونے والوں اور مختلف ممالک میں بکھرے ہوئے یہودیوں نے اپنی اپنی عبادت گاہیں بنالیں گو زیارت اور قربانی کے لئے پھر بھی بیت المقدس ہی کو مرکز مانا جاتا رہا۔ ان معبدوں میں زیروبیل کا معبد بہت مشہور ہوا جو کہ کم و بیش ۵۰۰ برس قبل مسیحؑ میں تعمیر ہوا۔ پھر شہنشاہ ہیرود نے ایک اور عبادت گاہ تعمیر کی جو طول و عرض میں بے مثال بتائی جاتی ہے۔

گردشِ زمانہ کے ساتھ یہودیوں میں ایک قسم کی مرکز گریزی کی کیفیت پیدا ہوئی تو ہر آبادی میں الگ الگ عبادت گاہیں تعمیر ہونے لگیں۔ یہ وعظ و تبلیغ اور مذہبی مشاورت

کے مرکز تھے جنہیں صومعہ SYNAQUE کہا گیا ہے۔ ۷۰ء میں بیت المقدس کی مکمل تباہی کے بعد ایک یہودی ربی نے جابنیہ کے مقام پر ایک مدرسہ بنایا جس کی حیثیت بعد ازاں ایک مقدس مرکز کی ہو گئی۔ اسی قسم کے مدارس دوسرے مقامات پر بھی تعمیر ہو گئے۔

یہودیوں کے فرقے دیگر ادیان و مذاہب کی طرح یہود بھی فرقہ پرستی کا شکار ہوئے اور ان کے مختلف فرقوں میں اختلاف ہوا ہے۔ بعثت نبوی کے زمانے میں یہود کا ایک فرقہ مدینہ میں موجود تھا جو عزیرؑ کو ابن اللہ مانتا تھا۔ قرآن نے سورۂ توبہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس وقت کے یہودیوں نے کبھی اس کی تردید کی جرأت نہیں کی۔ اس فرقے کا ذکر تاریخ میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح ۷۰ء میں بیت المقدس کی بربادی کے بعد یہودیوں کی از سر نو شیرازہ بندی کے لئے ایک یہودی عالم نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ تمام یہودیوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اور رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کر دی لیکن ۱۳۲ء میں اس وقت کے رومی بادشاہ قیصر ہیڈرین نے انہیں مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ بچے کھچے لوگ دنیا کے مختلف ممالک میں بھاگ گئے اور منتشر ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ ہیکل سلیمانی ہمیشہ کے لئے ڈھا کر پیوند خاک کر دیا گیا۔ اس کی از سر نو تعمیر حتٰی کہ اب اسرائیل میں ہو رہی ہے۔ ان کے علاوہ یہودیوں کے درج ذیل فرقے مشہور ہیں۔

سمارٹنی فرقہ دوسروں سے الگ تھلگ رہنے والے لوگ تھے۔ نہ خود عوام میں خلط ملط ہوتے نہ کوئی دوسرا ان کے قریب آتا تھا۔

الیسینی فرقہ انہیں "سوشلسٹ یہودی" کہا جاتا ہے۔ تنہائی کی زندگی گزارنا، شادی بیاہ نہ کرنا، کوئی مال و متاع اور جائداد نہ رکھنا، یعنی مملوکہ چیزوں کو سب میں مشترک رکھنا ان کے خصائص تھے۔

ناستک فرقے یہ لوگ ایمان کو علم پر مقدم نہیں رکھتے۔ ان کے ہاں باعث نجات علم ہے نہ کہ ایمان۔

کاراتی فرقہ انہیں آپ یہودی مذہب کا "ظاہری فرقہ" کہہ لیجئے۔ معانی سے زیادہ الفاظ پر اور ظواہر تورات پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ غالباً انہی کو کاتب یا SCRIBES بھی کہا گیا تھا۔

فریسی فرقہ یہ قوم یہود کے فقہا اور قانون دان تھے۔ کتب مقدسہ کے علاوہ زبانی روایات کے بھی معتقد تھے۔ عابد و زاہد اور متقی مشہور تھے۔ آخرت کی زندگی اور جزا و سزا کے قائل تھے۔ یہودی لٹریچر میں آخرت یا جنت و دوزخ کا کوئی ذکر نہیں ملتا، شاید

اصلی کتابوں کی بربادی کے بعد از سرِ نو تدوین کے وقت جان بوجھ کر ایسا کیا گیا کیونکہ یہودی قوم مادّہ پرست اور نسلی تفوق کی قائل تھی۔ ان کے نزدیک بنی اسرائیل اللہ کے پیارے فرزند ہونے کے باعث عذاب سے یکسر بری ہیں۔

صدوقی فرقہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ صرف ربّ الیہود ہے۔ جنت و دوزخ، قیامت اور فرشتے کوئی چیز نہیں۔ اجتہاد باطل ہے۔ مذہبی قوانین کی لفظی پیروی ضروری ہے، اور اُن میں ترمیم و اضافہ ناجائز۔

فلسفیانہ مکاتبِ فکر فلسفہ علم و استدلال اور عقلی ذرائع کے ساتھ کائنات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کا نام ہے۔ دنیا کے دیگر پیروان مذاہب کی مانند یہودی بھی یونانی فلسفہ سے متاثر ہوئے۔ اس تاثر کی کارفرمائی ہمیں بائبل میں نظر آتی ہے۔ بعض کتب و صحائف تو سراسر فلسفیانہ ہیں۔ بعض یہودی عالم افلاطون کے فلسفہ سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ اس کے داعی و مبلغ بھی بنے۔ کچھ اور لوگ ارسطو کے فلسفہ کے شیدائی تھے۔ بعد کے یہودی علماء میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو مسلمان فلاسفہ سے متاثر ہوئے اور ان کے اسلامی فلسفہ — علم کلام — کو اپنے علم و تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ ہر علم و فن کی مختلف شاخوں میں مشہور یہودی فضلاء کے نام ملتے ہیں۔ بعض مسلم فلاسفہ کی مانند یہودیوں نے بھی بائبل کے نظریات کو فلسفہ کے مطابق قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مسلمانوں میں علامہ ابن رشد اندلسی کا نام مشہور ہے۔ جس نے اسلامی عقائد و تعلیمات کو فلسفہ کے اور فلسفہ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق قرار دینے کے لئے تاویل کا سہارا ڈھونڈا تھا۔ بہرحال دنیا کے مشہور فلاسفہ کی فہرست میں ہمیں کئی یہودی علماء کے نام بھی ملیں گے جس سے ہم ان کے علمی ذوق اور تحقیق کے شغف کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

یہودیوں کے عقائد انبیاء کی اصلی تعلیم کی رُو سے یہودیت توحید کا مذہب ہے۔ اگر ہم مختلف ادوار کی بدعات اور رسوم شرک و کفر کو نظر انداز کر کے صرف انبیاء کی تعلیم پر نظر ڈالیں تو عقیدۂ توحید صاف نظر آتا ہے۔ مگر اتنا واضح اور اُجلا نہیں جتنا اسلام نے اُسے پیش کیا ہے۔ یہودیوں کے ہاں خدا کو رنج و غم، پچھتاوا، تھکن اور اسی طرح کے دوسرے انسانی عوارض لاحق ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً سبت اُن کے نزدیک تخلیق کائنات سے فارغ ہو کر خدا کے آرام کا دن تھا۔ لہذا شریعت موسوی نے اسے عبادت کا دن قرار دیا۔ نوحؑ کے وقت میں لوگوں کا شرک

وکفر اور بدکاری دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو تخلیقِ انسان پر پچھتانا پڑا۔ خدا نے رات بھر یعقوبؑ سے کشتی لڑی اور صبح برابر رہا۔ خدا یہود کے قافلے کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔ آدمؑ کے وقت میں خدا کے بیٹے خدا کی بیٹیوں سے مقاربت کرکے انسانی نسل میں اضافہ کرتے رہے۔

جہاں تک رسالت کا تعلق ہے یہودیوں نے سچے اور جھوٹے نبیوں کا امتیاز مٹا دیا ہے۔ ان کے لٹریچر میں کذّاب اور دجّال انسانوں پر بھی نبی کا لفظ بولا گیا ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے عظیم پیغمبروں پر جو شرک و کفر، شراب خوری، جھوٹ، دھوکا فریب، زناکاری، شہوت پرستی اور بت گری و بت پرستی کے الزام لگائے ہیں، انہیں پڑھ کر پتہ چل سکتا ہے کہ یہودیوں میں عصمتِ انبیاء کا کوئی عقیدہ نہیں، اور وہ ہر قسم کے آوارہ مزاج ـــ معاذ اللہ ـــ لوگوں کی نبوت و رسالت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

یہودیوں کا مذہب ایک نسلی خدا کا تصور پیش کرتا ہے۔ جو رب العالمین کے بجائے صرف رب بنی اسرائیل ہے۔ اسی طرح وہ نسلی رسالت کے قائل ہیں۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے ایمان نہ لانے کا بڑا سبب یہی تھا کہ آپؐ اسرائیلی کے بجائے اسماعیلی تھے۔ لیکن اس بات کا ان کے ہاں کوئی جواب نہیں کہ عیسیٰ مسیح تو اسرائیلی تھے۔ انہیں کیوں نہ مانا؟

آخرت اور جنت و دوزخ کا ذکر یہودی لٹریچر میں نہیں ملتا اگر ملتا ہے تو دھندلے انداز میں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب خدا صرف ایک نسل کا خدا ہے تو وہ نسل پاک اور بخشی ہوئی ہے۔ اصل معاملہ یوں نظر آتا ہے کہ آخرت اور عذاب و ثواب کا قائل ہونے کے باوجود ان کی مادہ پرستی اور بندگیٔ نفس نے ان عقائد کو کتبِ مقدسہ سے نکال دینے پر اُکسایا ہوگا۔ وہ فرشتوں کے قائل تو ہیں مگر ان کے متعلق عجیب و غریب توہمات کا ذکر بائبل میں ملتا ہے۔ وہ جبرئیل کے دشمن ہیں کیونکہ اُس نے اُن پر بار بار ان کی سرکشی کے باعث عذابِ الٰہی کا کوڑا برسایا تھا۔ ان کے ہاں ایک نجات دہندہ مسیحِ موعود کا عقیدہ اب تک موجود ہے۔

یہودیوں کی مذہبی رسوم

توریت کے حکم کے مطابق یہودیوں میں ہر نومولود کا ختنہ پیدائش کے بعد آٹھویں دن کیا جاتا ہے۔ یہ حکم موجودہ بائبل کی کتاب پیدائش میں بھی موجود ہے۔ ان کے ہاں جو تیوہار بطور رسومِ مذہبی منائے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) ہر سالِ عیسوی کی ۱۵، ۱۶ اپریل کو عیدِ فسح ـــ مصر سے رہائی اور چھٹکارے کی عید ـــ منائی جاتی ہے۔ (۲) ستمبر کے مہینے میں یہودیوں کے سالِ نو کا تہوار منایا جاتا ہے۔ (۳) ۱۱ فروری کو ہامان

فرعون کا وزیر ــــ کے ہاتھ سے بچ جانے کی خوشی میں پوریم کی عید ہوتی ہے۔ (۴) یہودی سالار یہوداہ مکابیس کے شامیوں کے لشکر پر فتح یابی کی خوشی میں چونوکاہ کا دن منایا جاتا ہے۔ (۵) سبت کا دن تورات کے حکم کے مطابق ہر کام سے فارغ ہو کر صرف عبادت میں گزارتے ہیں۔ (6) موجودہ یہودی اسرائیل کی سلطنت کے قیام کی یاد میں جشن مناتے ہیں جسے یوم ہاتز موت کہا جاتا ہے۔ (7) عید فصح کے بعد 50 ویں دن یوم خمیس مناتے ہیں۔ اس دن نئے گیہوں کی دو روٹیاں یہوواہ کے آگے لہرا کر پروہت ــــ کاہن ــــ کھا لیتا ہے۔ سات بھیڑیں یا بیل اور دو دنبے ذبح کر کے غرباء و مساکین کی دعوت کی جاتی ہے۔ (8) یہودیوں میں بے شمار سوختنی اور غیر سوختنی قربانیاں ہوتی ہیں۔ ان کا طریقہ اور پیچیدہ رسوم کتاب خروج اور استثناء میں درج ہیں۔ سوختنی قربانی میں جانور جلا دیے جاتے تھے۔ غیر سوختنی قربانی میں کچھ اجناس اور تیل وغیرہ قربان گاہ پر پیش ہوتا تھا۔ سوختنی قربانی عموماً گناہوں کا کفارہ سمجھی جاتی تھی۔ جب یہودیوں میں ان قربانیوں کی ادائیگی کا زیادہ ہی رواج ہو گیا اور انہوں نے اسی کو اصل مذہب قرار دے لیا تو موسیٰ کے بعد دوسرے انبیاء نے اس رجحان کو رد کیا اور بتایا کہ دین ظواہر پرستی کا نام نہیں بلکہ دلی خلوص اور پختہ ایمان کا نام ہے۔ اب غالباً یہودی قربانی کی رسم پر اتنا زور نہیں دیا جاتا۔ (9) یہودی سات کے عدد کو مقدس سمجھتے ہیں۔ لہٰذا سبت کی طرح ساتواں مہینہ بھی مبارک سمجھتے ہیں۔ اسی مہینے میں قربانی دگنی کر دیتے ہیں۔ زمین کو ساتویں سال جوتنا چھوڑ دیتے ہیں۔ قرض معاف کر دیتے یا ادائیگی میں مزید مہلت دے دیتے ہیں۔ دعوتیں ہوتی ہیں۔ اور لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ (10) ساتویں سال کے بعد ہر پچاسویں سال کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ غلام آزاد کرتے اور مرہونہ جائداد اصل مالک کو لوٹا دیتے ہیں۔

بعض معاشرتی احکام

بائبل کی کتاب خروج کے مطابق اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ دس احکام دیئے تھے۔ جن کو احکام عشرہ کہا جاتا ہے: (1) والدین کی تعظیم (2) قتل سے گریز (3) زنا سے اجتناب (4) چوری سے پرہیز (5) ہمسائے کے خلاف جھوٹی گواہی دینے سے پرہیز (6) ہمسائے کے گھر کے لالچ سے گریز (7) پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا (8) پڑوسی کے غلام اور لونڈی کا لالچ نہ کرنا (10) پڑوسی کے جانوروں کا لالچ نہ کرنا۔

شریعت موسوی میں عورت کا درجہ مرد سے بہت کم ہے۔ اس کا مالک خاوند ہے اور وہ اس کی مملوکہ ہے۔ شادی سے قبل وہ والدین کی ملک میں ہوتی ہے اور شادی کے بعد خاوند کی۔

یہی سبب ہے کہ زنا اور اغواء کے مقدمات میں اکثر جرمانے کی سزا مقرر ہے۔ صرف بعض صورتوں میں رجم کی سزا کا حکم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات میں بھی اصل کتاب میں تحریف کی گئی ہے۔ واللہ اعلم حق مہر کا حکم بائبل میں موجود ہے۔ تعددِ ازدواج کی اجازت ہے۔ بائبل کی کتابوں میں بعض پیغمبروں کی سینکڑوں تک بیویاں بتائی گئی ہیں۔ طلاق کے احکام بھی بائبل میں پائے جاتے ہیں۔

یہ تو چند معاشرتی احکام ہیں۔ جنگ کے احکام، غیر قوموں سے سلوک کے احکام، جنگی قیدیوں کے احکام، مفتوح اقوام کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ کے احکام نہایت شدید ہیں۔ جنہیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ پاکیزگی، ذبح کرنے اور سود کی ممانعت کے احکام بھی موجود ہیں۔ مگر سود کے سلسلے میں تورات کے احکام میں تحریف کر کے غیر اسرائیلی لوگوں سے سود لینا حلال قرار دیا گیا ہے۔ خنزیر کا گوشت حرام کیا گیا ہے۔ اور یہ حکم موجودہ بائبل کی کتابوں میں واضح طور پر موجود ہے۔

عیسائیت

تعارف اسلامی عقیدے کی رُو سے تمام پیغمبروں کی دعوت اسلام کی طرف تھی۔ جس طرح مرورِ زمانہ سے انبیائے بنی اسرائیل کے پیش کردہ دین کو یہودیت کا نام ملا اسی طرح عیسائیت کا معاملہ بھی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت میں ہمیں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ عیسائیت یا نصرانیت کے داعی تھے۔ اناجیل اربعہ یا عہد نامۂ جدید کی کسی اور کتاب میں یہ اصطلاح نظر نہیں آتی۔ عیسیٰ علیہ السلام کے دورِ تبلیغ میں اور اس کے بعد بھی ایک عرصے تک یہی نظر آتا ہے کہ وہ یہودیوں کی پیدا کردہ بدعات کا ازالہ کر کے اصل الٰہی دین کو قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہودی کافی عرصے تک پیروانِ مسیح کو اپنا ہی ایک جزو سمجھتے رہے اور خود پیروانِ مسیحؑ نے بھی اس سلسلے میں کوئی دوسری وضاحت نہیں کی۔ عیسائیت اور نصرانیت کے الفاظ بعد میں ایجاد ہوئے۔ مسیحؑ کے وہ پیرو جو یہودیوں سے نکل کر ان کی جماعت میں شامل ہوئے تھے۔ فلسطین میں پہلے پہل یہودیوں نے انہیں امتیاز کی خاطر یسوع ناصری کے پیرو کا لقب دیا۔ ناصرہ یا نزارتھ اس مقام کا نام تھا جس میں عیسیٰ علیہ السلام بچپن میں اپنی والدہ کے ساتھ کچھ عرصہ ٹھہرے تھے، اسی نسبت سے انہیں ناصری کہا گیا تھا۔ عیسائی کا لفظ اُن غیر یہودی (یونانی الاصل) لوگوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جو یہودیوں کی تعذیب

سے بچنے کی خاطر فلسطین سے نکل کر ایک ساحلی مقام انطاکیہ میں آ مقیم ہوئے تھے۔ انہیں لوگوں کے عقائد سے ملتے جلتے خیالات و عقائد پولوس (سینٹ پال) کے بھی تھے جسے موجودہ عیسائیت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ یونانی الاصل عیسائی اور پال اس بات پر متفق تھے کہ یہودی شریعت پر عمل کرنا عیسیٰ کی بعثت کے بعد ضروری نہیں رہا اور نجات کے لئے صرف عیسیٰ پر ایمان لانا (ان کی پیش کی ہوئی وضاحت و تفصیل کے مطابق) کافی ہے۔ غرض یہ ان القاب کی مختصر ابتدائی تاریخ ہے۔ اب عیسائیوں کے تمام فرقوں پر انہی الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے اور ان کا مذہب عیسائیت یا نصرانیت کہلاتا ہے۔

تعریف

جہاں تک عیسائیت یا نصرانیت کی تعریف کا تعلق ہے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ عیسائیت میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ عیسائیت وہ مذہب ہے جو اپنی اصلیت کو ناصرہ کے باشندے یسوع کی طرف منسوب کرتا ہے اور اُسے خدا کا منتخب قرار دیتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن میں اسی نام کے مقالے میں مسٹر الفریڈ ای گاروے نے لکھا ہے کہ عیسائیت کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ اخلاقی، تاریخی، کائناتی موحدانہ اور کفارے پر ایمان رکھنے والا مذہب ہے جس میں خدا اور انسان کے تعلق کو خداوند یسوع مسیح کی شخصیت اور کردار کے ذریعے سے پختہ کر دیا گیا ہے۔ اخلاقی سے مراد یہ ہے کہ اس مذہب میں عبادتوں اور قربانیوں سے کوئی دنیوی مقصد حاصل کرنے کے بجائے یہ بتایا گیا ہے کہ مذہب کا مقصد اعلیٰ روحانی کمال حاصل کرنا اور خدا کی رضا طلب کرنا ہے۔ تاریخی کا مطلب یہ ہے کہ اس مذہب میں بنیادی حیثیت ایک تاریخی ہستی یعنی عیسیٰ یسوع مسیح کو حاصل ہے۔ کائناتی سے مراد یہ ہے کہ یہ مذہب عالمگیر دعوت پیش کرتا ہے۔ کسی رنگ یا نسل کے ساتھ مخصوص نہیں۔ موحدانہ کا مطلب یہ کہ عقیدۂ تثلیث کے باوجود اس میں ایک خدا کا تصور پایا جاتا ہے۔ کفارے سے مراد یہ ہے کہ اس میں انسان کو کفارے کے ذریعے خدا کے قریب کیا گیا ہے۔ کیونکہ گناہ کے باعث وہ اس سے دور ہو چکا تھا۔

اس تعریف میں تعریف کم اور تبلیغ زیادہ ہے۔ مشرک قوموں نے اپنے شرک کو ہمیشہ فلسفیانہ موشگافیوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ہندوؤں جیسی بُت پرست قوم کے پڑھے لکھے لوگ بھی کہتے کہ ایک ہی خدا مانتے ہیں مگر کون احمق یہ تسلیم کرے گا کہ وہ واقعی موحد ہیں؟ عیسائی علماء و فضلاء عقیدۂ تثلیث کا جو بھی نام رکھیں اور اس کی

جو بھی تاویل یا تشریح کریں، بہرحال یہ ایک صریح شرکیہ عقیدہ ہے۔ اندر سے خود انہیں بھی اس تضاد کا احساس ہے۔ مگر بات بنانے کی کوشش میں وہ اِدھر اُدھر کی تاویلوں کا سہارا لیتے ہیں۔ تثلیث پر مفصل گفتگو انشاء اللہ آگے آئے گی۔ نصرانیت کے متعلق بعض علماء کا یہ خیال بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہ لفظ ناصرہ سے نہیں بلکہ حواریوں کے قول:
نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ہم دینِ الٰہی کے مددگار ہیں، اور قَالُوْا اِنَّا نَصَارٰی "انہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ (مددگارانِ مسیح) ہیں، سے ماخوذ ہے۔

بعثتِ عیسوی کا پس منظر

عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہودی قوم اخلاقی معاشرتی، سیاسی اور خالص دینی نقطۂ نظر سے پستیوں کی انتہاء گہرائیوں میں گر چکی تھی۔ ان کے علماء شکم پرست، مشائخ، مادہ پرست اور عوام توہم پرست ہو چکے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے پیغام کے ساتھ ان کا تعلق برائے نام رہ گیا تھا۔ ان کی نافرمانیوں، بداعمالیوں اور قانونِ الٰہی کی علانیہ مخالفت کے باعث کئی مرتبہ عذاب خداوندی کا کوڑا برس چکا تھا۔ مگر انہوں نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا تھا۔ اسیریٔ بابل کے بعد جو یہودی شہنشاہِ سائرس کی نوازشات کے نتیجے میں فلسطین میں آبسے تھے۔ ان میں عراقی مشرکوں کے اندر ایک عرصہ گزرنے کے باعث بے شمار مراسمِ شرک و کفر پیدا ہو چکی تھیں۔ جو لوگ بابل ہی میں رہ بس گئے تھے وہ کسی بہتر مستقبل کی امید سے خالی ہو چکے تھے۔ یہودی ربّی اور عالم اس زوال زدہ قوم کو ایک موہوم شاندار مستقبل کی امیدیں دلا کر اوہام کی غذا پر زندہ رکھنے کی سعیٔ ناکام کر رہے تھے۔ کچھ مدت کے بعد اس مغضوب قوم پر غضبِ خداوندی کا ایک اور چابک ٹائٹس رومی کے حملے اور یروشلم اور قدس کی مکمل تباہی کی صورت میں برسنے والا تھا۔ پیمانہ بھر چکا تھا بس اب لبریز ہوا چاہتا تھا۔ یہود میں ایک نجات دہندہ مسیحا کا انتظار تھا۔ جو ان کے خیال کے مطابق بنی اسرائیل کی شیرازہ بندی کر کے از سرِ نو انہیں سیاسی و مادی قوت دلانے کا کفیل تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد آسمانی بادشاہت کا جو تصور ان کے پیروؤں میں جاگزیں ہوا، یہود کا تصورِ مسیحا اس کے یکسر برعکس تھا۔

اس دور کے یہودیوں کی نام نہاد دینی حالت کا اندازہ کچھ ان مواعظ و تقاریر اور عیسیٰ کے ساتھ ان کے سوال و جواب سے ہو جاتا ہے۔ جو انجیل میں موجود ہیں۔ بقولِ عیسیٰؑ وہ ریاکار تھے، ظواہر پرست تھے۔ منافق تھے، خدائی احکام کو پسِ پشت ڈال کر انسانی احکام پر عمل کرتے اور انہی کی تعلیم دیتے تھے۔ مادہ پرستی نے ان کے دلوں کو زنگ آلود اور سخت کر دیا تھا

قرآن کے بیان کے مطابق ان کے دل: كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً پتھروں جیسے بلکہ ان سے بھی سخت تر تھے۔ انہوں نے تورات میں تحریف اور ردّو بدل کو شب و روز کا شیوہ بنا لیا تھا۔ اوّل تو تورات پر جو تباہی کے متعدد حوادث گزر چکے تھے ان کے باعث وہ محض زبانی یادداشتوں کا مجموعہ رہ گئی تھی، پھر یہودی اس کے احکام میں نت نئی تبدیلیاں اپنی شکم پرستی اور دنیا دار چودھریوں کی خوشنودیٔ مزاج کی خاطر کرتے تھے۔ انہوں نے "بڑے لوگوں" کی خاطر تورات کے احکام رجم اور قوانین جرائم کو عملاً منسوخ کر رکھا تھا، حالانکہ یہ احکام اب بھی تورات کی مختلف کتب میں موجود ہیں۔ قرآن نے ان پر جو فردِ قرار دادِ جرم لگائی ہے اس میں سُود خواری رشوت خواری، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنا، قتل انبیاء، خدا کے برگزیدہ بندوں پر بہتان طرازی تحریفِ کتاب، اپنی بناوٹ کو کتاب الٰہی قرار دینا، نسلی غرور، خدا کے محبوب اور بیٹے بن بیٹھنا، آخرت کی نجات کی اجارہ داری، حسد و بغض کے باعث انبیاء کی تکذیب، طاغوت کی عبادت کرنا، بُت پرستی، گوسالہ پرستی اور بار بار کی تنبیہات اور عقوبات کے باوجود ڈھٹائی اور سینہ زوری شامل ہیں۔ الہامی مذاہب وادیان کے ماننے والوں میں ان کے سوا کوئی دوسری قوم ایسی نظر نہیں آتی جس میں اخلاقی و دینی زوال کی اتنی پستیاں پائی جاتی ہوں۔

عیسیٰؑ کی پیدائش اور بعثت

عیسیٰؑ کی والدہ مریمؑ کے باپ کا نام عمران تھا۔ عمران کا نسب اور قبیلہ نامعلوم ہے۔ البتہ مریمؑ کی ماں حنہ اور یحییٰؑ کی والدہ ایشاع سگی بہنیں تھیں۔ اور ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھیں۔ بائبل کی رُو سے موسیٰ علیہ السلام نے عبادت گاہ کا انصرام اور رسوم عبادت و قربانی کی ادائیگی کا انصرام ہارونؑ کے ذمہ کر رکھا تھا۔ وہ معبد کے کاہن اعظم تھے۔ ان کے بعد یہ منصب ان کی اولاد میں وراثتہً چلتا رہا۔ یحییٰؑ کے والد زکریاؑ کے متعلق بھی ثابت ہے کہ وہ بیت المقدس کے کاہن تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یحییٰؑ تو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ہارونی تھے۔ مگر عمران کے قبیلہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غرض مریمؑ اور یحییٰؑ خالہ زاد بہن بھائی تھے۔ اسی رشتے کی بنا پر احادیث میں یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کو خالہ زاد فرمایا گیا ہے۔ جب ایشاع باوجود بوڑھی اور بانجھ ہونے کے باذن اللہ زکریاؑ سے حاملہ ہوئی (زکریاؑ اس وقت خود کافی بوڑھے ہو چکے تھے) تو اس معجزانہ حمل نے حنہ کے دل میں اولاد کی طلب پیدا کی۔ اس زمانے میں لڑکوں کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے تاعمر وقف کرنے کا رواج تھا۔ حنہ نے اپنے پیٹ کے بچے کو اسی خیال سے بیت المقدس کی نذر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اسے فرزند نرینہ عطا کرے گا۔ مگر جب مریم پیدا ہوئی تو حنہ کو تعجب ہوا، آخر نذر کے

مطابق اُسے بیت المقدس لے جایا گیا اور قرعہ اندازی سے مریمؑ کے خالو زکریاؑ کو اس کا مربی اور نگران مقرر کیا گیا۔ مریمؑ بڑی پاکباز، عفیفہ اور عبادت گزار تھی۔ جب وہ جوان ہوئی تو فرشتوں نے اسے عیسیٰؑ کی پیدائش کی بشارت دی۔ اس کے اظہارِ تعجب پر فرشتوں نے خدا کا حکم سنا دیا کہ یونہی ہو گا۔ مریمؑ بہت غمگین ہوئی اور بیت المقدس کو چھوڑ کر بیت اللحم چلی گئی تاکہ لوگوں کی سب و شتم اور بدنامی سے بچی رہے۔ انجیل کا بیان ہے کہ مریمؑ کا نکاح یوسف نجار نامی ایک شخص سے ہو گیا تھا اور وہی مریمؑ کو بدنامی کے خوف سے بیت اللحم لے گیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اناجیل عیسیٰؑ کا نسب نامہ یوسف نجار سے (بحیثیتِ والد) شروع کرتی ہیں۔ کتاب و سنت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اور یہ بات بھی حیرتناک ہے کہ عمر بھر کے لئے معبد کی خدمت کے لئے وقف کی جانے والی لڑکی کا نکاح کیسے کر دیا گیا! اور وہ بھی ایک غیر معروف شخص کے ساتھ!!

بہرحال مریمؑ نے بیت اللحم میں عیسیٰؑ کو جنم دیا۔ ولادت کے بعد مریمؑ بچے کو قوم کے سامنے لائی اور لوگوں نے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ (اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف نجار سے نکاح والا افسانہ بس افسانہ ہی ہے۔ ورنہ یہ صورتِ احوال پیش نہ آتی۔ اور یہود کو معاذ اللہ عیسیٰ علیہ السلام پر از راہِ عداوت و تمسخر ناجائز اولاد کی پھبتی کسنے کا موقع نہ ملتا۔) مریمؑ نے فرشتوں کی ہدایت کے مطابق بچے کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو۔ بچہ گہوارے سے بول پڑا جس میں اپنی عبدیت و نبوت اور صاحبِ کتاب ہونے کا ذکر تھا۔

عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی پر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ عیسائی لٹریچر میں ان کے مقامِ پرورش میں بھی کافی اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ حاکمِ وقت کے خوف سے یوسف نجار بیوی بچے کو لے کر مصر چلا گیا۔ جب شاہ ہیرودیس مر گیا تو واپس فلسطین لے آیا۔ پھر ایک دوسرے بادشاہ کے عہد میں اس خاندان کو گلیل کے علاقے میں ناصرہ نامی قصبے میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ اور عیسیٰؑ کی پرورش زیادہ تر ناصرہ میں ہوئی۔ اس تعلق کی بنا پر انہیں یسوع ناصری کہا گیا۔ ناصرہ میں مریمؑ کی خالہ کا مکان بھی تھا جس میں اسے گھر جیسی سہولتیں میسر تھیں۔ کچھ لوگوں نے عیسیٰؑ کی پرورش کا مقام دمشق بتایا ہے۔ بعض نے رملہ اور بعض نے یروشلم بھی کہا ہے۔

بے باپ کی پیدائش عیسیٰؑ کی خدائی یا ابن اللہ کی دلیل نہیں بن سکتی ورنہ پھر آدمؑ کو عیسیٰؑ سے بڑا خدا یا معاذ اللہ خدا کا بڑا بیٹا یا بھائی ماننا لازم آئے گا۔ اس پر مزید گفتگو کا مقام ان شاء اللہ آگے آئے گا جہاں بتایا جائے گا کہ یحییٰؑ کی پیدائش بھی معجزانہ طور پر ہوئی مگر کسی نے انہیں خدائی یا

نبیت کے مقام پر فائز نہیں کیا۔

انجیل کے بیان کے مطابق عیسیٰؑ ۳۰ برس کی عمر میں نبوت سے سرفراز ہوئے۔ انہوں نے یحییٰؑ سے بپتسمہ (غسلِ توبہ) بھی لیا تھا۔ اور یحییٰؑ کی فضیلت اور رفعتِ درجات کا اظہار کرتے رہے۔ انجیل کے مصنفوں نے اس مقام پر عجیب دیومالائی قسم کی حکایات بیان کی ہیں جن کا ذکر ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ عیسیٰؑ کو (دیگر انبیاء و رسل کی مانند) عظیم معجزات دیئے گئے مثلاً گہوارے میں کلام کرنا، کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کا علم، مٹی کی چڑیاں بنا کر حکم خداوندی سے پھونک مار کر اڑا دینا، لاعلاج مریضوں کا علاج، بحکمِ الٰہی مُردوں کو زندہ کرنا، جب یہود نے انہیں جادوگر کہہ کر مبتلائے اذیت کرنا چاہا تو اُن سے صاف بچائے جانا۔ قرآن کے بیان کے مطابق عیسیٰؑ کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ "میں دینِ موسیٰؑ کی تجدید کرنے آیا ہوں"۔ انہوں نے دیگر انبیاء کی مانند توحیدِ الٰہی اور رسالتِ عیسوی کا پرچار کیا، بدعات کو رَد کیا۔ اور شریعتِ موسیٰؑ کی بعض شدتوں میں نرمی پیدا کی۔ انہوں نے یہودی علماء ومشائخ کی ظاہر پرستی، شکم پروری اور حُبِّ دنیا پر شدید تنقید کی جسے وہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کر سکے اور ان کے درپئے آزار ہوگئے۔ حکومتِ وقت کے ساتھ سازش کرکے انہوں نے عیسیٰؑ کی گرفتاری اور ان کے خلاف عدالتی کارروائی کا پروانہ حاصل کر لیا۔ بارہ حواریوں میں سے ایک یہودا اسکریوتی نے جاسوسی کی کہ عیسیٰؑ فلاں مقام پر شاگردوں سمیت موجود ہیں۔ قرآن کے بیان کے مطابق وہ گرفتار کرنے آئے مگر عیسیٰؑ کو نہیں بلکہ ان کی ایک تشبیہ — جو خود وہ جاسوس حواری تھا — کو پکڑ کر لے گئے۔ عیسیٰؑ کو خدا نے اٹھا لیا اور یہود نے اس تشبیہ پر مقدمہ چلوایا۔ اس کے واویلا اور شور وغل کی پروانہ کی اور آخرکار موت کا حکم صادر کرا کے اسے صلیب پہ مار دیا۔ عیسائی لٹریچر کا بیان ہے کہ سُولی چڑھنے والا اور مرنے والا تھا تو عیسیٰؑ ہی مگر موت کے تیسرے دن وہ قبر سے غائب پایا گیا۔ یہیں سے یہود نے عیسیٰؑ کے کذب پر استدلال کیا کہ بائبل کے مطابق صلیب لعنتی موت ہے۔ جو کسی صادق القول اور راست باز کو نہیں دی جاسکتی تھی، لہٰذا عیسیٰؑ نبی وغیرہ کچھ نہیں بلکہ ایک ملعون مجرم تھا۔ معاذ اللہ منہ۔ عیسائیوں نے کہا کہ یہ لعنتی موت مر کر عیسیٰؑ نے اپنے ماننے والوں کو گناہ کی آلائش سے صاف کر دیا تھا۔ بعد میں یہی کفارے کا عقیدہ عیسائیت کی بنیادی اینٹ بنا دیا گیا۔ انجیلوں میں سے انجیل برنباس کی تصریحات قرآن کے بیان کے مطابق ہیں۔ انجیل برنباس چھپ چکی ہے اور بآسانی مل سکتی ہے۔

تعلیماتِ مسیحؑ اس عنوان کے تحت ہمیں جو کچھ لکھنا مدنظر ہے وہ موجودہ عیسائیت کی تعلیمات نہیں بلکہ جناب عیسٰی علیہ السلام کی صحیح اور اصلی تعلیمات ہیں۔ ان تعلیمات کے بیان کے لئے سب سے بڑا اور لائقِ اعتبار منبع خدا کا آخری غیر متبدل اور محفوظ کلام قرآن مجید ہے۔ انجیل میں بھی یہ تعلیمات موجود ہیں مگر مختلف اناجیل کے مصنفین نے ان تعلیمات کو اپنے مقاصد کی خاطر دھندلا یا کچھ پیچیدہ کر ڈالا ہے۔ عیسائیت کی تعلیمات عیسیٰؑ کی تعلیمات سے بالکل مختلف ہیں۔ عیسیٰؑ نے کہیں اپنے آپ کو خدا نہیں کہا۔ وہ بار بار اپنے کو ابنِ آدم کہتے ہیں۔ یحییٰؑ کو اپنے سے افضل قرار دیتے ہیں۔ تثلیث فی التوحید یا توحید فی التثلیث کی طرف کہیں اشارہ بھی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس خدائے واحد کی توحید و عبادت کا اعلان کرتے ہیں۔ عیسیٰؑ کی مصلوبیت کو بھی اناجیل میں متضاد طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اور انجیل برنباس نے تو اس سے انکار کر کے عیسائیت کا بھانڈا ہی پھوڑ دیا ہے۔ کفارے کا عیسیٰؑ کے ہاں کوئی وجود نہیں، یہ سب عقائد بعد کی پیداوار ہیں۔ جیسا کہ عنقریب انشاء اللہ اس موضوع پر بحث کی جائے گی۔ از روئے قرآن مسیح علیہ السلام کی دعوت یہ تھی کہ: اَللّٰهُ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (مریم – ۳۶) " بلاشبہ اللہ میرا اور تمہارا رب ہے سو اُسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے " وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (آلِ عمران) " میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں جو مجھ سے پہلے نازل ہو چکی ہے "

وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (الصف)

" اور میں اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی خوش خبری دیتا ہوں جس کا نام احمدؐ ہے "

اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم) (مریم)

" اور مجھے اللہ نے زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے "

تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر (انجیل متی) اے اسرائیل سُن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ (لوقا) اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ انسان تجھ خدائے واحد اور برحق کو جانے اور مسیح کو تیرا بھیجا ہوا یقین کرے (یوحنا) انجیل یوحنا کی اس آیت میں توحیدِ الٰہی کے ساتھ عیسیٰؑ کی رسالت کا بھی اظہار ہے۔ یہاں خدائی، ابنیت اور کفارہ وغیرہ کی طرف ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح اسی انجیل کے دوسرے مقام پر ہے:۔ میں نے کہا تا کہ وہ ایمان لائیں کہ تو ہی نے مجھے بھیجا ہے (یوحنا باب ۱۱) جو

مجھ پر ایمان لاتا ہے وہ مجھ پر نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے پر ایمان لاتا ہے (یوحنا باب ۱۲)
جب تم میرے کہنے پر عمل نہیں کرتے تو کیوں مجھے خداوند، خداوند کہتے ہو؟ (لوقا)

بنیادی عقائد اور بعض اخلاقی احکام کے سوا عیسیٰ علیہ السلام نے کچھ نہیں فرمایا۔ بقول ایک عیسائی عالم جوڈ کے: سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق حضرت عیسیٰ کی تعلیم افسوسناک حد تک مبہم ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسیحی علماء سرمایہ داری، استعماریت، غلامی، جنگ، قید و بند، دشمنوں کو زندہ جلانا اور تکالیف دینا، غرض جو چاہیں بلا دقت مسیح کی تعلیم ثابت کر سکتے ہیں (عیسائی عبادت کے اصول)

مسٹر جوڈ نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ عیسائی دنیا شروع سے اب تک حضرت عیسیٰ کی تعلیم کو زندگی کے اخلاقی شعبے کے سوا ہر چیز سے خاموش تسلیم کرتی آئی ہے۔ بلکہ عیسائی علماء کو اس بات پر فخر و ناز بھی ہے کہ ایسی "بے ضرر" تعلیم کو تسلیم کر لینے میں کسی شخص یا قوم کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جو اس کی سیاسی، معاشی، معاشرتی زندگی میں اسے بالکل آزاد چھوڑ دے۔ موجودہ عیسائی مذہب بڑا لچکدار ہے۔ پھر پال وغیرہ لوگوں نے اسے یونانی و رومی مشرکوں کی خاطر قابل قبول بنانے کے لئے اور بھی بہت سی تبدیلیاں کر دی ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

اخلاقیات میں عیسیٰ کی تعلیم کچھ اس طرح کی ہے: شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو تو چغہ بھی اسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا (متی ۵)

اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو (متی ۶)

کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پیئیں گے، اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر کو ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے

ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ (متی ۷)

مسیح علیہ السلام کی یہ تعلیم بالکل برحق تھی۔ انہوں نے مادّہ پرستی اور شکم پروری کا رد کر کے خدا پرستی کا تصور لوگوں کے ذہن و دماغ میں راسخ کرنے کی کوشش کی۔ اس مضمون کو تمثیلات اور محاورات کی زبان میں پیش کیا تاکہ دنیا پرستانہ ذہن کا رُخ موڑا جا سکے۔ لیکن عجائب پسند اور غلو سے محبت کرنے والی ذہنیت نے اس کا اور ہی مطلب لیا اور رہبانیت کو ہی دین بنا ڈالا۔ ترکِ دنیا اور زہد و قناعت میں مبالغہ کرنے کو رضائے خداوندی سمجھا گیا اور سادھو پن عُریانی، اپنے آپ کو اذیت دینا، شادی نہ کرنا اور نفس کشی کے عجیب و غریب طریقے باقاعدہ قواعد و ضوابط کے ساتھ اختیار کیے جانے لگے۔ یہ غیر فطری عمل تھا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے سچے پیغمبروں کی تعلیم غیر فطری نہیں ہو سکتی۔

اُس دور کے مقدّس لوگوں، مذہبی اجارہ داروں، علماء اور مشائخ نے ریاکاری اور منافقت کا جو ڈھونگ رچا رکھا تھا اس پر عیسیٰ علیہ السلام نے یوں چوٹ لگائی: "فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس وہ جو کچھ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ مگر آپ انہیں اپنی اُنگلی سے ہلانا بھی نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دُگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔ اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اُوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے

ہو'' (متی ۲۳)

عیسیٰ مسیح کے اس وعظ سے یہودیوں کے دینی پیشواؤں کے اخلاق و عادات اور اعمال وکردار پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وعظ میں معانی کا سمندر پنہاں ہے۔ اس سے ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ قرآن مجید نے بگڑی ہوئی قوم یہود و نصاریٰ کے احبار و رھبان کی ''خداوندی'' اور دینی مناصب کی گدی نشینی کے جو پوست کندہ احوال مدنی سورتوں میں — بالخصوص البقرہ، آل عمران النساء، التوبہ میں — بیان فرمائے ہیں ان کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ہر زمانے کے خود غرض شکم پرست دینی پیشواؤں کا یہی کردار رہا ہے کہ وہ دین حق کی راہ میں پتھر بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نہ خود وہ راستہ اختیار کرتے ہیں نہ کسی اور کو کرنے دیتے ہیں: إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بلاشبہ بہت سے عالم اور درویش لوگوں کے مالوں کو ناجائز طور پر ہڑپ کرتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔'' آیت کے اگلے حصے میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں انہیں خرچ نہیں کرتے، ایسے لوگوں کو دردناک سزا کی ''خوش خبری'' دے دو۔ (التوبہ)

نہ صرف قرآن و حدیث کے محفوظ دینی ذخائر کی روشنی میں بلکہ اناجیل کے ذریعے سے بھی عیسیٰ علیہ السلام کی جو تعلیم ہم تک پہنچی ہے اس کی رو سے ہم یقینی طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ (ا) مسیح علیہ السلام نے یہود کی ظاہر پرستی کا رد کیا اور دین کا اصل مغز اور جوہر پیش کیا مگر بعد میں مسیحیت شرع و قانون سے گلو خلاصی کرا بیٹھی اور تورات کی شریعت جس پر عمل کرنے کی جناب مسیح نے تاکید کی تھی۔ (متی ۵ — لوقا) پولوس نے اسے لعنت ٹھہرا کر اباحیت اور نفس پرستی کے دروازے کھول دیئے۔ اس نے عہد جدید کی کتاب نامہ گلیتون ۳۔ کے مطابق شریعت کو لعنت ٹھہرایا اور نجات کا انحصار صرف مسیح پر ایمان قرار دیا۔

ب۔ عیسیٰ نے کوئی نیا دین یا نئی شریعت پیش نہیں کی تھی۔ ان کا پیغام موسیٰ کے دین کا تکملہ و تتمہ تھا (متی ۵۔ لوقا، یوحنا) مگر ان کے بعد اسے ایک مستقل دین و مذہب بنا دیا گیا جس کی تعلیمات پوری زندگی پر حاوی نہیں، محض چند عقائد اور کچھ اخلاقیات کا نام ''مسیحیت'' رکھ دیا گیا۔

ج۔ مسیح کی تعلیم میں رھبانیت نہ تھی بلکہ دنیا پرستی سے نفرت کا سبق تھا۔ ان کے بعد ایک غیر فطری رھبانیت کو مسیحیت کا طرۂ امتیاز قرار دے دیا گیا اور اس کے لئے باقاعدہ ادارے

کھول دیئے گئے۔

(د) موجودہ مسیحیت نے دین و دنیا کی تفریق کا نظریہ بشدومد سے پیش کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں اسلام پر گندگی بھی اُچھالی ہے۔ مسیحؑ کی تعلیم سے یہ غرض ہرگز نہ تھی کہ دین کو عبادت گاہوں میں بند کردو اور زندگی کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی میدانوں میں خوب اُدھم مچاؤ۔ مگر عیسائی علماء کو اس پر اصرار ہے کہ خالص دنیوی معاملات میں دین کی ہدایات کی کوئی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے عیسیٰؑ کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر اور اس کا غلط مطلب بیان کرکے پیش کیا ہے۔

ھ۔ عیسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ مسیحؑ نے فرمایا اے بنی اسرائیل اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ (الصف) "میں صرف تمہاری طرف اللہ کا فرستادہ ہوں۔" انجیل کہتی ہے کہ مسیحؑ نے اپنے مبلغوں کو حکم دیا: غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں ہی کے پاس جانا (متی - ۱۰) عیسیٰ نے کبھی یہودیوں کے سوا کسی قوم کو خطاب نہیں کیا۔ ایک مدت تک اوّلین عیسائیوں کا یہی عقیدہ رہا۔ پولوس نے پہلی بار عیسائیت کو ایک عالمگیر دعوت کے طور پر پیش کیا۔ پھر یونانی اور رومی مشرکوں کے عقائد و اعمال اور رسوم و عبادات کو اس میں داخل کرکے اصلی مسیحی پیغام کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔ اپنے گھر کی اس چوری کو چھپانے کے لئے اسلام جیسے عالمگیر دین پر محدود ہونے اور صرف عربوں کی خاطر ہونے کا شدید پروپیگنڈا کیا گیا جو اب تک جاری ہے۔

(و) عیسائیت کی پرشکوہ عمارت کی بنیاد تثلیث، مسیحؑ کی مصلوبیت اور کفارے جیسے خلافِ فطرت و عقل جعلی مسائل پر استوار ہوئی ہے۔ مسیحؑ کی تعلیم میں ان نام نہاد بُنیادی عقائد کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ نہ اس میں ابنیتِ مسیحؑ جیسے ناقابلِ فہم مسئلے کا کوئی ذکر ہے۔ جن الفاظ کی رُو سے مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا گیا ہے۔ اسی قسم کے الفاظ دوسرے نبیوں، حواریوں بلکہ تمام انسانوں کے لئے بائبل کے قدیم و جدید عہد نامے میں موجود ہیں۔

(ز) ایک طرف ابنیتِ مسیح کا چکر چلایا گیا تو دوسری طرف الوھیتِ مسیحؑ کا ڈھونگ بھی رچایا گیا۔ اب ایک ہی شخص بیک وقت انسان بھی تھا، خدا بھی تھا، خدا کا بیٹا بھی تھا اور ارکان و اشخاصِ الٰہ میں سے تیسرا رکن بھی تھا۔ یہ مُعمہ اور گورکھ دھندا کسی اور کی سمجھ میں کیا آتا، خود عیسائی علماء و فضلاء کی عقل و فہم سے بھی بالاتر ہے اور اس کا اُنہیں کھُلا اعتراف بھی ہے۔

مفصل بحث انشاء اللہ آگے آئے گی۔

عیسائیت کی تعلیمات جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مسیحؑ کی تعلیمات اور عیسائیت کی تعلیمات دو بالکل جداگانہ چیزیں ہیں۔ اُوپر کے عنوان کے ماتحت ہم نے مسیحؑ کی تعلیمات پر مختصر کلام کیا ہے۔ اس عنوان کے ضمن میں ہمیں موجودہ عیسائیت کی تعلیمات پر کچھ گفتگو کرنا مدِ نظر ہے۔

موجودہ عیسائیت کا بانی پولوس (سینٹ پال) تھا جو مسیحؑ کا حواری نہیں بلکہ شدید دشمن یہودی تھا۔ اس کے ایک ذہین اور "قدآور" شخصیت ہونے میں شبہ نہیں۔ طویل سوچ بچار کے بعد وہ یکایک نمودار ہو کر کشف و الہام اور مسیحؑ کی ملاقات کا مدعی بن بیٹھا اور عیسیٰؑ کے پیغام کو یونانیوں، رومیوں اور غیر اسرائیلی عوام میں مقبول بنانے کی خاطر اس کا حُلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس نے شریعت کو لعنت ٹھہرا کر عیسائیوں کے لئے موسوی قانون کی تمام پابندیاں اُٹھا دیں۔ کھانے پینے اور ذبح میں حلال و حرام کا فرق مٹا دیا، ختنے کے حکم کو منسوخ کر دیا کیونکہ یہ حکم غیر یہودی عوام کو سخت ناپسند تھا۔ مسیحؑ کی الوہیت، ان کا خدا کا بیٹا ہونا، مصلوب ہو کر آدمؑ کے موروثی گناہ کا کفارہ بننے کا عقیدہ، یہ سب چیزیں پولوس کی اختراع تھیں۔

مسیحؑ کے حواریوں کی ناپسندیدگی بلکہ مزاحمت کے باوجود یہ عقائد پھیلتے گئے اور مسیحیت یونانی اور رومی مشرکوں کا مذہب بنتی چلی گئی کیونکہ یہ خیالات ان کے مشرکیہ عقائد سے بہت حد تک مناسبت رکھتے تھے۔ پھر رومی اور یونانی تہواروں اور مشرکانہ رسوم عبادت کو بھی اپنا لیا گیا۔ چالاکی یہ کی گئی کہ اب ان کے نام بدل کر مسیحی رکھ دیئے گئے۔ اس ساری جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل مسیحی تعلیم بالکل پس پردہ چلی گئی۔ اور ان کے نام پر ایک مشرکانہ مذہب بن کر تیار ہو گیا۔ اس نئے مذہب کی بنیاد جن عقائد پر رکھی گئی ہے، ان پر مختصر گفتگو ذیل میں کی جاتی ہے؛

عقیدۂ تثلیث انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں: "تثلیث کے عیسائی نظریئے کو ان الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ باپ خدا ہے بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے۔ لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خدا ہیں۔ اس لئے کہ عیسائی نظریئے کے مطابق ہم جس طرح ان تینوں میں سے ہر ایک اقنوم (PERSON یا رُکن) کو خدا اور آقا سمجھنے پر مجبور ہیں، اسی طرح ہمیں کیتھولک مذہب نے اس بات کی بھی ممانعت کر دی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا تین آقا سمجھنے لگیں"

مطلب یہ ہوا کہ اس عقیدے کی رُو سے بنتے تو تین خدا ہی ہیں مگر عیسائی لوگ مذہبی ممانعت کے باعث انہیں ایک ہی ماننے پر مجبور ہیں۔ مشہور عیسائی عالم اور فلسفی سینٹ آگسٹائن اس عقیدے کی وضاحت میں اپنی کتاب تثلیث میں لکھتا ہے کہ: "باپ بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدائی وحدت تیار کرتے ہیں جو اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک اور ناقابلِ تقسیم ہے، اسی وجہ سے وہ تین خدا نہیں ہیں۔ بلکہ ایک خدا ہے۔ اگرچہ باپ نے بیٹے کو پیدا کیا لہٰذا جو باپ ہے وہ بیٹا نہیں ہے۔ اسی طرح بیٹا باپ سے پیدا ہوا ہے، اس لئے جو بیٹا ہے وہ باپ نہیں ہے اور روح القدس بھی نہ باپ ہے نہ بیٹا، بلکہ باپ اور بیٹے کی روح ہے جو دونوں کے ساتھ مساوی اور تثلیثی وحدت میں ان کی حصہ دار ہے۔" اس وضاحت کی رُو سے بھی تثلیث کے تینوں اقنوم تین ہیں، الگ الگ ہیں۔ باپ خالق ہے بیٹا مخلوق ہے اور روح ان دونوں کے علاوہ تیسری چیز ہے، لیکن دھاندلی یہ ہے کہ اس کے باوجود سینہ زوری کے ساتھ ان تین کو ایک کہا جا رہا ہے۔ اس کے بعد آگسٹائن نے لکھا ہے کہ مریم کے پیٹ سے پیدا ہونے والا اور پھانسی پا کر دفن ہونے والا صرف بیٹا تھا نہ کہ یہ تثلیثی وحدت جو اوپر بیان ہوئی۔ پھر یسوعؑ پر جب یحیٰیؑ سے بپتسمہ لینے کے بعد کبوتر کی شکل میں روح اُتری تو وہ تثلیثی وحدت نہیں بلکہ صرف روح تھی۔ اور جب وہ پہاڑ پر کھڑا تھا اور اسے آواز آئی تھی کہ تو میرا پیارا بیٹا ہے، تو یہ آواز صرف باپ کی تھی نہ کہ تثلیثی وحدت کی۔ آگسٹائن کے قول کے مطابق باپ اپنا کام الگ کرتا ہے بیٹا الگ اور روح الگ، مگر وہ پھر بھی ایک ہیں۔ اس کی وجہ آگسٹائن نے آخر میں لکھی ہے کہ "یہی میرا عقیدہ ہے۔ کیونکہ یہ کیتھولک عقیدہ ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ تین کا تین ہونا اس کے دل میں بھی رہ رہ کر کھٹکتا ہے مگر وہ کیا کرے کہ وہ کیتھولک مذہب کا پیرو ہے اور اندھا دھند اس ناقابلِ فہم غیر عقلی عقیدے کو مانتا ہے۔ پھر یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ آگسٹائن اس عقیدے کے سلسلے میں کیتھولک مذہب کا حوالہ دیتا ہے، جناب مسیحؑ کا یا ان کے حواریوں میں سے کسی کا یا کسی مقدس کتاب اور صحیفے کا حوالہ نہیں دیتا۔ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ من گھڑت اور بعد کی ایجاد ہے، مسیحؑ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

اس عقیدے میں جو باپ بیٹا اور روح القدس کے الفاظ بولے جاتے ہیں، ان میں سے باپ سے مراد خدا کی ذات ہے۔ بیٹے سے مراد خدا کی صفتِ کلام ہے جو یسوع مسیحؑ کے انسانی جسم میں حلول کر گئی تھی۔ اور وہ خدا کا بیٹا کہلاتا ہے۔ روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے

کی صفتِ حیات اور صفتِ محبت ہے۔ یعنی اس صفت کے ذریعے سے خدا کی ذات (باپ) اپنی صفتِ کلام (بیٹا) سے محبت کرتی ہے۔ صفتِ کلام کا ایک الگ جوہری وجود ہے اور صفتِ محبت کا بھی ایک مستقل جوہری وجود ہے۔ یہ تینوں مل کر خدا بنتا ہے۔ باپ بھی ازلی و ابدی، بیٹا بھی ازلی و ابدی اور روح القدس بھی ازلی و ابدی ہے مگر یہ تین ہوتے ہوئے بھی تین نہیں بلکہ ایک ہیں۔ مگر ایک ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تین نہیں، بلکہ یہ تین بھی ہیں۔

اس ناقابلِ فہم گورکھ دھندے نے کئی منطقی و فلسفی سوال پیدا کیے جن کے جواب کے لیے عیسائیوں میں شدید فرقہ بازی ہوئی اور ان کے تصفیے کے لیے کونسلیں منعقد ہوتی رہیں جن کا ذکر انشاء اللہ فرقوں کے بیان میں آئے گا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ "یسوع مسیح" میں چارلس اینڈرسن سکاٹ نے لکھا ہے کہ: "پہلی تینوں انجیلوں ـــــ متی، مرقس، لوقا ـــــ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے" "یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، اناجیل کی متعدد عبارتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ "مجھے آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پہ چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلیم سے باہر ہلاک ہو" (لوقا) اور اکثر اپنا ذکر ابنِ آدم کے نام سے کرتا ہے۔ یسوع کہیں اپنے آپ کو "ابن اللہ" نہیں کہتا"

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ مسیحیت میں جارج ولیم ناکس عقیدۂ تثلیث کے متعلق لکھتا ہے کہ: "عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لئے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے جس میں مذہبی خیالات تو بائبل کے ہیں۔ اور وہ ڈھلے ہوئے ہیں ایک اجنبی فلسفے کی صورت میں۔ باپ بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پس اس عقیدے کا مواد یہودی ہے اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا۔"

اوپر کے اقتباس میں عقیدۂ تثلیث کی بنیاد یونانی فکر کو قرار دیا گیا ہے۔ تاریخ، مذاہب پر گہری نظر ڈالنے والے جانتے ہیں کہ دنیا کی اکثر مشرک قوموں میں تثلیث کا عقیدہ کسی نہ کسی رنگ میں ضرور کارفرما رہا ہے۔ قدیم مصریوں میں اس کے ارکان یہ ہوتے تھے۔

سینٹ ہورس اور شنو۔ پہلا خشک سالی کا دیوتا دوسرا برسات کا اور تیسرا ہواؤں کا۔
اہل بابل کے ہاں آسمان کا دیوتا انو، ہندوستان میں برہمی، یونان میں زیوس اور رومیوں میں جوپیٹر تھا۔
" " " " پانی کا دیوتا ایا " " وشنو " " پوزیڈان " " نپچون
" " " " زمین کا دیوتا بیل " " مہیش اشور " " ہیڈس " " پلوٹو

عیسٰی علیہ السلام کے متعلق عیسائی عقیدہ

جس طرح خدا کے متعلق عیسائی عقیدۂ تثلیث میں تضاد اور الجھاؤ ہے۔ اسی طرح جناب مسیح ؑ کے متعلق عقیدۂ ابنیت والوہیت میں بھی صریح تناقض اور شدید الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ چار اجزاء کا مجموعہ ہے:

ا۔ حلول و تجسّم
ب۔ مسیح کی مصلوبیت
ج۔ مسیح کی حیات ثانیہ
د۔ کفّارے کا عقیدہ

بات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک ان چاروں اجزاء پر گفتگو نہ کی جائے۔ ہم ترتیب وار ان پر اختصار کے ساتھ کلام کرتے ہیں:

ا۔ حلول اور تجسّم کا عقیدہ

حلول کا لفظی معنیٰ گھس جانا ہے۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خدائی صفات کو ترک کئے بغیر انسان کے وجود میں ظاہر ہو گیا۔ اور تجسّم کا لفظی معنیٰ ہے جسم اختیار کرنا۔ یعنی خدا کی صفت کلام (بالفاظ دیگر بیٹا) مجسّم ہو کر عیسیٰ کے روپ میں آگیا۔ بالکل اسی قسم کا تخیل ہندوؤں میں بھی ہے کہ وہ رام چندر، کرشن جی اور پھر بعد میں مہاتما بدھ کو بھی خدا کا اوتار مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں وشنو دیوتا ان تینوں کی صورت میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا رہا۔ گو روپ تو رام، کرشن اور بدھ کا تھا مگر دراصل ان کے اندر وشنو یا بھگوان تھا جو ان کے رگ و پے میں جاری و ساری تھا۔

یوحنا کی انجیل کی ابتدائی آیات میں کلام کا ازلی و ابدی ہونا، خدا کے ساتھ ہونا، خود خدا ہونا، پھر کلام کا مجسّم ہونا اور خدا کے اکلوتے بیٹے کا جلال بن کر انسانوں میں رہنا مذکور ہے۔ مارس ایلٹن نے اس عقیدے کی شرح میں لکھا ہے کہ: "کیتھولک عقیدے کا کہنا یہ ہے کہ وہ ذات جو خدا تھی، خدائی کی صفات کو چھوڑے بغیر انسان بن گئی۔

یعنی اُس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کرلیں جو زمان و مکان کی قیود میں مقید ہے اور ایک عرصے تک ہمارے درمیان مقیم رہی،، (مطالعۂ عقائد عیسائیت)

انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مقالہ عیسائیت میں مسٹر الفریڈ ای گارو اس عقیدے کی مزید شرح یوں کرتے ہیں کہ: "حضرت مسیحؑ حقیقۃً خدا بھی تھے اور انسان بھی، اُن کی ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار سے ہی مختلف بدعتی نظریات پیدا ہوئے...... لہٰذا پہلی مسیحی کونسل کے منظور شدہ فارمولے کی رُو سے مسیحؑ کی ایک شخصیت میں دو ماہیتیں (خدائی اور انسانیت) جمع ہو گئی تھیں"

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ "تاریخ کلیسا" میں ہے کہ: "تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیحؑ کو عام طور پر کلام کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا مگر بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیحؑ کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ ۳۲۰ء میں اس مسئلہ پر شدید بحث و مناظرہ برپا تھا جس سے کلیسا کی بنیاد ہل گئی۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل نے الوہیت مسیحؑ کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ گو اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا مگر آخری فتح نیقیا کے فیصلے کو ہوئی جسے مشرق و مغرب میں اس حیثیت سے مان لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیئے۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اُسے بپتسمہ کے الفاظ میں اور دوسرے رائج الوقت رسوم میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیا میں مسیحؑ کا جو تصوّر قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدۂ تثلیث اصل مذہب مسیحی کا ایک لازمی اور ضروری حصّہ قرار پا گیا۔"

اس اقتباس سے واضح ہے کہ تثلیث و تجسّم اور الوہیت مسیحؑ کا عقیدہ جناب مسیحؑ یا ان کے حواریوں کا نہیں تھا بلکہ ان کے سینکڑوں برس بعد ایجاد ہوا تھا۔ عیسائیوں میں پھر بھی اختلاف باقی رہا اور کئی نئے نئے مسائل اس جدید اختراع سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب بڑا سوال یہ سامنے آیا کہ مسیحؑ کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ آخر ۴۵۱ء میں کالیڈن کونسل نے اس کا فیصلہ یہ کیا کہ مسیحؑ کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں جمع تھیں، ایک الٰہی طبیعت اور دوسری انسانی طبیعت، اور یہ دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیتیں قائم رکھتی تھیں ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا۔ پھر

ایک اور اُلجھن آ پڑی کہ یہ دونوں طبیعتیں جو مسیحؑ کی ذات میں جمع تھیں آیا ان کی مشیت و ارادہ ایک تھا یا الگ الگ؟ ۶۸۰ء میں قسطنطنیہ کے مقام پر تیسری کونسل قائم ہوئی جس نے پہلے طے شدہ فیصلے پر اتنا اضافہ اور کر دیا کہ "یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں رکھتی ہیں، یعنی مسیحؑ بیک وقت دو مختلف مشیتوں کا مجموعہ ہے۔

حلول و تجسّم، الوہیتِ مسیحؑ اور مسیحؑ کی شخصیت میں بیک وقت دو جداگانہ مشیتوں کا پایا جانا، یہ سب فلسفیانہ خیالات تھے جو یونانی فلسفے سے لئے گئے تھے۔ ان مسائل کی تفصیلات بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مسیحؑ خدا سے کم رتبہ تھے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ "باپ مجھ سے بڑا ہے" (انجیل یوحنا ۱۴) اور اسی حیثیت سے ان میں تمام انسانی عوارض و کیفیات پائی جاتی تھیں، لیکن خدائی حیثیت سے وہ باپ (خدا) کے ہم رتبہ تھے جیسا کہ انجیل یوحنا میں یہ بھی لکھا ہے کہ "میں اور باپ ایک ہیں" (یوحنا ۱۰) آگسٹائن نے حسبِ عادت اس کی فلسفیانہ تشریح یوں کی کہ: "خدائی حیثیت سے مسیحؑ نے انسان کو پیدا کیا اور انسانی حیثیت سے وہ خود پیدا کیا گیا" (آگسٹائن ص ۱۱۴)، یسوع مسیحؑ اپنی خدائی شکل میں خود اپنے آپ سے افضل ہے اور انسانی حیثیت میں خود اپنے آپ سے کم تر بھی" (آگسٹائن حوالہ سابقہ)

یہ مسئلہ بڑا نازک اور لاینحل قسم کا تھا کہ مسیح خدا بھی ہے اور انسان بھی، خالق بھی ہے اور مخلوق بھی، اپنی ایک حیثیت میں اپنے آپ سے بڑھیا ہے اور دوسری حیثیت میں گھٹیا، عیسائیوں میں صدیوں اختلاف و شقاق اور فرقہ بازی کا باعث بنا رہا۔ اس اُلجھن کو سلجھانے کے لئے کئی کونسلیں برپا ہوئیں مگر ہر کونسل کا نتیجہ مزید اختلاف کی شکل میں نکلا۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب لاجواب "الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح" میں اس مسئلے پر شافی بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "مسیحؑ کی طبیعت کے باب میں عیسائیوں کا کلام پراگندہ، مختلف اور متناقض ہے۔ اس بارے میں ان کا کوئی متفق علیہ قول نہیں، نہ کوئی معقول قول ہے اور نہ ایسا قول جس پر کوئی کتاب دلالت کرتی ہو۔ اس باب میں ان کے کئی فرقے اور گروہ ہیں جو سب ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں جیسے یعقوبیہ، ملکانیہ اور نسطوریہ۔ ان لوگوں کے اقوال اس مسئلے میں پراگندہ ہیں اور ان میں شدید اختلاف ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ دس عیسائی کسی مسئلے کے تصفیے کے لئے جمع ہوں تو ان میں گیارہ فرقے بن جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ تثلیث و اتحاد کا عقیدہ جو ان کی امانت — کیتھولک عیسائیوں کا

تثلیث پر متفقہ فارمولا ـــ میں پایا جاتا ہے وہ نبیوں کی طرف منسوب کتابوں میں یا مسیحؑ اور ان کے حواریوں کے کلام میں یا دوسرے انبیاء کے کلام میں بالکل موجود نہیں۔ ان کی کتابوں میں کچھ متشابہ الفاظ ہیں اور کچھ محکم، ان کے معانی کو سمجھنے میں ان کا اختلاف ہے۔ پھر جو لوگ اس ملے شدہ عقیدے کے قائل ہوئے ـــ جیسا کہ جمہور عیسائیوں کا دعویٰ ہے ـــ وہ بھی اس کی تفسیر میں اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے اس عقیدے میں بھی تناقض پایا جاتا ہے جس کا تصور کسی صحیح طریقہ پر ممکن ہی نہیں۔" (الجواب الصحیح ص۲۱)

ب۔ مسیحؑ کے سُولی پر مرنے کا عقیدہ

اس عقیدے کے بیان سے قبل اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ قرآن مجید کی مانند برنباس حواری کی انجیل میں بھی مسیحؑ کی مصلوبیت کا واضح رد موجود ہے۔ قرآن نے یہ کہہ کر کہ

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ

اصل صورت حال کا بیان کر دیا ہے، کہ یہود نے نہ تو عیسیٰؑ کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا بلکہ اُن کے لئے ایک تشبیہ بنا دی گئی۔ یہ تشبیہ کیا تھی؟ اس راز سے پردہ برنباس حواری نے اٹھایا کہ گرفتار کرانے کی خاطر جاسوسی کرنے والا حواری یہودا اسکریوطی مسیحؑ کی شکل و صورت میں تبدیل ہو گیا۔ عیسیٰؑ تو اٹھا لئے گئے مگر یہودیوں نے اس تشبیہ کو عیسیٰ سمجھ کر سولی پر لٹکا دیا اور بزعم خویش خوش ہو گئے کہ ہم نے ایک کذاب کو (معاذ اللہ منہ) لعنتی موت مار کر اس کی اصل حقیقت ظاہر کر دی ہے۔ عیسائیوں نے عیسیٰؑ کی مصلوبیت کو تسلیم کر لیا مگر اسے آدمؑ کے موروثی گناہ کا کفارہ ٹھہرا کر ابن اللہ کی عظیم قربانی قرار دیا اور اسی پر اپنے جدید مذہب کی بنیاد رکھ دی۔ عیسائی عقیدے کے مطابق یہ سُولی اُس اقنوم ابن کو نہیں دی گئی جو ان کے نزدیک خدا ہے بلکہ اس اقنوم ابن کے انسانی مظہر عیسیٰؑ کو دی گئی جو انسانی حیثیت میں خدا نہیں تھا بلکہ مخلوق تھا۔ اس عقیدے میں وہی فلسفیانہ تناقض و تضاد موجود ہے جو عقیدہٴ تثلیث کی جان ہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے ابتدائی دوسرے عشرے میں شاہ روم قسطنطین کے کسی وہم یا خواب کی بناء پر اور اس کی والدہ، سینٹ ہیلینا کے کہیں سے ایک صلیب دستیاب ہو جانے کی بناء پر آئندہ کے لئے صلیب کو عیسائیت کا شعار قرار دے دیا گیا اور صلیب کو اس بناء پر مقدس ٹھہرا لیا گیا کہ اس پر مر کر ابن اللہ نے ہمیں اولادِ آدمؑ کے موروثی گناہ کی سزا سے بچا لیا ہے اور ابن اللہ کی موت ہمارا کفارہ ہو گئی ہے۔

ج۔ مسیحؑ کی دوسری زندگی کا عقیدہ

عیسائیوں کے عقیدے میں مسیحؑ کو صلیب پر مار کر دفن کر دیا گیا تھا مگر تیسرے دن وہ دوبارہ جی اٹھے اور حواریوں سے کچھ باتیں کر کے آسمان پر چلے گئے تھے۔ اس سلسلے میں ہماری گزارش فقط یہ ہے کہ جب عیسیٰؑ کو سولی دی ہی نہیں گئی تو یہ سارا افسانہ بے بنیاد ہے۔ یہودا اسکریوتی کی لاش کو یوسف نامی ایک شخص نے غائب کر دیا تھا۔ انجیل کے بیان کے مطابق یہی وہ شخص تھا جس نے حکومت کی اجازت سے عیسیٰؑ (دراصل یہودا) کے کفن دفن کا انتظام کیا تھا۔ عیسائیوں کی چار معتبر انجیلوں کے ساتھ اگر برنباس حواری کی انجیل کا بھی یہ مقام غور سے پڑھا جائے تو اصل بات کا سمجھ لینا مشکل نہیں رہتا۔ موجودہ عیسائیت کی عمارت اسی عقیدہ کفارہ پر استوار ہے۔ پولوس نے یہی پروپگنڈا کر کے شریعت پر عمل کرنے والے کو لعنتی قرار دیا تھا اور عیسائی دنیا کے لئے اباحیت کا دروازہ چوپٹ کھول دیا تھا۔ کفارے کا عقیدہ عقل و فکر، عدل و انصاف اور رحمت و مغفرت کے خدائی اصول کے قطعی خلاف ہے۔ اس سے بے راہ روی اور لامذہبیت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ عیسائی دنیا نے اپنی تاریخ میں جس قدر مظالم کئے ہیں، کمزوروں اور ناتوانوں کو جس طرح ستایا ہے، اختلافِ رائے کی بنیاد پر مخالفین سے جو ظالمانہ سلوک کئے ہیں، صلیبی جنگوں میں اہل اسلام کے خلاف جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا ہے، دنیا بھر کو اپنی استعمار کا نشانہ بنانے کی خاطر جتنے کھیل کھیلے ہیں وہ تاریخ کے ناقابلِ تردید حقائق ہیں۔ ان کی تہ میں کافی حد تک یہ کفارے کا عقیدہ بھی کارفرما رہا ہے۔

د۔ کفارے کا عقیدہ

یہ عقیدہ موجودہ عیسائی مذہب کی جان ہے۔ مسیحؑ کے بارے میں اوپر بیان شدہ سارے عقیدے دراصل اسی عقیدے کی تمہید ہیں۔ اس عقیدے کی تشریح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں "عقیدۂ کفارہ" کے ضمن میں یوں آئی ہے: "عیسائی علم عقائد میں کفارہ سے مراد یسوع مسیحؑ کی وہ قربانی ہے جس کے ذریعہ سے ایک گناہگار انسان یک لخت خدا کی رحمت کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس عقیدے کی پشت پر دو مفروضے کارفرما ہیں۔ ایک تو یہ کہ آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے انسان خدا کی رحمت سے دُور ہوگیا تھا۔ دوسرے یہ کہ خدا کی صفتِ کلام (بیٹا) اس لئے انسانی جسم میں آئی تھی کہ وہ انسان کو دوبارہ خدا کی رحمت سے قریب کر دے۔" اس مقالے کے کاتب نے جن دو مفروضوں پر اس عقیدۂ کفارہ کی بنیاد رکھی ہے وہ دونوں سرے سے غلط اور ناپید ہیں۔ اوّل تو آدمؑ سے

کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ گناہ نام ہے احکامِ شرع کی خلاف ورزی کا، آدمؑ اُس وقت دنیا میں نہیں بلکہ عالمِ بالا میں تھے جہاں شریعت کا کوئی سوال نہ تھا۔ دوسرے اس لغزش کی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی تھی اور معافی مل بھی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ تصور ہی غلط ہے کہ معافی دینے کے بعد بھی اس نے اس "گناہ" کو باقی رکھا، نہ صرف یہ بلکہ آدمؑ کی نسل میں بلا وجہ و بلا قصور منتقل کر دیا۔ آدمؑ کے قصور میں اس کی اولاد کیسے ملوث ہو گئی؟ اگر خدا نے ایسا کیا تو وہ معاذ اللہ بڑا بے انصاف ہے۔ پھر "کرے کوئی اور بھرے کوئی" کے مصداق یہ ایک دوسری عظیم بے انصافی ہوئی کہ اس نے آدمؑ اور اُس کی نسل کے گناہ میں مروا اپنے اکلوتے کو دیا! نعوذ باللہ من ذالک۔

پھر یہ دونوں مفروضے محض "مفروضے" ہی ہیں جن کی کوئی جڑ بنیاد نہیں اور عقاید کو مفروضوں کی ریتیلی زمین پر استوار نہیں کیا جا سکتا۔ عیسائی دنیا کی یہ ایک فلسفیانہ قسم کی دھاندلی ہے کہ محض مفروضوں کو عقاید بنا لیا گیا ہے۔ کفارہ دراصل پولوس کے پیچیدہ یہودی ذہن کی پیداوار ہے۔ سے عقیدہ بنا کر اس نے مسیح علیہ السلام کے سارے کام پر پانی پھیر دیا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے نہ صرف بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء و رسل گناہ گار ٹھہرائے گئے ہیں بلکہ شریعت اتارنے، کتابیں نازل کرنے اور رسولوں کو ہادی بنا کر بھیجنے کا سلسلہ بھی فضول قرار پاتا ہے۔ جب عیسیٰ مسیح کی مصلوبیت تک کوئی انسان بھی پاک صاف اور بے گناہ نہ رہا تو رسالت و نبوت کا یہ سارا سلسلہ ہی معاذ اللہ فضول اور بے مقصد ٹھہرا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ سلسلہ قائم کر کے محض ایک ڈرامہ کیا تھا؟ اس بے بنیاد عقیدے کی رُو سے انسان پیدائشی گنہ گار ہے۔ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا ہر بچہ گناہ گار ہے۔ کیا یہی وہ خدا کا انصاف اور رحمت ہے جس کا نام لے کر یہ عقیدہ منوانے کی کوشش کی جاتی ہے؟ عیسائیت انسانی فطرت سے مایوس ہے۔ وہ خواہ مخواہ بلا سبب ہر انسان کو گناہ گار قرار دے کر انسانیت کی توہین کا ارتکاب کرتی ہے۔ ایک عیسائی فاضل جان کالون سے انسانیت کے خلاف فتویٰ سنیئے: "در حقیقت ہم نے آدمؑ سے صرف سزا وراثت میں نہیں پائی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم میں گناہ کا ایک وبائی مرض جاگزیں ہے جو آدمؑ سے ہم کو لگا ہے اور اس گناہ کی وجہ سے ہم پورے انصاف کے ساتھ سزا کے مستحق ہیں۔ اسی طرح شیر خوار بچے بھی اپنی ماں کے پیٹ سے سزا کا استحقاق لے کر آتے ہیں اور یہ سزا خود اُن کے نقص اور قصور کی ہوتی ہے کسی اور کے قصور کی نہیں۔"

ماشاء اللہ کیا فلسفۂ عدل و انصاف ہے اور "عظمتِ انسان" کا کیسا ملحد تصور ہے جو

ان سطور سے جھلک رہا ہے! ایک اور عیسائی بزرگ اکیو نیناس کا ارشاد ہے: "جو بچے بپتسمہ لینے سے پہلے مر گئے ان میں چونکہ "اصلی گناہ" برقرار ہے اس لئے وہ کبھی خداوند کی بادشاہت نہیں دیکھیں گے" مطلب یہ ہوا کہ عیسائیوں کی اولاد اگر بپتسمہ لینے سے قبل ہی اتفاقاً مر جائے تو وہ بھی جہنمی اور ہمیشہ کی سزا کی مستوجب ہے۔

کفارے کا عقیدہ چونکہ عقل وفکر اور فطرتِ انسانی کے خلاف ہے اور نتائج کے لحاظ سے خوفناک بھی، لہٰذا عیسائی دنیا کی اکثریت کے اس پر اصرار کے باوجود ہمیشہ اس کے خلاف کسی نہ کسی رنگ میں صدائے ردّ و احتجاج بلند ہوتی رہی ہے۔ لیکن اسے چھوڑنے کا نتیجہ پولوس کی تعمیر کردہ عیسائیت کی عظیم عمارت کا انہدام تھا لہٰذا مخالفانہ آوازیں ہمیشہ صدا بصحرا ثابت ہوتی رہیں آج بھی عیسائیت کے تمام بڑے فرقے اس عقیدے پر متفق ہیں۔

انسان کے پیدائشی گناہ گار ہونے کا عقیدہ جس پر کفارے کا عقیدہ قائم کیا گیا ہے، کسی آسمانی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ اب تو خود کیتھولک علماء بھی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ بائبل میں اس عقیدے کی کوئی بنیاد نہیں۔ ایک جرمن عیسائی ہربرٹ ہاگ نے "کیا پیدائشی گناہ مذہبی کتابوں میں موجود ہے" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ تیسری صدی تک یہ عقیدہ عیسائیوں میں موجود نہ تھا کہ انسان پیدائشی گناہ گار ہے۔

عیسائیت کا ارتقاء

عیسائیت کی ابتدائی تاریخ بڑی حد تک نامعلوم ہے جستہ جستہ حالات و واقعات ہی معلوم ہو سکتے ہیں جن کا منبع عہد نامۂ جدید کی کتابیں اور کچھ تاریخی مواد ہے۔ عیسیٰ علیہ اسلام کے رفع کے بعد حواریوں پر گھبراہٹ اور بے چارگی کا مسلط ہونا قدرتی امر تھا مگر انہوں نے ناموافق حالات میں اپنا تبلیغی کام جاری رکھا۔ اس وقت تک عیسائیت ایک الگ مذہب شمار نہ ہوتی تھی بلکہ اس کی حیثیت یہودیت میں ایک اصلاحی و اخلاقی تحریک کی تھی۔ عیسیٰؑ کی ہدائت کے مطابق غیر یہودیوں کو دعوت نہیں دی جاتی تھی اور یہود میں دعوت کی اشاعت کا کام بڑا سست تھا۔ پچھلے واقعات کی یاد ابھی ذہنوں میں تازہ تھی لہٰذا اس گھٹی گھٹی فضا میں کام بڑا مشکل سے چل رہا تھا۔

اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے حالات کا رُخ بدل دیا۔ یہ واقعہ ایک یہودی عالم ساؤل نامی کا یکایک نمودار ہو کر عیسائیت کو قبول کرنے کا اعلان تھا۔ یہ شخص پہلے عیسیٰ مسیحؑ اور حواریوں کا دشمن رہ چکا تھا۔ اس کی ملاقات عیسیٰ علیہ السلام سے تو نہیں ہوئی تھی مگر وہ ان کے پیروؤں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے میں پیش پیش تھا۔ کہا

جاتا ہے کہ وہ قبیلۂ بن یامین سے تعلق رکھتا تھا اور عقائد کے اعتبار سے شدید قسم کا فریسی یہودی تھا۔ وہ روم کے شہر ترسوس کا باشندہ تھا۔ عیسائیت پر باقاعدہ ایمان لانے سے پہلے وہ غور و فکر کرنے کی خاطر یروشلیم سے نکل کر سیدھا جنوبی دمشق چلا گیا۔ یہاں اُس نے تین سال گزارے۔ بعد ازاں وہ یکا یک ڈرامائی انداز میں یروشلیم پہنچا۔ اور اعلان کیا کہ دمشق کے راستے میں اس پر ایک نور چمکا اور آسمان سے عیسیٰ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس آواز نے اُسے ــــ بقول اُس کے ــــ عیسائیت پر ایمان لانے اور تبلیغ مذہب میں عیسیٰ علیہ السلام کی نمائندگی کرنے کا حکم دیا تھا۔ حواری اس کی پچھلی زندگی کے باعث اس سے ڈرتے تھے مگر برنباس کی سفارش پر سب خاموش ہو گئے اور اسے اپنی برادری کا رکن بنا لیا۔ اس نے اپنا نام بدل کر پولوس رکھ لیا اور حواریوں کے ساتھ مل کر مذہب عیسوی کی اشاعت کرنے لگا۔
حواریوں سے اس کی پہلی مخالفت اس وقت سامنے آئی جب اُس نے غیر یہودیوں کو بھی ــــ رومی، یونانی وغیرہ ــــ عیسائیت کا پیغام دینا اور انہیں داخلِ مذہب کرنا شروع کر دیا۔ اکثر حواری عیسیٰ کے پیغام کو یہودیوں کی اصلاح تک محدود جانتے تھے۔ اب ان کے دو حصے ہو گئے۔ برنباس ــــ حسب بیانِ لوقا ــــ پولوس کے ساتھ تھا اور یہ لوگ یروشلیم کے باہر انطاکیہ وغیرہ کے علاقوں میں جا نکلے۔ دوسرے خیال کے لوگ یروشلیم میں رہے۔ مگر اس وقت تک یونانیوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے باعث بہت سے غیر یہودی داخل عیسائیت ہو چکے تھے۔ غیر یہودیوں بالخصوص یونانیوں اور رومیوں کے لئے قابلِ قبول بنانے کی خاطر پولوس نے عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات میں تحریف کی۔ عقیدۂ تثلیث و حلول اور کفارہ یونانی فلسفہ زدہ دماغ کے لئے بہت دل پسند اور خوش آئند تھا۔ صرف نام بدلنے پڑے ورنہ بالکل وہی تہوار جو یونانی دیوتاؤں کیلئے منائے جاتے تھے اب عیسیٰؑ کے نام پر منائے جانے لگے۔ میلادِ مسیحؑ کی تاریخ اور مہینہ تک بدل دیا گیا۔ ۲۵ دسمبر دراصل یونانی مشرکوں کے ہاں سورج دیوتا کی عبادت کا دن تھا۔ اب اسے میلادِ مسیحؑ کی عید بنا دیا گیا حالانکہ عیسیٰؑ کی پیدائش موسم گرما میں ہوئی تھی جس کا ثبوت خود انجیل میں موجود ہے۔
مسیحؑ کے حواریوں نے جب پولوس کی کارروائیوں کو دیکھا تو پہلے تو اسے ان سے باز رکھنے کی کوشش کی، جب اس میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے کھل کر پولوس کی مخالفت کی۔ غالباً برنباس کی انجیل اسی غرض سے لکھی گئی کہ یہ حواری پولوس کے نئے ایجاد کردہ مذہب کو رد کر چکا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح تعلیم کے ساتھ ان کی زندگی کے صحیح آنکھوں دیکھے

اور کانوں سُنے حالات و واقعات قلمبند کرکے اصل دینِ مسیح کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ یونانی ذہن جو عیسائیت پر قبضہ کر چکا تھا وہ اس انجیل کو برداشت نہ کر سکا اور بلا دلیل و بلا سبب اسے رد کر دیا۔ یہ انجیل جب بھی کسی زبان --- انگریزی، عربی، اُردو وغیرہ --- میں چھپی اسے فوراً ناپید کر دیا گیا۔ اب یہ لاہور سے چھپ چکی ہے۔ اور بآسانی مل سکتی ہے، لوقا نے حواریوں کے اعمال کے نام سے جو رسالہ لکھا تھا وہ عہدِ جدید کی کتابوں میں شامل ہے۔

جب لوقا پولوس کے ساتھ حواریوں کے اختلاف کے موضوع تک پہنچتا ہے تو اس کے بعد حواریوں کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ عیسائی لٹریچر میں اس واقعہ کے بعد حواریوں کو پس پردہ کر دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ موجودہ عیسائیت کا بانی پولوس تھا۔ لوقا اس کا شاگرد ہونے کے باعث قصداً حواریوں کے احوال پر پردہ ڈال دینا چاہتا تھا۔ غرض اس کے بعد پولوس عیسائیت پر چھا گیا اور اُسی کا ایجاد کردہ مذہب عیسائیت کہلانے لگا۔ اس نے یونانیوں کی خاطر ختنہ کا حکم منسوخ کر دیا اور حلال و حرام کی تفریق مٹا ڈالی۔

چوتھی صدی عیسوی تک عیسائی مذہب کے ماننے والے اُبھر نہیں سکے، یہ زمانہ عیسائیت کی مغلوبیت و مظلومیت کا تھا جسے عیسائی "زمانہ تعذیب و ابتلاء" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۶۴ء میں مسیحیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی اور وہ یونان، روم، شام اور فلسطین میں پھیلے ہوئے تھے، نیرو نے ان پر رومی سلطنت کی مخالفت کا الزام لگا کر قید، تصلیب، زندہ جلانے، درندوں کے آگے ڈالنے اور روم کے کھیلوں کے اکھاڑوں میں بے پناہ مظالم کا نشانہ بنایا۔ ۷۰ء میں طیطس رومی نے یروشلم اور القدس کو برباد کیا۔ یہود کے ساتھ عیسائیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارا۔ ان کے بیوی بچوں کو غلام بنایا اور ایمفی تھیٹروں میں درندوں کے آگے ڈلوا دیا یا شمشیرِ بے زنہار کے سپرد کر دیا۔

نیرو کے بعد نصف درجن سے زائد رومی بادشاہوں نے عیسائیوں کے خلاف شدید قسم کے مظالم کی پالیسی جاری رکھی۔ ان کی مذہبی کتابیں جلوا دیں، عبادت گاہیں گروا دیں۔ انہیں گرجوں میں بند کرکے جلوا دیا اور ناقابلِ تصور ظلم و ستم ان پر روا رکھے۔ چوتھی صدی کی ابتداء تک یہی حال رہا۔ آخر کار جب قسطنطین اعظم نے عیسائیت قبول کی تو حالات نے پلٹا کھایا۔ اس بادشاہ نے عیسائیت کی تبلیغ کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی عبادت گاہیں بنوائیں۔ عیسائیوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے اور ان کے علماء کا بہت

زیادہ اعزاز واکرام کیا۔ اس نے مختلف عیسائی فرقوں کو متحد کرنے اور ان کے عقائد کا اختلاف مٹانے کی بھی سر توڑ کوشش کی۔ اسی کے عہدِ حکومت میں ۳۲۵ء میں نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی اور تثلیث کو عیسائیت کا بنیادی عقیدہ قرار دے کر سلطنت میں اسے بزور رائج کیا اور اس کے مخالف عیسائیوں، آریوس وغیرہ، کو مذہب سے خارج کر کے جلا وطن کر دیا۔ عقیدے کے بحث و مباحثے دو صدیوں تک جاری رہے مگر پہلا قدم اٹھانے والا یہی بادشاہ تھا۔

قسطنطین اعظم نے غیر عیسائی رعایا پر تبدیلِ مذہب کے لئے ظلم و تشدد بھی کیا۔ مشرکوں کی عبادت گاہیں گرادیں، بتوں کو تڑوا دیا، مندروں کے اوقاف چھین لئے اور بزورِ شمشیر عیسائیت کو پھیلانے کے بہت سے طریقے اختیار کئے۔ ایسے قوانین بھی وضع کئے گئے جن کی رُو سے حکام کو جبراً غیر عیسائی آبادی کا مذہب اور ثقافت مٹا دینے کے اختیارات حاصل ہوئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ میں حکومت کی طاقت آتے ہی عیسائیت نے مظلومیت کا چولا اُتار کر ظلم و تشدد اور ستمگاری کا رُوپ دھار لیا۔ شاید اپنی پچھلی مظلومیوں کا بدلہ وہ اب بے گناہ غیر عیسائی آبادی سے لینا چاہتی تھی۔ آخر کار بُت پرست رعایا جان بچانے کے لئے دھڑا دھڑ داخلِ عیسائیت ہونے لگی۔ چند ہی سال میں سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے تک عیسائیت کو فتح حاصل ہو چکی تھی۔ اور بت پرستی کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ یوں افریقہ اور فلسطین کے علاقوں کے علاوہ اُس یورپ میں بھی بزورِ شمشیر عیسائیت کو پھیلا دیا گیا جو آج بزورِ شمشیر پھیلائے جانے کا الزام عیسائیت کے گلے سے اتار کر جھوٹ موٹ اسلام کے سر تھوپنا چاہتا ہے۔

چوتھی صدی سے چھٹی صدی مسیحی تک عیسائیت کے فروغ و اشاعت کا زمانہ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی عیسائیت دو سلطنتوں میں بٹ گئی جو ایک دوسری کی رقیب و حریف بھی تھیں۔ پہلی مشرقی سلطنت جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ اور اس میں بلقان، یونان، ایشیائے کوچک، مصر اور حبشہ شامل تھے۔ یہاں کا سب سے بڑا مذہبی رہنما بطریک کہلاتا تھا۔ دوسری مغربی سلطنت تھی جو روم اور یورپ کے بیشتر علاقے پر مشتمل تھی۔ اور اس کا مرکز روم تھا۔ اس کا مذہبی پیشوا پوپ کہلاتا تھا۔ علاوہ ازیں اس دور میں عیسائیت میں رہبانیت پیدا ہوئی۔ اس کے لئے باقاعدہ ادارے اور خانقاہیں وجود میں آئیں۔ اس رہبانیت کی مثالیں ہمیں ہندو مذہب کے سادھوانہ نظام میں اور بدھ مذہب کے بھکشوانہ اداروں میں بخوبی دکھائی دے سکتی ہیں۔ رہبانیت کی تعلیم غیر

فطری ہے۔ راہب اپنی دنیوی ضروریات میں سوسائٹی پہ بوجھ بنتے ہیں، دوسروں کی کمائی پہ پلتے ہیں۔ سماج کی اجتماعی فلاح و بہبود میں حصہ لینے کے بجائے اُلٹا اس کے کندھوں پہ پیرِ تسمہ پا بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مسیحؑ کی تعلیم — اگر وہ وہی ہے جو انجیلوں میں لکھی ہے! مادہ پرستی اور خود غرضی کے خلاف ایک چوٹ تھی۔ بعد میں اس کو غلط معنے پہنا کر اور ترکِ دنیا کو رضائے الٰہی کا ذریعہ جان کر ایک باقاعدہ مذہبی ادارہ بنا ڈالا گیا۔ دنیا کی فلاح و صلاح پر اس کے بے شمار مضر اثرات پڑے ہیں۔ خدا کا صحیح دین جو دنیا کے رہنے والوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا گیا۔ دنیوی معاملات سے بے تعلق نہیں ہوسکتا۔ وہ خدا پرستی دراصل نفس پرستی اور خود غرضی ہے جو ایک انسان کو صرف اس کی ذات کی فلاح کا راستہ تو دکھائے مگر دوسروں کے حقوق و فرائض سے بیگانہ کر دے۔ اسی لئے حضورؐ کا ارشاد ہے لَا رُهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ "اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں"

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر نویں صدی کے اوائل تک کا زمانہ عیسائیوں کے ہاں قرونِ مظلمہ — تاریک دَور کہلاتا ہے۔ اس اصطلاح میں ایک طرف تو اسلام کے خلاف عداوت و تعصب کار فرما ہے اور دوسری طرف عیسائیوں کے اس سیاسی اور علمی و عملی انحطاط کا اظہار ہے جس میں اس وقت عیسائی دنیا گرفتار تھی۔ پہلی چیز کا سبب اسلام کا ظہور اور اس کا بے نظیر عروج تھا۔ اور دوسری کا باعث فرقہ بندی اور انتشار۔ اسلامی اقتدار کا علم دو مشرقی ممالک یعنی شامؔ و عراقؔ اور فارسؔ میں لہرا رہا تھا۔ اور اس دینِ حق کی روشنی مغربی ممالک یعنی مصر، افریقہ، اندلس اور سسلی میں بھی پھیل چکی تھی۔ مسلمان تازہ دم تھے۔ اور عیسائی دنیا کے جسم و جان پہ تھکن اور ماندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ پے در پے علمی و سیاسی اور معاشرتی شکستوں نے انہیں خستہ حال اور مایوس بنا رکھا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی عیسائی رومؔ کی مذہبی و سیاسی فتوحات کا عَلَم لہراتے ہوئے برطانیہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ پہ چھا گئے اور یورپ نے عیسائیت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ یورپی ممالک میں عیسائی مذہب کے علاوہ رومؔ و یونان کے علومِ طبیعیہ، فلسفہ، منطق اور ہندسہ و ریاضی بھی داخل ہوئے۔ غالباً اسی لئے عیسائی آج اسلام اور مسلمانوں کا نام درمیان سے حذف کر کے اپنی تہذیب و ثقافت کا رشتہ براہِ راست رومؔ و یونان سے ملاتے ہیں۔ یہ ایک الگ علمی بحث ہے جس پہ گفتگو کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے واسطے کو ازراہِ تعصب حذف کرنا ممکن نہیں۔ یورپ کو ریاضی کی بعض خالص "اسلامی" شاخیں مثلاً الجبرا، ، علمِ ہیئت و نجوم، علمِ طب، تاریخ و جغرافیہ بالخصوص فلسفۂ تاریخ کا فن مسلمان

سے ملا۔ آج بھی یورپ کے کتب خانے عربوں کی کتابوں سے پُر ہیں مسلمان مصنفین کی کتابیں صدیوں تک یورپ کی درس گاہوں میں داخلِ نصاب رہ چکی ہیں۔ بین الاقوامی اور بین الممالک کا قانون خالصاً مسلمانوں کا علم ہے۔ جو انہی سے یورپ کو ملا۔

آٹھویں صدی کے شروع سے لے کر سولہویں صدی عیسوی کے وسط تک کا دَور عیسائی تاریخ میں قرونِ وسطی ——— درمیانی ادوار ——— کہلاتا ہے۔ اس دَور میں یورپ خانہ جنگی کی لپیٹ میں آگیا۔ ایک طرف پوپ کا اقتدار تھا تو دوسری طرف شاہانِ وقت کی سلطنت۔ نشیب و فراز میں سے گزر کر یہ زمانہ پوپ کی شکست اور شہنشاہیت کی فتح پر منتج ہوا۔ اس زمانے میں عیسائیوں نے وحشت و بربریت کا وہ مظاہرہ کیا کہ عیسیٰ مسیح کی تعلیم شرم کے مارے منہ ڈھانپ کر پردہ نشین ہوگئی۔ پوپ کی قائم کردہ مذہبی عدالتیں INQUISITION صرف غیر عیسائیوں پر ہی ظلم و ستم کی مرتکب نہ ہوئیں بلکہ "کفر و الحاد" کے بہانے سے انہوں نے خود عیسائیوں پر بھی ناقابلِ تصور مظالم کئے۔ سزاؤں میں زندہ جلا ڈالنا، زبان کاٹ دینا، مُردوں کی قبریں اکھاڑ کر ہڈیوں کو چور چور کر دینا بھی شامل تھا۔ ان عدالتوں نے لاکھوں انسانوں کو قتل کیا۔ پوپ کے خود ساختہ مذہبی اقتدار اور غیر محدود قانون سازی کے اختیار کو جس کسی نے دبی زبان سے بھی چیلنج کیا اس پر بے پناہ مظالم توڑے گئے۔ مذہبی ٹیکس لگانا، بے شمار نذریں نیازیں وصول کرنا اور نجات کے پروانے فروخت کرنا، مذہبی اختیارات کو ذاتی منافع کے لئے استعمال کرنا، یہ وہ چیزیں تھیں جن کے خلاف اصلاح کی تحریکیں اٹھیں اور انہیں بڑی بے رحمی اور تشدّد سے دبا دیا گیا۔

اسی دور میں مشرقی کلیسا ہمیشہ کے لئے پوپ ——— رومن کیتھولک چرچ کا مقدّس رہنما ——— کی غلامی کے بندھن سے آزاد ہوکر مقدّس آرتھوڈکس چرچ کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اس کا سبب ایک تو نظریاتی اختلاف تھا۔ جو مسئلہ تثلیث کی تفاصیل میں واقع ہوا۔ آرتھوڈکس چرچ کا عقیدہ یہ تھا کہ روح القدس کا اقنوم صرف باپ کے اقنوم سے بیٹے اقنوم کے واسطے سے نکلا تھا۔ اس کے برخلاف کیتھولک چرچ کے نزدیک روح القدس کا اقنوم باپ اور بیٹے دونوں سے نکلا تھا۔ آرتھوڈکس چرچ کے نزدیک باپ کا رُتبہ اقنوم ابن سے بڑا تھا۔ مگر کیتھولک چرچ کے نزدیک وہ دونوں برابر ہیں۔ اختلاف کا دوسرا سبب نسلی امتیاز تھا۔ کیتھولک چرچ میں اطالوی اور جرمن نسل تھی جب کہ آرتھوڈکس میں یونانی اور ایشیائی نسل۔ تیسرا سبب سلطنتِ روما کی تقسیم تھی۔ جو مذہب اور عقیدے پہ

بھی اثر انداز ہوئی۔ اب قسطنطنیہ کا شہر روم کا مدمقابل بن چکا تھا۔ پوپ نے بطریق کے اقتدار کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ آپس میں لعنت بازی اور سبّ وشتم کی صورت میں نکلا۔
اسی دَور میں مشہور ومعروف صلیبی جنگیں برپا ہوئیں۔ ان جنگوں کو پوپ نے مقدس مذہبی جنگ کا نام دیا۔ اور ان میں حصّہ لینے والوں کو ہر قسم کی بدعنوانی اور بدمعاشی کی کھلی چھٹی دیتے ہوئے بخشش اور جنت کا پروانہ دے دیا۔ ان جنگوں کا زمانہ طویل تھا۔ پوری عیسائی دنیا ایک طرف اور پہلے سلجوقی اور پھر ایوبی ترک دوسری طرف مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ زمانہ عباسی سلطنت کی کمزوری کا تھا۔ اس لئے نام نہاد خلفاء نے ان جنگوں میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ آخری جنگوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھا کر یورپ نے قدم پیچھے ہٹا لیا۔ اور یہ تاریخی جنگیں ہمیشہ کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان نفرت وعداوت کا گہرا نشان چھوڑ کر ختم ہو گئیں۔ عیسائیوں نے ان کی یاد کبھی نہیں بھلائی۔ حتیٰ کہ زمانہ حال میں اسرائیل کا قیام اور اُس کی سرپرستی بھی اسی جذبۂ انتقام کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں عیسائی دنیا میں مذہبی اصلاح کی کئی آوازیں اور کئی تحریکیں اٹھیں۔ مصلحین کے پیش نظر زیادہ تر پاپائی نظام کی اصلاح تھی تاکہ ان بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو سکے جو اس ادارے میں راہ پا چکی تھیں۔ چودھویں صدی کے آواخر میں وائی کلف نامی ایک مصلح نے کلیسا کی بدعنوانیوں کے خلاف احتجاج کیا اور پاپاؤں کے باضابطہ انتخاب پر زور دیا۔ اس نے بائبل کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ پاپاؤں نے کتابِ مقدس کے ترجمے پر پابندی لگا کر اسے جرم قرار دے رکھا تھا۔ اس کے بعد جان ہس اور جیروم نے اصلاحی آوازیں بلند کیں مگر بیچارے دونوں زندہ جلا دیئے گئے۔ پاپائیت کے طاقتور بھوت کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

اس دوران میں عیسائیوں کی کئی کونسلیں بھی بلائی گئیں۔ ۱۴۰۹ء میں پیسا کے مقام پر کونسل کا اجلاس ہوا جس میں ۸۰ بشپ شامل ہوئے۔ اس کونسل نے عیسائی دنیا کو ایک پوپ پر متفق کرنے کی کوشش کی۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے پاپائیت دو حصّوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک حصّہ فرانس اور سپین وغیرہ پر اور دوسرا اٹلی، انگلینڈ اور جرمنی پر مشتمل تھا۔ کونسل نے دونوں پوپ معزول کئے اور الیگزینڈر کو پانچواں پوپ نامزد کر دیا جو فوراً موت کا شکار ہو گیا۔ پھر ایک مشہور بحری ڈاکو جان ۲۳ کو پوپ بنایا گیا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اب دو کے بجائے تین پوپ مقرر ہونے لگے۔ ۱۴۱۵ء میں کانسٹنس میں پھر

کونسل بلائی گئی جو ایک ہی پوپ مقرر کرنے اور پاپائیت کے افتراق کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اصلاحِ کلیسا کی تحریک کا سیلاب رُک نہ سکا تو ۱۴۳۱ء میں باسل کی کونسل منعقد ہوئی جس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

آخر کار سولہویں صدی کے اواخر میں مارٹن لوتھر اٹھا جس نے پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد رکھ کر پوپ کے عالم گیر اقتدار کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس نے بخشش ناموں کی تجارت اور کیتھولک چرچ کی ایجاد کردہ تمام رسوم کو فضول اور من گھڑت بتا کر ختم کر دیا۔ اس فرقہ میں بپتسمہ اور عشائے ربانی کے سوا کوئی رسم ادا نہیں کی جاتی۔ لوتھر کی آواز کو زونگلی اور جان کالون نے آگے بڑھایا اور آخر کار فرانس، جرمنی، انگلستان وغیرہ میں کیتھولک کے مقابلے میں ہمیشہ کے لئے پروٹسٹنٹ چرچ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ آج کی عیسائی دنیا میں گو کیتھولک فرقہ کی تعداد زیادہ ہے۔ مگر پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈکس چرچ کی طاقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انگلینڈ اور دیگر کئی یورپی ملکوں کا سرکاری مذہب بھی پروٹسٹنٹ ہے۔

لوتھر کی تبدیلیاں

۱۔ عبادت مقامی زبان میں ہو۔
۲۔ عبادت میں وعظ لازم ہے۔
۳۔ گیت گانا لازم ہو گیا۔
۴۔ قربانی وغیرہ یا دعائیہ الفاظ ضروری نہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا

لوتھر نزم $\frac{447}{14}$

عیسائی مذہب میں اٹھنے والی ان اصلاحی تحریکوں نے یورپ میں عقلیت کو بیدار کیا اور وہ دور شروع ہوا جسے نشاۃِ ثانیہ RENAISSANCE کہا گیا ہے یہ سائنس، ٹکنیک اور علم و فن کی ہر شاخ میں یورپ کی ترقی و عروج کا زمانہ تھا۔ اہلِ مذہب کی تنگ دلی، خود غرضی اور شکم پرستی نے عوام کو مذہب سے متنفر کر دیا تھا۔ لہٰذا صرف پوپ اور مذہبی اجارہ داروں کے خلاف ہی آواز نہیں اٹھی بلکہ یہ نفرت ایک

سیلاب بن کر اُمڈی اور اہلِ مذہب کے ساتھ مذہب کو بھی بہالے گئی۔ اس میں عیسائیت کے ناقابلِ فہم اور خلافِ فطرت عقائد مثلاً تثلیث، حلول، تجسّم، عیسٰی مسیح کے سولی چڑھ کر اولادِ آدم کے موروثی گناہ معاف کرا دینے کا بھی کافی حد تک دخل تھا۔ اس دور میں مذہب کی ہر چیز، کتاب مقدس اور رسوم عبادت وغیرہ ہر چیز پر ہاتھ صاف کیا گیا اور ان کا کھلا مذاق اڑایا گیا۔ لوگوں نے تحقیق، علم، آزادی رائے اور فلسفہ و سائنس کے نام پر وہ کچھ کیا جس کے نتیجے میں کمیونزم کی لا مذہبیت کا خطرناک بھوت نمودار ہوا۔ خدا پر تنقید کی گئی اور اس کے وجود کا انکار کرکے مذہب کا مضحکہ اڑایا گیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر یورپ کے سمجھ دار اور اعتدال پسند طبقوں نے مذہب کو بچانے کی خاطر "تجدد" یا "جدیدیت" کی تحریک اٹھائی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں تاکہ وہ سائنسی ایجادات اور نت نئے انکشافات کا ساتھ دینے کے قابل ہو سکے۔ اس کا بڑا باعث ہمارے خیال میں یہ تھا کہ عیسائیت یورپ میں عیسائی قوموں کے شیرازے کو باندھے رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اسے اگر ہاتھ سے دے دیا جائے تو معاشرتی، تمدنی، قومی اور سیاسی بنیادیں ہل جائیں گی۔ پس ضروری ہوا کہ کسی نہ کسی شکل میں اس مرکزی طاقت کو قائم رکھا جائے۔ یہی عیسائیت دنیا کے دوسرے ممالک میں دخل اندازی کرنے اور انہیں غلام بنانے یا دیر تک بنائے رکھنے کا ایک مؤثر ہتھیار بھی تھی۔ یہ اگر جاتی رہے تو تہذیبِ مغرب کا وجود ہی خطرے میں پڑتا ہے۔ فرانس کا مشہور فلسفی روسو اور پروفیسر ہارنیک اس طبقے کے سرکردہ تھے۔

عقلیت پسندی کی تحریک کے مقابلے میں عیسائیت کے احیاء کی ایک تحریک بھی اٹھی جس کے پیشِ نظر خالص رومن کیتھولک مذہب کو اس کی اصلی اور ابتدائی شکل و صورت میں زندہ کرنا تھا۔ یہ انیسویں صدی کی مشہور تحریک ہے۔ مادیت جلد ہی اپنے برگ و بار لے آئی تھی۔ اور اس کے تناور درخت نے انسان پر اپنے کڑوے پھل گرانے شروع کر دیئے تھے۔ لوگ اب اس سے بھی گھبرا اٹھے تھے۔ لہٰذا اس تحریک کو بھی پنپنے کا موقع مل گیا۔ اس وقت یہ تحریک عقلیت اور "تجدد" کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ متوازی لائنوں پر محوِ سفر ہے۔ یہ تینوں تحریکیں برسرِ عمل اور معروفِ جنگ و جدل ہیں۔ مگر اسلام کے خلاف نفرت جو پھیلا دی گئی ہے وہ عیسائیوں کو اس کی طرف متوجہ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔

عیسائیت کا لٹریچر عیسائی لٹریچر سے ہماری مراد عام مذہبی کتابیں نہیں بلکہ وہ مقدس یا الہامی کتابیں ہیں، جنہیں عیسائی دنیا میں "عہد نامہ جدید" کے

نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بائبل کا دوسرا حصہ ہے۔ اس حصے میں ۲۷ کتابیں شامل ہیں۔ (۱) چار انجیلیں، متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیل (2) اعمال، اس میں حواریوں کے کارنامے کم اور پولوس کے زیادہ تر درج ہیں، مصنف وہی لوقا ہے جو پولوس کا شاگرد اور ساتھی تھا۔ (3) پولوس کے ۱۴ خطوط مختلف لوگوں کے نام (4) پطرس حواری کے دو خط (5) یعقوب کا خط (6) یہودا کا خط (7) یوحنا کے تین خط (8) یوحنا کا مکاشفہ۔ یہ مجموعہ پانچویں صدی عیسوی کے بالکل اواخر میں اس وقت کے پوپ کی طرف سے مستند قرار دیا گیا تھا۔ ان کتابوں کے علاوہ کم وبیش ڈیڑھ صد کتابیں وہ ہیں جو کبھی مستند مانی جاتی تھیں۔ مگر اب انہیں مقدس کتابوں کی فہرست سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ اوپر کی ستائیس کتابوں پر بھی عیسائی محققین نے بڑی لے دے کی ہے۔ ان میں سے بعض اگر ایک کے نزدیک معتبر ہیں۔ تو دوسرے کے نزدیک غیر معتبر۔ بعض کتابوں میں ترمیم واضافے کا بھی ثبوت دیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں سے چونکہ چار انجیلوں کو عیسیٰؑ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان پر ذرا تفصیلی گفتگو مناسب ہے۔ باقی کتابیں الہامی نہیں، گو عیسائی لوگ انہیں بھی پولوس یا دوسرے لوگوں کا الہام کہیں نیز ان پر اس قدر اعتراضات وشکوک خود عیسائی مصنفین کی طرف سے وارد کیے گئے ہیں کہ ان کی کوئی مستند حیثیت باقی نہیں رہتی۔

اناجیل اربعہ

ان پر گفتگو سے قبل چند باتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱ِ۔ اناجیل کی حیثیت عیسیٰؑ کی سوانح عمری کی ہے۔ خدا کی نازل کردہ وحی کی نہیں۔ ان میں عیسیٰؑ کا نسب نامہ، بچپن، لڑکپن، جوانی اور بعثت اور پھر پیغمبرانہ کارنامے بیان کر کے آخر میں ان کی سولی، موت، دفن ہونے اور پھر قبر سے غائب ہونے تک کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ بَ۔ ان کے مصنف مجہول الحال اشخاص ہیں۔ اور زمانۂ تصنیف بھی اندازے سے متعین کیا جاتا ہے۔ جَ۔ یہ کتابیں عیسیٰؑ کی زبان — سُریانی یا آرامی — میں نہیں بلکہ یونانی میں لکھی گئیں اور پھر یونانی سے دوسری زبانوں میں ترجمے کئے گئے۔ — یہ اصل یونانی انجیل بھی نہیں بلکہ اس کا ترجمہ در ترجمہ ہے۔ دَ۔ عیسیٰؑ پر نازل شدہ ایک انجیل تھی۔ ان کے بعد بے شمار انجیلیں لکھی گئیں۔ جن میں سے چوتھی صدی کی نیقیہ کونسل نے ان چار کو منتخب کر لیا اور وہ بھی محض اٹکل اور قرعہ اندازی کے ساتھ۔ ھَ۔ ان چاروں انجیلوں میں بے شمار اختلافات اور تضاد موجود ہیں۔ جب کہ خدا کی کتاب میں تضاد نہیں ہو سکتا۔ عیسیٰؑ کے نسب نامے پہاڑی کے وعظ اور صلیب کے واقعات تک میں اختلاف موجود ہیں۔ وَ۔ ان انجیلوں میں ہمیشہ تحریف ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہو رہی ہے۔ ہر ایڈیشن میں کمی بیشی اور اصلاح کا

سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ز۔ برنباس حواری کی انجیل دلائل کے اعتبار سے ان سب سے معتبر ہے۔ مگر عیسائیوں نے اُسے بلا دلیل مسترد کر رکھا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس میں مسیحؑ کے صلیب پانے سے انکار اور حضور رسولِ آخر الزمان کا نام نامی کئی مرتبہ آیا ہے۔ ح۔ قرآن مجید نے جس انجیل کو خدا کا کلام فرمایا ہے یہ وہ انجیل نہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ خود عیسائی علماء و فضلاء کو بھی یہ حقیقت معلوم ہے۔ تعصب اور عداوتِ اسلام کے باعث اظہارِ حقیقت نہ کریں تو دوسری بات ہے۔ ط۔ خدا کی کتاب نہ ہونے میں اور بعد کی ایجادِ بندہ ہونے میں تورات اور زبور کا بھی یہی حال ہے۔ جن مسلمانوں نے اس کے خلاف کہا ہے لاعلمی کی بناء پر کہا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ عیسیٰؑ کی مشکوک و مترجم سوانح عمری تو خدا کی کتاب نہیں ہو سکتی اور خود عیسائی محققین نے چھان بین کے بعد یہی نتیجہ نکالا ہے جو بیان ہوا۔ ی۔ بعض دیسی مسیحی پادری جو بائبل یا انجیل کے غیر محرف ہونے اور محفوظ ہونے کا پروپیگنڈا کرتے ہیں، یا تو جہالت کی بناء پر کرتے ہیں یا حقِ ملازمت کی خاطر۔ ورنہ بے شمار دلائل قاہرہ اُن کے قول اور زعم کے خلاف خود ان کتابوں میں اور پڑھے لکھے عیسائیوں کی تصنیفات میں موجود ہیں۔ ک۔ تورات و زبور اور انجیل (موجودہ) کی حیثیت سند کے لحاظ سے ہماری حدیث کی صحیح کتابوں جیسی بھی نہیں۔ ان کی سند منقطع ہے۔ اُس میں مجهول الحال اشخاص کے نام آتے ہیں۔ ان کتابوں کی روایت کی حیثیت تیسرے چوتھے درجے کی کتب حدیث جیسی بھی نہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی سند و روائت ہماری تاریخ و سیرت کی کتابوں جیسی ہے۔ بلکہ اُن سے بھی کم تر۔ کیونکہ تاریخ و سیرت میں بھی اہلِ اسلام میں سندِ متصل کا رواج ہے۔ سند میں انقطاع ہو یا مجهول الحال یا غیر ثقہ راوی کا نام آ جائے تو ایسی روائت کا وہاں بھی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ تفصیل کے لیے مولانا رحمت اللہ کی اظہار الحق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی متعدد تصانیف کا مطالعہ مفید ہو گا۔

اب وقت آ گیا ہے کہ اناجیل اربعہ پر الگ الگ مختصر بات چیت کی جائے۔

۱۔ انجیل متی یہ پہلی انجیل ہے۔ عیسائی حضرات میں اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا یہ قدیم تر ہے یا مرقس کی انجیل۔ جن لوگوں نے اسے متی حواری کی طرف منسوب کیا ہے وہ اسے قدیم تر ٹھہراتے ہیں۔ اور اس بات کے قائل ہیں کہ یہ عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ مگر اس چیز کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ واقعی متی حواری کی تصنیف ہے۔ اس کے نویں باب میں متی حواری کا ذکر ایک غیر آدمی کی مانند آیا ہے، متی حواری یہ

نہیں لکھ سکتا تھا کہ: "یسوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نامی ایک شخص کو محصول کی چوکی پر دیکھا" (انجیل متی باب ۹) پس انجیل کا مصنف اور ہے اور متی حواری اور، جس کا ذکر ایک بیگانہ و نا آشنا شخص کی مانند وہ کرتا ہے۔ متی حواری نے جو کتاب لوجیا کے نام سے لکھی تھی وہ شاید عبرانی یا سریانی میں تھی۔ آج کل وہ بالکل مفقود ہے۔ موجودہ انجیل متی کا مصنف کوئی گمنام شخص ہے جس نے اس کتاب کی تصنیف میں لوجیا سے بھی فائدہ اٹھایا ہو گا۔ اس انجیل کی کل 1068 آیتیں ہیں۔ جن میں سے 470 مرقس کی انجیل سے لی گئی ہیں۔ پس ان مسیحی علماء کا خیال درست ہے جو مرقس کی انجیل کو قدیم تر بتاتے ہیں۔ یہ مرقس بھی نہ حواری ہے نہ اس نے مسیح کا زمانہ پایا تھا۔ انجیل متی کا زمانۂ تالیف ۸۰ء یا ۹۰ء بتایا گیا ہے۔ پس یہ ایک مجہول الحال شخص کی روایت ہے۔ اور اس کی سند منقطع ہے۔ ایسی روایات کسی کے نزدیک لائق اعتماد نہیں ہوتی۔ متی کی انجیل میں یسوع مسیح کا نسب نامہ لوقا کی انجیل سے مختلف ہے۔ متی نے یسوع کو یوسف نجار کا بیٹا ٹھہرا کر اس کا نسب سلیمان بن داؤد سے ملایا ہے۔ اور لوقا نے یوسف کا نسب ناتن بن داؤد سے ملایا ہے۔ علاوہ ازیں متی لکھتا ہے کہ یوسف کے باپ کا نام یعقوب تھا اور لوقا کے نزدیک یوسف کا باپ عیلی تھا۔ متی نے لکھا ہے کہ حواریوں کو تبلیغ پر روانہ کرتے وقت یسوع نے انہیں لاٹھی ساتھ رکھنے کی ممانعت کی تھی۔ مگر لوقا کہتا ہے کہ لاٹھی کی اجازت دی تھی۔ متی کے بیان کے مطابق یسوع مسیح کی پیدائش کے بعد اسے یوسف بادشاہ کے خوف سے مصر لے گیا تھا۔ اور وہیں کچھ دیر اس کی پرورش ہوئی، مگر لوقا کا بیان ہے مسیح کو پیدائش کے بعد ناصرہ میں رکھا گیا تھا اور اس کی پرورش وہاں ہوئی۔

مرقس کی انجیل اس انجیل کا مؤلف مرقس بالاتفاق حواری نہیں تھا۔ بلکہ پطرس حواری کا شاگرد تھا۔ اس نے پطرس کے مکالمات کو یونانی زبان میں لکھا۔ اسی سبب سے اسے پطرس کا ترجمان کہا گیا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس انجیل میں سے کون کون سے حصے واقعی پطرس حواری کے بیان کردہ ہیں۔ اور کون کون سے خود مرقس کے۔ لہذا اس انجیل کی سند بھی مشکوک ہے۔ خود مرقس نے اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ مورخین کا خیال ہے۔ کہ اس کا زمانۂ تالیف ۶۵ء اور ۷۰ء کے درمیان تھا۔ بعض عیسائی علماء کے نزدیک مرقس کی انجیل کا اصل مسودہ لاطینی زبان میں لکھا گیا تھا۔ جو بعد میں یونانی میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا۔ اور ترجمے میں کئی غلطیاں ہو گئیں۔ اصل نسخہ ناپید ہے، صرف تراجم باقی ہیں۔ یہ انجیل روم کے شہر میں پطرس کی موت کے بعد

تصنیف ہوئی تھی۔

لوقا کی انجیل اس انجیل کا مصنف حواری نہیں تھا۔ نہ مسیحؑ سے کبھی ملا تھا۔ یہ پولوس کا شاگرد تھا اور مسلّم ہے کہ پولوس خود بھی حواری نہ تھا۔ نہ اس نے مسیحؑ سے فیض حاصل کیا تھا۔ اس انجیل میں پولوس کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ پس اس انجیل کی سند بھی منقطع ہے۔ پولوس اور مسیحؑ کا درمیانی رابطہ غائب ہے۔ خود لوقا بیان کرتا ہے کہ اس نے دوسروں سے سُنی سنائی باتیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب اُس نے رومی حکومت کے ایک عہدہ دار تھیفلس کے التماس پر اسے لکھ کر دی تھی۔ جیسا کہ اس کی پہلی آیت سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ مگر لوقا یہ نہیں بتاتا کہ وہ کون سے راوی تھے جن سے اُس نے روایت کی ہے۔ اس لحاظ سے لوقا مجہول اشخاص سے روایت کرتا ہے۔ اس کتاب کا سن تالیف خود عیسائی محققین کے مطابق ۵۷ء سے لے کر ۸۰ء تک ہے۔

یوحنا کی انجیل اس کے متعلق عیسائی دنیا میں تو یہ شہرت ہے کہ یوحنا حواری کی تصنیف ہے، لیکن جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ دراصل یہ کسی گمنام یوحنا کی تصنیف ہے۔ اس کا سن تصنیف ۹۰ء سے لے کر ۱۱۵ء تک بتایا جاتا ہے۔ اس انجیل سے صاف نظر آتا ہے کہ مصنف ان یونانی فلسفیانہ خیالات سے سخت متاثر ہے جو پہلی صدی میں عیسائیوں میں پھیل گئے تھے۔ مصنف ایشیائے کوچک کے شہر افسس کا باشندہ تھا۔ اس کا طرزِ بیان، فلسفیانہ طرزِ استدلال اور بیان واقعات کی ترتیب وغیرہ سب دیگر تین انجیلوں سے جداگانہ ہے۔ شاید عہدِ جدید کی آخری کتاب مکاشفاتِ یوحنا — جسے جعلی اور خلافِ واقعہ یا وہمی و تخیلاتی باتیں لکھنے کی بنا پر سخت تنقیدات کا نشانہ بننا پڑا ہے — کا مصنف بھی یہی یوحنا ہو۔ اس کا پہلا فقرہ ہی فلسفیانہ اور صنمیاتی طرزِ تحریر کا واضح ثبوت ہے: "ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام ہی خدا تھا۔" تحریری اور بیانی الجھاؤ اس کتاب میں دوسری اناجیل کی نسبت زیادہ ہے۔ لوقا کی مانند یوحنا نے بھی اپنی انجیل کو مسیح کی سوانح عمری قرار دیا ہے۔ اور تسلیم کیا ہے کہ یہ انجیل یسوع مسیح کے صرف چند کاموں کے بیان پر بطور نمونہ مشتے از خروارے کی حیثیت رکھتی ہے ورنہ پورے احوال لکھے جاتے تو دنیا میں سما ہی نہ سکتے۔ (باب ۲۱)

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ چاروں انجیلیں عیسائی دنیا کی تسلیم شدہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی انجیلیں تھیں، جنہیں رد کر دیا گیا اور قرعہ اندازی سے یہ چار

چھانٹ لی ہیں۔ پوپ کے احکام سے کئی کتابیں عیسائیوں کے لئے ممنوع رہی ہیں۔
جن میں سے انجیل برنباس بھی ہے۔ اس کا مختصر بیان ضروری ہے۔

انجیل برنباس پہلی چاروں انجیلوں کے مصنف غیر حواری تھے۔ لیکن برنباس حواری تھا۔ لوقا کی تصنیف کردہ کتاب اعمال میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے۔
اپنی انجیل میں اُس نے اپنے حواری ہونے اور اوّل سے آخر تک ساتھ رہنے اور عینی گواہ ہونے کا شدّ و مد سے ذکر کیا ہے۔ دوسری انجیلوں میں دی گئی حواریوں کی فہرست میں اس کا نام درج نہیں ہے۔ عیسائی حضرات مقدس صحیفوں میں بے کھٹکے تحریف اور تغیر و تبدل کے عادی بلکہ قائل ہیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ انہوں نے خاص مقاصد کے پیشِ نظر برنباس کے بجائے اس فہرست میں توما کا نام لکھ دیا ہے۔ یہ انجیل اپنے حسنِ ادا، طرزِ بیان، ترتیب اور تاثیر میں دوسری چاروں انجیلوں سے افضل ہے۔ برنباس ہر واقعہ اپنا چشم دید اور اپنا سُنا ہوا بیان کرتا ہے۔ اس کتاب کے مضامین مثلاً تردیدِ اشراک، توحید کی واضح تعلیم، صفاتِ الٰہی، عبادات اور اخلاق، انبیاء کی تعلیم کے عین مطابق ہیں۔ یہ کتاب عیسیٰ علیہ السلام کی اصلی اور صحیح تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اس میں آنجناب کی نمازوں، روزے اور دعاؤں کا ذکر اسی طرح آیا ہے، جس طرح قرآن نے شہادت دی ہے۔ اور جس طرح دوسرے انبیاء کی تعلیم اور عملی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ نمازوں کے اوقات تقریباً وہی پانچ ہیں جو اسلام نے بتائے ہیں۔ اس میں عیسیٰؑ کے وضو اور طہارت کا بیان بھی ہے۔ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے نبی ہونے کا کھلا بیان بھی ہے حالانکہ یہودی کتابوں نے انہیں محض بادشاہ بنا کر پیش کیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی اصل حیثیت — عبدہٗ و رسولہٗ — کا صراحت سے بار بار ذکر ہے۔ صلیبِ مسیحؑ کا انکار ہے۔ اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا نام کئی بار آیا ہے۔ یہ کتاب ہمیشہ عیسائیوں نے چھپا کر رکھی اور اسے گم شدہ لٹریچر میں شمار کیا۔ اس کا ایک نسخہ اطالوی زبان میں آسٹریا کے شاہی کتب خانے میں موجود ہے۔ اٹھارویں صدی میں ایک اور نسخہ ہٹلی کے مقام پر ڈاکٹر ہٹن کو ملا جو ہسپانوی زبان میں ہے۔ یہ مشہور مستشرق جارج سیل کو ملا اور اس نے ترجمۂ قرآن میں اس کے حوالے دیئے ہیں۔ ہسپانوی ترجمہ کسی مسلمان مصطفیٰ عرندی نے کیا تھا۔ جو اس نے اصل اطالوی نسخے سے کیا۔ یہ نسخہ ایک عیسائی راہب فرامرینو نے پوپ سکسٹس پنجم کے کتب خانہ سے چرایا تھا۔ اس کا انگریزی اور عربی ترجمہ شائع ہوا مگر کسی سازش سے اسے ضائع کر دیا گیا۔ اردو میں اس کا دو دفعہ ترجمہ

ہو چکا ہے۔ پہلا مولوی محمد حلیم انصاری نے کیا اور دوسرا پروفیسر آسی ضیائی نے یہ دوسرا ترجمہ غالباً لاہور سے مل سکتا ہے۔ انصاری صاحب کے ترجمہ کا ایک نسخہ ضلع سیالکوٹ میں پسرور کے مقام پر مولانا بشیر احمد مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ میں نے اسے پڑھا اور اقتباسات لئے ہیں۔ دوسرا نسخہ اسلامیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

مسیحی فرقے

عیسائیت کی تاریخ کو پڑھنے والا اس حقیقت تک پہنچنے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتا کہ اس مذہب میں بے حد وحساب فرقے رہے ہیں۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ اگر کسی مقام پر دس مختلف الخیال عیسائیوں کا اجتماع ہو اور وہ باہمی اختلاف کو دور کرنے کے لئے بحث ومناظرہ کریں تو کوئی بات طے ہونے کی بجائے جب وہ مجلس کے اختتام پر اٹھیں گے تو گیارہ فرقے بن چکے ہوں گے جن میں سے ہر ایک دوسروں پر لعنت کرتا ہوا اٹھے گا۔ اسی شدید فرقہ بازی کا فیصلہ کرنے کے لئے مختلف زمانوں میں عیسائی کونسلوں کا انعقاد ہوتا رہا مگر اختلاف مٹ نہیں سکا۔ علامہ ابن حزم اندلسی ۴۵۶ھ نے سات فرقوں کا ذکر کیا ہے:۔ (۱) آریوسی فرقہ جو اسکندریہ کے قسیس آریوس کا مقلد تھا۔ یہ فرقہ اللہ تعالیٰ کو ہی قدیم اور ازلی وابدی مانتا تھا۔ مسیحؑ کو اللہ کا مخلوق بندہ مانتا تھا، ہاں! اس کے نزدیک مسیحؑ کلمۃ اللہ اس معنی میں تھا کہ اس کلمے کے ذریعے سے اللہ نے کائنات کو پیدا کیا۔ ایک عیسائی فاضل جیمز میکینن نے اس پر اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ اس کے خیال میں مسیح خدا نہیں تھا بلکہ ایک کامل مخلوق تھا جس میں خدائی اور انسانیت دونوں کا کچھ حصہ موجود تھا۔ (۲) پولس شمشاطی PART OF SAMOSATQ کا فرقہ، یہ شخص انطاکیہ کا بطریرک تھا اس کا مذہب یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صحیح توحید کا قائل تھا اور مسیحؑ کو اس کا بندہ اور رسول مانتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں کلمۃ اللہ اور روح القدس کو نہیں جانتا کہ وہ کون اور کیا ہیں۔ (۳) مقدونی فرقہ، یہ لوگ قسطنطنیہ کے بطریرک مقدونیوس کے مقلد تھے۔ یہ فرقہ بھی توحید مجرد کا قائل تھا۔ اس کے نزدیک عیسیٰؑ مخلوق بندہ تھا۔ اور نبی مرسل تھا۔ جیسا کہ تمام دوسرے نبی بھی انسان اور رسول تھے۔ اور عیسیٰؑ ہی روح القدس اور کلمۃ اللہ تھا جسے اللہ نے پیدا کیا۔ (۴) جرمانیہ فرقہ جو تثلیث کے چکر میں پڑے بغیر سیدھی بات کہتا تھا کہ اللہ، مسیحؑ اور مریمؑ یہ تینوں الگ الگ خدا ہیں۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ یہ فرقہ اب مٹ چکا ہے۔ (۵) ملکانیہ فرقہ، حبشہ اور نوبہ کے بادشاہوں اور عوام کے علاوہ بقول

ابن حزمؒ تمام عیسائی بادشاہ اور عوام ملکانیہ فرقہ سے متعلق تھے۔ یہ افریقہ، سسلی، اندلس، اور شام کے جمہور عیسائیوں کا مذہب تھا۔ ان کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ یہ تینوں ازلی وابدی ہیں۔ عیسیٰؑ پورا خدا اور پورا انسان تھا۔ اس میں خدائی اور انسانیت ایک دوسرے سے جدا نہ تھی۔ اور جسے صلیب دی گئی وہ انسان عیسیٰ تھا نہ کہ خدا عیسیٰ۔ اور مریم نے جسے جنا تھا وہ بیک وقت خدا اور انسان تھا اور وہ دونوں ایک ہی چیز تھے۔ (۶) نسطوری فرقہ، یہ لوگ قسطنطنیہ کے بطریک نسطوریوس کی طرف منسوب ہیں۔ ان کے عقائد معمولی فرق کے ساتھ ملکانیہ سے ملتے جلتے تھے۔ اختلاف صرف اس قدر ہے کہ مریم نے خدا کو نہیں بلکہ انسان کو جنا تھا۔ اور اس میں خدائی کا حصہ خدا کا مولود تھا نہ کہ مریمؑ کا۔ حافظ ابنؒ حزم کے بقول یہ فرقہ موصل، عراق، فارس اور خراسان کے عیسائیوں میں اکثریت رکھتا تھا۔ (7) یعقوبی فرقہ جو مصر اور حبشہ و نوبہ میں پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مسیحؑ خود خدا تھا جو سولی پر مرا اور اس کی موت کے بعد جب تک وہ دوبارہ قبر سے نہیں اٹھا تین دن تک یہ جہان خدا کے بغیر رہا۔ تین دن کے بعد وہ دوبارہ زندہ ہوا تو دنیا کے انتظام کو سنبھال لیا۔ مریمؑ کے بطن میں خود خدا تھا۔ اور وہی اس سے پیدا ہوا۔ یہ فرقہ یعقوب برذعانی کی طرف منسوب ہوا جو قسطنطنیہ کا ایک راہب تھا۔

علامہ ابوالفتح عبدالکریم شہرستانیؒ نے الملل والنحل میں لکھا ہے کہ نصاریٰ کے بہتر فرقے ہوئے ہیں۔ جن میں سے بڑے بڑے اور مشہور فرقے تین ہیں۔ ملکانیہ، نسطوریہ اور یعقوبیہ۔ پھر ان کے فلسفہ حلول و تجسّم اور تثلیث کی شرح بیان کی ہے۔ اس شرح میں ان کا بیان ابن حزمؒ کے بیان سے کہیں کہیں مختلف ہے۔ اختلاف کا سبب یوں سمجھ میں آتا ہے۔ کہ نصاریٰ کے عقائد میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ انہی کے تصفیے کے لئے مجالس کا انعقاد ہوا اور فرقہ بندی بڑھتی رہی۔ تثلیث کا عقیدہ چونکہ عیسیٰؑ کے بعد پیدا ہوا اور اس میں بہت کچھ فلسفہ یونان اور مشرکانہ عقائد کی آمیزش تھی، لہٰذا جو کسی کے جی میں آیا کہتا رہا۔ ایک ہی فرقے کے لوگ باہم اختلاف میں لگے رہے۔ ہر زمانے میں اس کی نئی نئی تعبیرات اور نئے نئے دلائل پیدا ہوتے رہے۔

ہمارے ملک کے مشہور اہلِ قلم عالم مولانا تقی عثمانی جج وفاقی شرعی عدالت نے کچھ اور فرقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو حسبِ ذیل ہیں۔

پولسی فرقہ اس فرقے کے عقیدے کے مطابق مسیحؑ خدا نہیں بلکہ فرشتہ تھے۔ جو دنیا کی اصلاح کی خاطر مریمؑ کے بطن سے انسانی شکل میں پیدا ہوئے۔ وہ ابن اللہ اس خصوصیت کی وجہ سے کہلائے۔ کہ خدا نے انہیں اپنا مخصوص جلال عطا کیا تھا۔ یہ فرقہ آرمینیا اور ایشیائے کوچک میں پایا جاتا تھا۔ مگر اس کے ماننے والے بہت کم تھے۔

آج کل دنیا بھر میں بہت سے عیسائی چرچ عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ہیں۔ مغربی ممالک چونکہ خالصتاً مادہ پرست ہو چکے ہیں لہٰذا اب ان میں مذہبی احساس زیادہ نہیں رہا۔ عیسائیت ایک قومی بنیاد کی حیثیت سے زندہ ہے مگر اکثر لوگ ملحد اور دہریئے ہو چکے ہیں۔ جو عیسائی ہیں بھی بس برائے نام ہیں۔ سیاسی، خالص دنیوی اور مادی مسائل مذہب پر غالب آ چکے ہیں۔ اس وقت تین بڑے بڑے عیسائی فرقے موجود ہیں کیتھولک فرقہ پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈکس فرقہ۔ بنیادی مسائل یعنی تثلیث و حلول اور مصلوبیت و کفارہ میں یہ لوگ بالعموم متفق ہیں۔ اختلاف صرف مرکزی اقتدار اور پوپ کے اختیارات میں ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ جو انگلستان کی طرح کئی اور ممالک کا بھی سرکاری مذہب ہے۔ پوپ کے خدائی اختیارات کو نہیں مانتا اور بپتسمہ اور عشائے ربانی کے سوا اور کسی مذہبی رسم کا قائل نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بت پرستی اور عیسیٰؑ و مریمؑ کی مجسمہ سازی کے بھی خلاف ہے۔ کیتھولک فرقہ پاپائے روم کو اپنا واحد مذہبی پیشوا اور عیسیٰ مسیحؑ کا نمائندہ سمجھتا ہے۔ ان کے گرجا گھروں میں عیسیٰؑ و مریمؑ کے مجسمے اور تصویریں ہوتی ہیں۔ جنہیں جاہل عوام بت پرستوں کی مانند پوجتے ہیں۔ آرتھوڈکس فرقے کا اپنا الگ نظام ہے۔ ان کا سب سے بڑا دینی پیشوا بطریرک کہلاتا ہے۔ اور ان کا مرکز قسطنطنیہ ہے۔ تثلیث کے عقیدے کی تفصیل میں ان کا کیتھولک فرقے سے یہ اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک روح القدس کا اقنوم صرف باپ (خدا) کے اقنوم سے نکلا ہے۔ اور بیٹا اس عمل میں محض ایک واسطہ ہے۔ کیتھولک فرقے کے نزدیک روح القدس کا اقنوم باپ اور بیٹے دونوں سے نکلا ہے۔ علاوہ ازیں آرتھوڈکس کے نزدیک بیٹا رتبے میں باپ سے کم ہے مگر کیتھولک کے نزدیک دونوں ہر لحاظ سے اور ہر صفت میں برابر ہیں۔ آرتھوڈکس فرقہ نیقیہ کی کونسل کے فیصلے کو مانتا ہے مگر اس کے نزدیک اس کی عبادت میں کیتھولک چرچ نے اپنی مرضی سے اضافہ کر لیا تھا۔

مسیحی رسوم عبادت عیسائیوں کے نزدیک اصولِ عبادت چار ہیں (۱) عبادت اُس قربانی کا شکریہ ہے جو مسیحؑ نے سولی پر چڑھ کر بندوں کے گناہ معاف کرانے کی خاطر دی تھی۔ (۲) صحیح عبادت صرف روح القدس کے عمل سے ہو سکتی ہے۔

(۳) عبادت ایک اجتماعی فعل ہے جو کلیسا ہی انجام دے سکتا ہے۔ بوقتِ ضرورت کلیسا کا رکن انفرادی عبادت بھی کر سکتا ہے۔ (۴) عبادت کلیسا کا بنیادی کام ہے کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ "مسیح کا بدن" بن کر دنیا کے سامنے پیش ہوتا ہے۔

عبادات: ا۔ گرجا گھروں میں جمع ہو کر زبور کے حمدیہ بھجن گانا، گانے کے دوران حاضرین کھڑے رہتے ہیں اور اختتام پر گھٹنے ٹیک کر دعا کرتے ہیں۔ (ب) بپتسمہ (اصطباغ) جو ہر نئے عیسائی ہونے والے کو دیا جاتا ہے۔ اور اس کے بغیر کوئی شخص عیسائی نہیں بن سکتا۔ عیسائیوں کے عقیدے میں بپتسمہ کے غسل سے انسان مر کر دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔ اس غسل سے پہلے عیسائیت میں دخول کے امیدوار کو ایک عبوری دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ عیسائی تعلیمات سیکھتا ہے۔ اور بپتسمہ پانے تک عیسائی نہیں بلکہ کیٹ چومن کہلاتا ہے۔ وہ بپتسمہ سے پہلے عشائے ربانی کی رسم میں شامل نہیں ہو سکتا۔ ایسٹر یا پینٹی کوسٹ کی عید سے کچھ پہلے اسے بپتسمہ دیا جاتا ہے۔

بپتسمہ دینے والے مخصوص لوگ ایک مخصوص کمرہ میں یہ کام انجام دیتے ہیں۔ اس کمرے میں امیدوار کو مغرب کی طرف منہ کر کے لٹا دیتے ہیں۔ وہ مغرب کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے اے شیطان میں تجھ سے اور تیرے ہر عمل سے دستبردار ہوتا ہوں۔ پھر وہ مشرق کی طرف منہ کر کے زبان سے عیسائی عقائد کا اعلان کرتا ہے۔ بعد ازاں اسے ایک اندرونی کمرے میں لے جا کر ایک خاص قسم کے دم کئے تیل کی مالش کپڑے اُتروا کر تمام بدن پہ کرتے ہیں۔ اور پھر بپتسمہ کے حوض میں ڈال دیتے ہیں۔ اس موقع پر بپتسمہ دینے والے اس سے تین مرتبہ پوچھتے ہیں کہ کیا وہ باپ بیٹے اور روح القدس پر مقررہ تفصیل کے مطابق ایمان رکھتا ہے۔ ہر بار وہ جواب دیتا ہے کہ ہاں میں ایمان رکھتا ہوں۔ اس کے بعد اسے حوض سے نکال کر پیشانی، کان، ناک، اور سینے پہ دم کئے ہوئے تیل کی دوبارہ مالش کرتے ہیں۔ بعد میں اسے سفید لباس پہنا دیتے ہیں۔ گویا اب وہ گناہوں سے پاک صاف ہو گیا ہے۔ اس طرح بپتسمہ پانے والوں کو جلوس کی شکل میں گرجے میں لے جاتے ہیں۔ اور عشائے ربانی میں شامل کرتے ہیں۔

ج۔ عشائے ربانی: یہ رسم عبادت بقولِ عیسائی حضرات جناب مسیحؑ کی قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اتوار کو گرجا گھر میں دعاؤں وغیرہ کے بعد حاضرین ایک دوسرے کا بوسہ لے کر انہیں مبارکباد دیتے ہیں۔ پھر روٹی اور شراب لائی جاتی ہے۔ پادری باپ، بیٹے اور روح القدس سے برکت کی دعا کرتا ہے اور سب لوگ آمین کہتے ہیں پھر یہ شراب اور روٹی سب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ کہ وہ اسے کھا پی کر مسیحؑ کے کفارے کا عقیدہ تازہ کریں۔ یہ روٹی مسیحؑ کے بدن میں اور شراب اس کے خون میں تبدیل ہو جاتی ہے

(معاذ اللہ منہ) انجیل متی میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے گرفتاری سے ایک دن قبل حواریوں کے ساتھ رات کا کھانا کھایا: "جب وہ کھا رہے تھے تو یسوع مسیح نے روٹی لی اور برکت دے کر توڑی اور شاگردوں کو دے کر کہا لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے۔ پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور ان کو دے کر کہا تم سب اس میں سے پیو کیونکہ یہ میرا وہ عہد کا خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے" (متی ۲۶) لوقا نے یہ الفاظ اور بڑھائے ہیں کہ "میری یادگاری کے لئے یہی کیا کرو" (لوقا ۲۲)

پروٹسٹنٹ فرقہ کے نزدیک روٹی اور شراب مسیحؑ کے بدن اور خون میں تبدیل نہیں ہوتی (گویا یہ مسیحؑ کا محض ایک محاوراتی کلام تھا) صرف یہ مسیحؑ کے کفارے کی یادگار ہے۔ دوسرے عیسائی — مثلاً کیتھولک فرقہ — یہ سمجھتے ہیں کہ یہ روٹی اور شراب واقعی مسیحؑ کا بدن اور خون ہو جاتی ہے۔

یہاں تک بیان شدہ عبادتیں عیسائیوں میں متفق علیہ ہیں۔ پانچ رسمیں اور ہیں جنہیں کیتھولک عیسائی ادا کرتے ہیں۔ اور پروٹسٹنٹ من گھڑت اور جھوٹ سمجھتے ہیں۔

تیوہار

ا۔ اتوار کا دن: عیسائی حضرات اتوار کو مقدس جانتے اور اس دن گرجاؤں میں عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ دراصل یہ دن یونانی مشرکوں کے ہاں سورج دیوتا کی پوجا کے لئے مقرر تھا جیسا کہ اس کے نام SUNDAY سے ظاہر ہے۔ ہندوؤں میں بھی ایت وار سورج دیوتا کا دن تھا۔ بہرصورت مشرکوں کو خوش کرنے کی خاطر یہ دن مقرر کیا گیا تاکہ وہ عیسائیت کو بیگانہ چیز جان کر بدک نہ جائیں۔

ب۔ کرسمس: ۲۵ دسمبر کو یوم میلادِ مسیحؑ مناتے ہیں۔ یہ دن بھی دراصل رومی مشرکوں کے ایک دیوتا کی یادگار تھا۔ انہیں خوش کرنے کی خاطر اس دن کو یوم میلادِ مسیحؑ بنا لیا گیا حالانکہ مسیحؑ موسم گرما میں پیدا ہوئے تھے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ مریم نے بچہ کو جن کر چرنی میں ڈال دیا۔ اگر یہ دسمبر کا مہینہ ہوتا تو نہ مریمؑ باہر جا سکتی نہ ننگے بچے کو چرنی میں ڈالا جا سکتا تھا۔

ج۔ ایسٹر: یہ دن عیسیٰؑ کے مر کر دوبارہ زندہ ہونے کی یاد میں ۱۲ مارچ کو مناتے ہیں۔ یہ دن بھی ایرانیوں کا عید نوروز تھا۔ ہندوؤں کی بسنت اور آئرلینڈ والوں کے ہاں موسم بہار کی دیوی آسٹر کی پرستش کا دن تھا۔ نام بدل کر ایسٹر بنا لیا گیا۔ اور اسے اپنا لیا گیا۔ یہ دیوی بعل دیوتا کی بیوی عستارات ہے جس کی یہودیوں نے بھی پوجا کی اور انبیاء نے انہیں اس پر ملعون کیا تھا۔ اس کا ذکر یہودی مذہب کے بیان میں گزر چکا ہے۔

تعریف لفظ اسلام کا مادّہ سَلَم ہے جس کا معنی ہے صلح و سلامتی، پس اسلام کا معنی ہوا: صلح و سلامتی اور امن و آشتی کو پھیلانا، اللہ کے احکام کے آگے گردن جھکانا، حق و صداقت کو تسلیم کرکے اپنے آپ کو خالق و معبود کی ناراضگی سے بچانا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دینِ برحق صرف اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ
جو کوئی بھی اسے چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا۔ وہ دنیا و آخرت میں خائب و خاسر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اسلام کے سوا اور کسی دین کو ہرگز اس سے قبول نہ کرے گا۔ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ
تمام انبیاء و رسل اسلام کے داعی تھے۔ اُن کی اُمتوں نے اپنا نام مُسلِم کے سوا کچھ اور رکھا تو پیغمبروں کے بعد اور ان کی تعلیم سے ہٹ کر رکھا تھا۔ ابراہیمؑ اور ان کی ذریّت کی دونوں شاخیں "حنیف" (موحّد) تھیں۔ انبیائے بنی اسرائیل نے اسحاقؑ و یعقوبؑ سے لے کر موسیٰؑ و عیسیٰؑ تک اسلام ہی پیش کیا تھا۔ آخری نبیؐ اسلام کو ہر قسم کی آمیزش سے جدا کر کے اور اس کی تکمیل کرکے آخری دین کے طور پر دنیا میں پیش کرنے کے لئے آئے تھے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط

آپؐ کی تشریف آوری سے قبل دنیا والے اسلام کے سبق کو بھلا چکے تھے۔ آپؐ اسی دینِ حق کو سرفراز کرنے اور ظاہری و باطنی لحاظ سے اسے غالب کرنے کو مبعوث ہوئے تھے۔

ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ
(التوبہ، الفتح)

اسلام کا پس منظر صحرائے عرب سے آفتابِ اسلام کے طلوع سے قبل دنیا والے شرک و کفر کی دلدل میں پھنس چکے تھے۔ یورپ اور روم و یونان تثلیث و حلول کے گرداب میں چکر کھا رہے تھے۔ ایران و عراق اور ایشیائے کوچک میں آتش پرستی کا چلن تھا۔ ہندوستان میں کروڑوں فرضی دیوتاؤں کے بُت پُج رہے تھے۔ مشرقِ ادنیٰ کے ممالک چین و جاپان وغیرہ شجر و حجر اور ارواحِ خبیثہ کے پجاری تھے۔

عرب کا تو حال ہی بڑا ابتر تھا جتنے قبیلے اتنے مذہب اور ان سے بھی زیادہ خدا۔ پتھروں، جانوروں، درختوں، سورج چاند ستاروں کی پوجا ہوتی تھی۔ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے۔ شرک و بت پرستی کی نت نئی صورتیں ایجاد ہوتیں، اللہ کے گھر کعبہ کو بت خانہ بنا دیا گیا تھا۔ ان کی بت پرستی کی داستانیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ انسان ضعیف الاعتقادی میں یہاں تک بھی جا سکتا ہے! ایک پتھر کو پونچھ پانچھ کر صاف کر لیا اور سامان سفر میں ساتھ رکھ لیا۔ اُسے پوجتے رہے اور جب اس سے زیادہ صاف اور خوبصورت پتھر مل گیا تو پہلا پھینک کر دوسرے کو خدا بنا لیا۔ چولہا بنانے کی ضرورت پیش آئی تو اُسی خدا کو چولہے میں استعمال کر لیا۔ کھانا پک گیا تو پھر پتھر کو صاف کر کے خدا بنا لیا۔ پتھر نہ ملا تو ریت کی ڈھیری پر بکری کا دودھ دوہ کر اُسے ذرا سخت بنا لیا اور اُس کی پوجا کر لی، پانی یا دودھ نہ ملا تو ڈھیری پر پیشاب کر کے اُسے ذرا سخت کر لیا اور خدا بنا کر پوج ڈالا۔ قسمت معلوم کرنے، قرعہ اندازی کرنے یا کوئی اہم کام کرنے سے پہلے بتوں سے مشورہ لینے کے لئے تیر بنا کر بتوں کے ہاتھوں میں دے رکھے تھے۔ ضرورت مند شخص پجاری کو نذر دے کر فال نکلواتا۔ تیروں پر ہاں یا نہیں لکھا ہوتا۔ جس قسم کا تیر نکلتا اسی کے مطابق عمل درآمد کرتے۔ وہم و خرافات اور بھوت پریت پر ایمان یہاں تک تھا کہ آج کا عقل مند انسان انہیں پڑھنے کے بعد شاید ہنسی کو ضبط نہ کر سکے۔ عجیب و غریب خرافاتی چیزوں پر ایمان تھا۔ پرندے اڑا کر خیر یا شر کا فیصلہ کرتے تھے۔ ارواح خبیثہ اور بھوت پریت کی پناہ لینا، انہیں مدد کے لئے پکارنا، جنوں کی دہائی دینا دن رات کا شغل تھا۔ یہ صحرائی لوگ جو علم و فن اور تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھی، جہالت کی آخری سرحدوں کو چھو چکی تھی۔ قتل و غارت روز کا مشغلہ تھا۔ جوا بازی اور شراب خوری لازمۂ سخاوت و شرافت بن چکے تھے۔ اپنے تجارتی سفروں میں دوسرے ممالک میں جو نئی شرکیہ رسوم دیکھتے انہیں اپنے ہاں رائج کر کے قابلِ فخر جانتے تھے۔ عورتوں پر ظلم و ستم ہوتا تھا۔ تعدد ازدواج کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ لڑکی کی پیدائش کو باعثِ شرم و بدنامی جانتے اور لوگوں سے چھپتے پھرتے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے؟ بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج بھی تھا۔ بعض دنوں، جگہوں، مکانوں یا جانوروں وغیرہ کو بلا سبب منحوس جانتے تھے۔ انہی اور اس قسم کی بے شمار مذہبی و معاشرتی برائیوں کے باعث یہ دَور جاہلیت کا زمانہ کہلایا۔

سیاسی طور پر یہ لوگ اتنے پسماندہ تھے کہ ساری شجاعت و جرأت خانہ جنگی میں

صرف کرتے تھے۔ کوئی مرکزی نظام موجود نہ تھا۔ قبائلی زندگی تھی۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار اور اپنا نظام ہوتا تھا۔ البتہ صحرائی زندگی کے باعث اپنے منتخب کردہ سردار کے سوا کسی کو صاحب اقتدار نہ جانتے تھے۔ جمہوریت کی روح ان میں ضرور زندہ تھی۔ انہوں نے کسی بیرونی اقتدار کو کبھی پسند نہیں کیا۔ باہر کے بادشاہوں کو بھی شاید ان بادیہ نشینوں پر حکومت کرنا کچھ زیادہ نفع مند نظر نہ آتا تھا۔ لہذا انہیں ان کے حال پر چھوڑے رکھتے تھے۔ چند شہروں اور قصبات کے سوا عام زندگی بدویانہ اور خانہ بدوشی کی تھی۔ زراعت بہت کم تھی۔ لوگوں کا پیشہ بالعموم تجارت تھا۔ میدانی اور ہموار علاقوں میں البتہ کچھ سرسبزی اور شادابی بھی تھی۔ طائف کا علاقہ سرسبز تھا۔ اور یثرب والوں کا پیشہ زراعت تھا۔ ساحلی علاقوں میں اِدھر اُدھر چھوٹی چھوٹی سلطنتیں بھی تھیں جو رُوم یا ایران کی بادشاہتوں کے زیر اثر تھیں۔

عرب کے جنوبی علاقے یمن میں شاہِ حبشہ کی سرپرستی میں ایک عیسائی سلطنت قائم تھی جس کے سربراہ ابرھہ نے حضورؐ کی پیدائش کے سال مکہ پر ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ۔ جس میں نوتے ہاتھی بھی تھے۔ چڑھائی کی تھی تاکہ بیت اللہ کو مسمار کر دے اور عربوں کی توجہ اس سے ہٹا کر یمن کے ایک نوتعمیر کنیسا کی طرف پھیر دے۔ نجران میں بھی ایک عیسائی سلطنت قائم تھی۔ اور اسی قسم کا ایک کلیسا وہاں بھی بنایا گیا تھا۔ عرب بُت پرست ہونے کے باوجود اپنے موروثی ابراہیمی مرکز کعبہ کو چھوڑنے پر بالکل آمادہ نہ تھے۔ اس کی بدولت انہیں بے شمار سیاسی و معاشی فوائد بھی حاصل تھے۔ جن پران کی زندگی کا دارومدار تھا۔

ولادتِ نبویؐ سے بعثت تک

حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مکہ میں قبیلہ قریش کے معزز ترین خاندان بنو ہاشم میں ۹ ربیع الاوّل کو بروز سوموار بوقت صبح صادق بمطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء ہوئی۔ اس سے کچھ دن ——— ۵۰ دن ——— قبل اصحاب الفیل کا واقعہ پیش آچکا تھا جس کے نتیجے میں بزرگانِ قریش نے آپؐ کے دادا عبدالمطلب کی سربراہی میں کعبۃ اللہ کے پردے پکڑ کر وہ مشہور دعا کی تھی جسے ابن ہشام نے سیرت میں نقل کیا ہے:

لَاهُمَّ اِنَّ الْعَبْدَ يَمْنَعُ رَحْلَهٗ فَامْنَعْ رِحَالَكْ

"اے اللہ بندہ اپنے ڈیرے کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کا خود دفاع کر"

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کا دفاع کیا۔ کئی سال تک مکہ میں بتوں کی پرستش کا سلسلہ موقوف رہا اور صرف خدائے واحد کی پرستش ہوتی تھی۔ یہ اس بات کی تمہید تھی

کہ بت پرستی اور شرک کو محو کرنے والا دنیا میں تشریف لا چکا۔ اس کا استقبال اس طرح ہونا چاہیئے کہ خدائے واحد کی عبادت کے زمزمے بلند ہوں اور بت سرنگوں ہو جائیں۔

چند دن تک آپؐ نے اپنی والدۂ ماجدہ آمنہؓ کے علاوہ اپنی کھلائی اُمّ ایمن اور ابو لہب کی لونڈی ثوبیہ کا دودھ پیا۔ پھر اہلِ مکہ کے شرفاء کے رواج کے مطابق قبیلۂ ہوازن کی ایک شاخ بنو سعد کی ایک خاتون حلیمہؓ نے آپؐ کی رضاعت کی ذمہ داری لے لی۔ آپؐ پیدائشی یتیم تھے۔ والدِ محترم آپؐ کی ولادت سے چار یا پانچ ماہ قبل فوت ہو چکے تھے۔ اسی لئے آپؐ کی پرورش عبدالمطلب — آپؐ کے دادا — کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ کم و بیش ۵ سال کی عمر تک آپ بنو سعد میں رہے پھر مکہ لائے گئے۔ مگر اس کے بعد جلدی ہی آپؐ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور آپؐ سراسر عبدالمطلب کی گود میں آ گئے۔ ۸ سال کی عمر میں دادا فوت ہوئے تو پرورش کا ذمہ ابو طالب — آپؐ کے چچا — نے لیا۔ انہی کے ساتھ آپؐ نے آبائی کاروبار تجارت میں حصہ لیا اور جوان ہو کر آزادانہ بھی کاروبار کرتے رہے۔ کاروباری سلسلے میں آپؐ نے شام، یمن اور بحرین کے علاقوں کا سفر کیا۔ مکہ بلکہ سارے عرب میں پڑھنے لکھنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ آپؐ بھی اُمّی — ان پڑھ — تھے۔ مکہ کی ایک رئیس خاتون خدیجہ مختلف لوگوں کے ساتھ شراکت کا کاروبار کیا کرتی تھیں۔ آپ کے صدق و امانت کی شہرت سن کر اس نے آپؐ کو شراکت کی دعوت دی جسے آپؐ نے قبول فرمایا اور یہی کاروبار آخر کار رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنے کا باعث بن گیا۔ آپؐ کی عمر اس وقت ۲۵ سال اور خدیجہ کی عمر چالیس برس تھی۔ آپؐ کی ساری اولاد — دو بیٹے اور چار بیٹیاں انہی کے بطن سے تھیں، صرف ابراہیمؑ مستثنیٰ ہیں جو ماریہ قبطیہ کے بطن سے مدینہ میں پیدا ہوئے۔ نرینہ اولاد نے بچپن میں وفات پائی اور صرف چار بیٹیاں — زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ زندہ رہیں۔

آپؐ کا بچپن، لڑکپن اور جوانی نہایت پاکیزہ تھی۔ عوام، خواص میں صادق و امین کے لقب سے مشہور تھے۔ شروع سے ہی بت پرستی، شراب نوشی اور ہر قسم کی برائی سے نفور تھے۔ میلوں ٹھیلوں، ناچ رنگ کی محفلوں اور لہو و لعب کے مشاغل سے اجتناب کرتے تھے۔ اچھائی کے انفرادی و اجتماعی کاموں میں لگے رہتے تھے۔ قوم کے بڑے لوگ آپؐ کو اہم معاملات میں مشورہ کیے لئے شریک رکھتے اور آپؐ کی اصابت رائے پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ چالیس برس کی عمر تک پہنچتے ہوئے آپؐ تنہائی پسند ہو گئے اور غاروں میں اکیلے بیٹھ کر غور و فکر کیا کرتے تھے۔ مکہ کے مشہور پہاڑ حرا کی ایک تنگ و تاریک

غار آپ کی تنہائیوں کا مرکز تھی۔ آخر ۱۷ رمضان کو اسی غار حرا میں پہلی وحی یعنی سورۂ اقرا کی پانچ پہلی آیتیں نازل ہوئیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ساتھ تعلیم دی۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ فرشتہ آپؐ کے روبرو ہو کر یہ پیغام دے گیا تھا۔ اس سے قبل سچے خواب تو آپؐ کو دکھائی دیتے تھے۔ لیکن یہ غار حرا والا تجربہ بالکل نیا تھا۔ بتقاضائے بشریت اس منفرد واقعہ سے آپؐ کا گھبرانا لازم تھا۔ چنانچہ آپؐ لرزتے کانپتے گھر پہنچے۔ خدیجہؓ نے تسلی دی اور اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے آپؐ کو ملوایا۔ اُس نے واقعہ سن کر آپؐ کی نبوت و رسالت کی شہادت دی اور خدا کے کام میں مدد و نصرت کا پختہ وعدہ کیا، مگر افسوس ورقہؓ کا بہت جلد انتقال ہو گیا۔

حضورؐ کی مکی زندگی پہلی وحی کے بعد پیغام الٰہی کا سلسلہ کچھ دیر تک منقطع رہا شاید اس لئے کہ یہ سبق اچھی طرح ازبر ہو جائے۔ تو پھر اگلا سبق دیا جانا مناسب سمجھا گیا، یا شاید اس لئے کہ آپؐ آہستہ آہستہ خدائی پیغام سے مانوس ہو کر آنے والے احوال و ظروف کے لئے پوری طرح تیار ہو جائیں۔ اس اڑھائی تین سال کے وقفے میں آپؐ کو جبرئیل نظر آتے اور تسلی دیتے کہ: "اے محمدؐ! آپؐ اللہ کے برحق رسول ہیں"۔ شجر و حجر سے رسالت کی گواہی ملتی رہی۔ آخر دوسری وحی اتری:

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۝

"اے کمبل اوڑھ کر سونے والے! اٹھ اور ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر اور اپنے کپڑے صاف کر"۔ پہلی وحی میں اگر اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اللہ تعالیٰ اگر قلم جیسی بے جان چیز کو ذریعہ تعلیم بنا سکتا ہے۔ تو ایک اُمّی کو قاری و عالم کیوں نہیں بنا سکتا؟ تو اس دوسری وحی میں آپؐ کو کمر ہمت باندھ کر فریضۂ انذار ادا کرنے، اللہ تعالیٰ کی عظمت و تکبیر کو واضح کرنے اور ظاہری و باطنی طہارت و نظافت کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے بامر الٰہی اللہ کا پیغام چپکے چپکے اپنے اعزہ و اقرباء اور دوستوں کو سنانا شروع کیا۔ خواتین میں سے خدیجہؓ، بالغ آزاد مردوں میں سے ابوبکر صدیقؓ، بچوں میں سے علیؓ

اور غلاموں میں سے زیدؓ بن حارثہ نے سب سے پہلے لبیک کہا۔ اس کے بعد رشتہ داروں کو کھلی تبلیغ کا حکم ملا اور آپؐ نے انہیں دعوت دے کر پیامِ حق سُنا دیا، مگر لوگ ہنستے اور مزاح کرتے ہوئے اُٹھ گئے۔ پھر تبلیغ عام کا حکم ہوا اور آپؐ نے پہاڑ پر چڑھ کر سب قبائل کو نام بنام پکار کر بلایا۔ لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے پہلے ان سے اپنے صادق و امین ہونے کا برملا اعتراف کرایا اور پھر توحیدِ الٰہی کا پیغام پہنچایا۔ اشاعتِ اسلام کی رفتار بہت سُست تھی۔ مگر جو لوگ آتے وہ پھر ہمیشہ کے لئے اسلام کی خاطر وقف ہو جاتے۔ عوام کے لئے آبائی دین اور شرکیہ رسوم ترک کرنا شاق تھا۔ خواص کو اس پیغام میں مساواتِ انسانی کا سبق دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ وہ کعبۃ اللہ کے مجاور ہونے کے باعث آل اللہ کہلاتے تھے۔ دور و نزدیک ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ ریاست و حکومت کی گدیاں چھوڑنا انہیں مشکل نظر آتا تھا۔ چند ایک کو چھوڑ کر ایمان لانے میں سبقت کرنے والے بالعموم غلام، باہر سے آ کر مکہ میں بسے ہوئے لوگ اور "عوامی طبقوں" سے تعلق رکھنے والے افراد تھے۔ جوں جوں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی قریش کی مزاحمت و مخالفت بھی ترقی کرتی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مخالفت نے عداوت اور شدید اجتماعی مزاحمت کا رنگ اختیار کر لیا۔ لوگ اپنے آبائی عقائد اور عبادات و رسوم کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ رئیس اور سیاسی مراعات یافتہ طبقہ اس نئی آواز میں اپنی نفی تصور کرتا تھا۔ پہلے لوگ انفرادی طور پر مخالفت کرتے تھے پھر یہ مخالفت جماعتی رنگ اختیار کر گئی اور آباؤ اجداد کے طور طریقے کو بچانے کی خاطر ان کی عزت و ناموس اور بزرگی کے واسطے دیئے جانے لگے۔ تمام قبائل نے اپنے اپنے نومسلموں کو ستانا اور اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرنا اپنا فریضہ قرار دے لیا۔ دین کی آواز دھیرے دھیرے اذہان و قلوب کو فتح کرتی رہی۔ عمرؓ بن الخطاب عدوی اور حمزہؓ بن عبدالمطلب ہاشمی کے اسلام لانے سے اہلِ اسلام کو تقویت ملی تو کفار تلملا کر رہ گئے۔ یہاں اور جس پر بس چلتا، مسلمانوں کو تعذیب کا نشانہ بناتے۔ حضورؐ سے شکایت ہوئی تو آپؐ نے صبر و تحمل کی تلقین کے ساتھ ملکِ حبش کو ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ مسلمان چپکے چپکے حبشہ کو جانے لگے۔ کفار نے راستہ روکا مگر ہجرت کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ شاہِ حبشہ نجاشی کو قریشی سفارت نے مسلمانوں کو واپس کرنے پر آمادہ کرنا چاہا مگر ناکام رہی اور اُلٹا شاہِ حبشہ خود مسلمان ہو گیا۔ اس واقعہ سے قریشی عداوت اور

پھر تک اُٹھی اور انہوں نے مسلمانوں کو ناقابلِ تصور اذیتیں پہنچائیں۔ کسی کو پانی میں ڈبویا کسی کو گرم کوئلوں پر لٹایا، کسی کو دو سرکش اونٹوں سے باندھ کر چیر ڈالا، بعض کو دو درختوں کے تنوں سے باندھ کر چھوڑ دیا اور جسم کس جائے اور اسی حالت میں وفات ہو جائے۔ مسلمانوں کا بائیکاٹ ہوا۔ خاندان بنی ہاشم سے قطع تعلق کیا گیا اور حضورؐ چند مسلمانوں اور بنو ہاشم سمیت ایک گھاٹی میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

نبوت کے گیارھویں سال حضرت خدیجہؓ کی وفات ہو گئی۔ حضورؐ پر گھر بلو ذمہ داریاں آپڑیں اور بچوں کے باعث شدید پریشانی کا سامنا ہوا۔ اسی سال آپؐ کے چچا اور خاندان کے سربراہ ابو طالب کی وفات ہو گئی۔ جو آپؐ کا دفاع کیا کرتے تھے۔ یہ واقعہ مزید پریشانی کا باعث بنا۔ اسی سال معراج کا واقعہ پیش آیا۔ اہلِ مکہ سے مایوس ہو کر حضورؐ نے گھوم پھر کر قبائلِ عرب سے تعاون حاصل کرنے اور انہیں اسلام لانے کی ترغیب دینے کا کام شروع فرمایا۔ سب قبائل نے ایمان لانے یا تعاون و نصرت کرنے سے انکار کیا۔ طائف میں تشریف لے گئے تو وہ لوگ سخت بدسلوکی سے بلکہ بدتمیزی سے پیش آئے۔ اسی کوشش میں اس سال حج پر آنے والے قبائل سے ملنا اور اللہ کی رسالت پہنچانا شروع فرمایا۔ مدینہ کے چند اشخاص نے جو آئے تو اہلِ مکہ سے ایک مشورے کے لئے تھے، اسلام قبول کر لیا۔ اور یوں اسلام کی آواز مکہ سے باہر دور تک جا پہنچی۔ ان لوگوں کی تلقین و تبلیغ سے مدنی قبائل اوس و خزرج کے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے اور آئندہ سال موسمِ حج میں ستر کے قریب انصارِ مدینہ حج کرنے اور آپؐ سے بیعت ہونے کو حاضر ہوئے۔ ان لوگوں نے آپؐ کو اپنے ہاں چلے آنے اور ہر قسم کی نصرت و امداد کرنے کا وعدہ کیا۔ آپؐ نے حکمِ خداوندی کے انتظار کا عذر کیا اور اپنے اصحاب کو اکا دکا ہجرت کا حکم دیا۔ یوں ہجرتِ مدینہ کا آغاز ہوا۔ جب مکہ میں سوائے عورتوں، بچوں اور ضعیف و معذور مسلمانوں کے سوا اور کوئی نہ رہا تو آپؐ نے بھی بمعیت یارِ غار ابو بکر صدیقؓ ہجرت فرمائی۔

مدنی زندگی

ہجرتِ مدینہ کے بعد کا دَورِ رسالت مدنی دَور کہلاتا ہے۔ اس دَور میں اسلامی عقائد کی بعض تفاصیل نازل ہوئیں۔ (اصل عقائد اور کچھ اخلاقی تعلیمات کا نزول مکہ میں ہو چکا تھا) یہ دَور اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں اسلام کو ایک اپنا وطن، اپنی سلطنت و حکومت اور اپنا خالص اسلامی معاشرہ میسر آیا۔ اس دَور میں عبادات کے علاوہ معاشرتی، معاشی، اخلاقی، سیاسی اور صلح و جنگ کے احکام نازل ہوئے۔ مکہ میں مشرکین کی حکومت تھی لیکن دشمن صرف انہی

تک محدود تھے، مدینہ میں ان کے علاوہ اہلِ کتاب اور منافقین سے بھی معاملہ پیش آیا۔
جنگِ بدر سے تبوک تک کا ایک طویل سلسلہ غزوات پیش آیا۔ مشرکین مکہ نے یہودِ مدینہ اور منافقین کے ساتھ سازباز کر کے بار بار اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو تہس نہس کرنے کی کوششیں کیں۔ جنگ بدر میں ۳۱۳ غیر مسلح مسلمانوں کو ایک ہزار سے زائد مسلح کفار پر پہلی مرتبہ میدانِ جنگ میں فتح حاصل ہوئی۔ اور اسلام کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی۔ جنگِ احد میں پہلے پہل کفار کو شکست ہوئی مگر چند مسلمانوں کی غفلت اور عجلت کے باعث کفار کے دوبارہ اچانک حملے کے باعث کافی نقصان ہوا۔ جنگ خندق میں قبائل عرب کی متحدہ قوت مدینہ پر چڑھ آئی مگر آخر کار محاصرہ اٹھا کر ناکام واپس لوٹی۔ ۶ھ میں حدیبیہ کا صلح نامہ مرتب ہوا جس میں پہلی مرتبہ کفارِ مکہ نے مسلمانوں کو ایک فریق مقابل تسلیم کر کے ان سے دس سالہ معاہدہ صلح کیا۔ اگلے سال جنگِ خیبر ہوئی۔ اور یہودی قوت منتشر و مفتوح ہو گئی۔ اس سے پہلے یہ لوگ مدینہ میں بار بار عہد شکنی کر چکے تھے۔ دو قبائل بنو قینقاع اور بنو نضیر خیبر میں جلا وطن ہوئے تھے۔ اور تیسرا قبیلہ بنو قریظہ اپنے مقرر کردہ ثالث کے فیصلے کے مطابق قتل اور غلامی کی سزا برداشت کر چکا تھا۔ ۸ھ میں کفار مکہ کی عہد شکنی کے نتیجے میں حضورؐ نے مکہ پر فوج کشی کی اور خون خرابے کے بغیر مکہ کو فتح کر لیا۔ اگلے سال رومیوں نے بے سبب حدودِ عرب کو پار کیا اور مقابلے کے لئے حضورؐ خود ایک لشکرِ جرار سمیت حدودِ شام تک پہنچے۔ مگر رومی پیچھے ہٹ گئے۔ اور یہ علاقہ جنگ کے بغیر مفتوح ہو گیا۔ اسی سال حج فرض ہوا اور حضورؐ نے پانچ مسلمانوں کو ابو بکر صدیقؓ کی امارت میں حج کے لئے روانہ فرمایا۔ اگلے سال آپؐ خود حج پر تشریف لے گئے۔ اور سوا لاکھ مسلمانوں سمیت ارکانِ حج ادا فرمائے۔ اسی موقع پر میدانِ عرفات میں خطبہ نبویؐ کے بعد تکمیل دین کی بشارت نازل ہوئی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا
(المائدہ) "آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین پسند کیا۔"

صلح حدیبیہ کے بعد سکون و اطمینان کا ایک وقفہ ملا تھا جس میں حضورؐ نے وقت کے بادشاہوں اور سلطنتوں کے سربراہوں کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے۔ شاہِ ایران نے نامۂ مبارک کو چاک کر دیا اور گستاخانہ کلمات زبان پر لایا۔ آپؐ کو اطلاع ملی تو فرمایا کہ اس نے اپنی سلطنت کو پرزے پرزے کر ڈالا ہے۔ (چنانچہ عہدِ خلافت فاروقی میں

یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور عہدِ عثمانیؓ میں شاہِ ایران اپنی سلطنت سے باہر کابل کی حدود میں بحالتِ جلاوطنی مارا گیا) شاہِ روم ایمان تو نہ لایا مگر حضورؐ کی نبوت کی تصدیق کی۔ شاہِ مصر نے اچھے جذبات کا اظہار کیا اور تحفے روانہ کیے۔

آخری حج کے بعد ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ کو بروز سوم بوقتِ چاشت آپؐ نے ایک مختصر علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔

اسلامی تعلیمات: اسلامی تعلیمات کو کئی شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) عقائد: آ۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتی وصفاتی توحید کا عقیدہ جو خصائصِ اسلام میں سے ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کے موجودہ ادیان و مذاہب میں یہ عقیدہ اسی وضاحت وصراحت کے ساتھ نہیں ملتا۔ ب۔ رسالت یعنی اللہ کے سب انبیاء و رسل پر از آدمؑ تا محمد رسول اللہ خاتم النبیینؐ ان کی سچائی و عصمت سمیت ایمان لانا۔ جن کا نام کتاب وسنت میں آچکا ہے۔ ان پر نام بنام تفصیلی ایمان لانا اور باقی پر اجمالی ایمان رکھنا۔ ج۔ کتبِ الٰہیہ جو انبیاء و رسل پر نازل ہوئیں ان کی صداقت اور اپنے اپنے اوقات میں واجب العمل ہونے پر ایمان لانا۔ د۔ ملائکۃ اللہ پر ایمان لانا کہ وہ خدائی سلطنت کے خادم اور کارکن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض ان کے ذمہ کیے ہیں — مثلاً وحی لانا جبرئیل کے سپرد تھا — وہ بے چون وچرا بلا کم وکاست انجام دیتے ہیں۔ وہ تذکیر وتانیث اور افزائشِ نسل وتولید سے مبرا ہیں۔ ھ۔ یوم آخرت پر ایمان لانا کہ اس کائنات کو ایک دن اجتماعی فنا کا شکار ہونا ہے۔ اور اگلے پچھلے سب حساب وکتاب اور جزا وسزا کے لیے اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے۔ اور اپنے اپنے فیصلے کے مطابق جنت یا دوزخ میں جائیں گے۔ و۔ دنیا میں سب کچھ اللہ کے ارادے اور قدرت اور علمِ ازلی کے مطابق ہوتا ہے مگر انسان کو نیک و بد میں امتیاز کرنے اور اس کے مطابق چلنے کا اختیار حاصل ہے۔ ز۔ موت کے بعد از سرِ نو زندگی شروع ہوگی جس میں اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

۲۔ عبادات: ا۔ دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ جن کی ادائگی ہر عاقل وبالغ مسلمان پر ناگزیر ہے۔ فرائض کے علاوہ کچھ سنت ونوافل بھی ہیں۔ جن سے فرائض کی تکمیل ہوتی اور قربِ خداوندی کا حصول ہو سکتا ہے۔ ب۔ صاحبِ نصاب مسلمانوں پر سال کے بعد زکوٰۃ فرض ہے جو نقدی کے علاوہ اموالِ تجارت اور مال مویشی پر بھی مقرر کی گئی ہے۔ ہر جنس اور نوع کے مختلف نصاب

مقرر کیے گئے ہیں۔ حج۔ ہر عاقل بالغ مسلم پہ رمضان کے روزے فرض کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ نفل روزہ کے فضائل بیان کئے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو اس کی طرف رغبت ہو۔ صاحب استطاعت مسلمانوں پہ عمر بھر میں ایک بار حج کعبہ فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ تاکہ دنیا بھر کے مسلمان اس اجتماعی عبادت میں شامل ہو کر اسلام کی عالمگیر برادری اور مساوات اسلامی کا عملی مظاہرہ کرکے رضائے الہٰی حاصل کریں۔

ان عبادات کے علاوہ تلاوت قرآن اور حصول علم دین ہر مسلمان پر فرض کیا گیا ہے۔ ضروریات وقت کے لحاظ سے ہر قسم کے علوم و فنون کو حاصل کرنا بھی لازم گردانا گیا ہے۔ جیسا کہ حضورؐ کی سنت اور خلفائے راشدین کے عمل سے واضح ہوتا ہے۔

۳۔ معاشرتی احکام اسلام نے زوجین، والدین و اولاد، ہمسایوں، اہل شہر اہل وطن، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حقوق و فرائض کے وسیع اور واضح احکام بیان کئے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہونے سے زندگی میں سکون و اطمینان اور سوسائٹی میں امن و سلامتی پیدا ہوتی ہے۔ یہ احکام مدنی سورتوں بالخصوص البقرہ، النساء، التحریم، المائدہ، الطلاق میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اور کتب حدیث میں بے شمار ابواب کے تحت ان کی شرح و تفصیل آئی ہے۔

۴۔ معاشی احکام کسب حلال کی فضیلت کے ساتھ ساتھ تمام حرام اور ناجائز ذرائع معاش کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ دھوکا، فریب، خیانت، غصب، چوری، ڈاکہ، سود جیسی لعنتوں کی مذمت و تحریم وارد ہوئی ہے۔ حرام پیشوں کی وضاحت بیان کی گئی ہے۔ بیع و شراء، تجارت، صنعت و ملازمت غرض زندگی کے سبھی معاملات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ اخلاقی احکام اسلامی تعلیمات میں اخلاقی احکام کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اخلاق حسنہ کے فضائل اور اخلاق سیئہ کے رذائل بیان ہوئے ہیں۔ صدق و امانت، دیانتداری، وعدہ وفائی، عدل و احسان، تقویٰ، صبر و شکر، ذکر الہٰی عفو و درگزر اور خدمت خلق کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور کذب و خیانت، بددیانتی، بدعہدی، بے انصافی، خودغرضی، بغض و حسد، سب و شتم جیسے برے اخلاق کی مذمت بیان کرکے ان سے نفرت دلائی گئی ہے۔

۶۔ سیاسی احکام اتحاد، نظم و ضبط، صف بندی، مشورہ، اطاعت امیر اور احساس ذمہ داری کا حکم دیا گیا ہے۔ کوئی خاص طرز حکومت

واضح طور پر نہیں بتایا گیا تاکہ مسلمان ہر قسم کے حالات میں اور ہر زمانے میں مناسب انتظام خود کرلیں۔ مناسب حد بندیاں قائم کردی گئی ہیں۔ اور راعی و رعایا کے حقوق و فرائض بتادیئے گئے ہیں۔ نمونے کا نظمِ مملکت اور طرزِ حکومت، وہ قرار دیا گیا ہے، جو آپؐ کے اوّلین شاگردوں نے قائم کیا۔ جو نظام اس سے جتنا قریب تر ہوگا۔ اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اور جتنا اس سے بعید ہوگا اتنا ہی بُرا ہوگا۔ مقاصدِ حکومت، بتادیئے گئے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ہر دَور کے مسلمانوں کو نظم و ضبط اور حکومت، خود قائم کرنا لازم ہے۔

۷۔ جہاد اور صلح و جنگ کے احکام

اسلام کے دفاع اور سربلندی کی خاطر جبر مسلح اور بوقت ضرورت مسلح کوشش کرنا فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے بے شمار فضائل بتائے گئے ہیں۔ شہادت کی موت کو حیاتِ جاودانی قرار دیا گیا ہے۔ دو مستقل سورتوں یعنی الانفال اور التوبہ کے علاوہ اکثر مدنی سورتوں میں جہاد و قتال اور حرب و ضرب کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ غیروں کے ساتھ مناسب حالات میں صلح و معاہدے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور پابندیٔ عہد پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ عہد شکنوں کے خلاف اعلان جنگ کا حکم ہے۔ اسلحہ تیار رکھنا، فنونِ جنگ سیکھنا، ہر قسم کی قوت مہیا کرنا مسلم جماعت کے فرائض میں داخل ہے۔ اسلام کے دفاع اور حق کی سربلندی کی خاطر ہر وقت تیار رہنے کا حکم قرآن مجید میں بڑی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ دین میں عدالتی نظام کی بھی تفصیل آئی ہے۔

دین و شریعت

یہ دونوں لفظ بعض دفعہ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے مفہوم میں فرق بھی ہے۔ دین کا مطلب ہے حیات دنیوی گزارنے کا انفرادی و اجتماعی نظام۔ اسلام اللہ تعالیٰ کے احکام و نواہی کے اس مجموعے کا نام ہے جو اس کے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دنیا والوں کی رہنمائی کی خاطر اتارا گیا۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس طریقے کے مطابق گزاریں۔ تاکہ دنیا و آخرت کی صلاح و فلاح حاصل ہو۔ ہر پیغمبر دین اسلام کا داعی تھا۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آلِ عمران) "بے شک، دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے"۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آلِ عمران) "اور جو اسلام کے سوا کوئی طرزِ حیات چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ اور وہ پچھلی زندگی میں نقصان پائے گا۔ ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو دینِ اسلام

پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی۔

يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ٥

(البقرہ) "میرے پیارے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے یہ دین چن لیا ہے سو تم صرف اسی حال میں مرنا کہ مسلمان ہو" دین کے بنیادی حقائق، عقائد، اخلاق اور بنیادی عبادات ہمیشہ ایک رہی ہیں۔ وقتی ضروریات کے لحاظ سے قانون (شریعت) میں ردّ و بدل ہوتا رہا۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (القرآن) "ہم نے تم میں سے ہر امت کے لئے قانونِ شریعت اور راہِ عمل مقرر کی" پس شریعت سے مراد دین کے قانونی احکام ہیں۔

اسلامی شریعت کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے۔ مگر اس میں ہر زمانے پر عمل درآمد کے لئے اجماع و اجتہاد اور قیاس کی کافی لچک رکھی گئی ہے۔ اس لئے اسلامی فقہ (قانون شریعت) کے چار ماخذ ٹھہرائے گئے ہیں۔ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ اس کی ضرورت یہ تھی کہ ہر دور کے احوال و ظروف میں شرعی احکام پر عمل کیا جا سکے۔ شریعت میں بالعموم عدالتی نظام، عدل و انصاف کے احکام اور طریقے، جرائم و حدود، قانونِ شہادت مدّعی و مدّعا علیہ کے احکام، قاضی کے صفات و احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ معاملات باہمی کا ہر وہ مقدمہ جس میں نزاع پیدا ہو سکے اس کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی تفاصیل کے لئے حدیث و فقہ کی کتابوں کے ابواب و فصول کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔

ختم نبوت اسلامی عقیدے کی رو سے قرآن ایک مکمل اور دائمی و آفاقی دستور العمل ہے۔ اسلام خدا کا آخری دین ہے جو اعلانِ خداوندی کے مطابق اکمال و اتمام کے مراحل طے کر چکا ہے۔ حلال و حرام کے ضوابط، قوانین شرع، اللہ اور بندے کا تعلق اور بندوں کے باہمی تعلقات کو آخری شکل میں اتار دیا گیا ہے۔ اب کسی جدید قاعدے قانون یا کتاب و دستور کا نہ انتظار ہے نہ ضرورت۔ انہی حقائق کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کا لقب عطا فرمایا ہے۔ اسلامی عقائد کی فہرست میں جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان کا بیان آتا ہے تو اس سے مراد آپؐ کو اس حیثیت سے رسول اللہ ماننا ہوتا ہے کہ آپؐ آخری نبی اور آخری مامور من اللہ ہیں۔ اب از روئے اسلام کسی جدید رسالت و نبوت کا انتظار نہیں۔ یہی سبب ہے کہ صحابہؓ نے جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف قتال کیا۔ اور انہیں کیفر کردار تک پہنچایا۔ بعد کی صدیوں میں بھی جب اور جہاں کہیں

کوئی شخص نبوت و رسالت کا مدعی بن کر اُٹھا اُسے کذاب و دجال قرار دیا گیا اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو حکومت کے باغیوں سے کیا جاتا ہے۔ حضورؐ کے بعد کسی جدید نبوت و رسالت کا دعویٰ دوسرے الفاظ میں حضورؐ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ہے۔ ایسے شخص کو رائج الوقت قوانین کے مطابق جو باغی کی سزا ہے اس سے بھی شدید تر سزا ملنی چاہیئے۔ وہ اسلام کی مرکزیت — عقیدۂ رسالت — کا باغی ٹھہرتا ہے۔

قرآن مجید قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری، مکمل اور ہمیشہ تک محفوظ کتاب ہے جو تیئس ۲۳ سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جبرئیل کی معرفت اُتری۔ یہ بے کم و کاست اپنی بالکل اصلی شکل میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے پاس لاکھوں کروڑوں مصاحف کی صورت میں موجود ہے۔ اور ہر زمانے میں ہر مسلم ملک و قوم کے اندر اس کے بے شمار حافظ موجود رہے ہیں۔ آج دنیا بھر کی مذہبی کتابوں میں صرف یہی وہ کتاب ہے جو صحیح معنی میں بعینہٖ محفوظ ہے۔ اس کے بے شمار تراجم و تفاسیر لکھی گئیں اور آئندہ بھی لکھی جائیں گی مگر سب بے شمار زبانوں کی یہ کتابیں قرآن کے ترجمے اور تفسیر کہلاتے ہیں، قرآن صرف وہ کتاب ہے جس کی ہم نمازوں، خطبوں، جلسوں، گھروں اور مسجدوں میں تلاوت کرتے ہیں۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے کسی ملک میں کسی پریس میں بھی یہ کتاب چھپے، ایک ہی ہو گی۔ اس میں سرِ مُو فرق نہیں آئے گا۔ اس کی جس قرأت پر حضورؐ کے پہلے شاگردوں نے اسے جمع کیا تھا اُسی پر ڈیڑھ ہزار برس سے پڑھی جاتی اور لکھی چلی آئی ہے۔ بعض الفاظ کے لب و لہجے کی ادائگی میں جو فرق ہے اسے بھی محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کا رسم الخط بھی محفوظ ہے۔ اس کے الفاظ، حروف، نقطے، آیات، ہر چیز کو شمار کیا گیا ہے۔ جتنا کام اس کتاب پر ہوا ہے دنیا کی اور کسی کتاب پر نہیں ہوا۔ اس کو سمجھنے سمجھانے اور پڑھنے پڑھانے کے لئے بہت سے علوم و فنون ایجاد ہوئے ہیں جو آج مسلم عوام میں مشہور و معروف ہیں۔ غرض یہ کتاب ہر پہلو اور ہر لحاظ سے دنیا کی بے مثال کتاب ہے۔ اسلامی عقیدے کی رُو سے اس کے الفاظ و معانی اور قرأت و تجوید ہر چیز خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی نازل ہوئی تھی اور ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

اعجاز القرآن پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہزارہا معجزات ظاہر ہوئے مگر ان میں سب سے بڑا اور زندہ و پائندہ معجزہ قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کو پہلے اس جیسی کتاب بنا لانے کا چیلنج دیا۔ اور فرمایا کہ تم لوگ قرآن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دیتے ہو لہٰذا

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْجِنُّ وَالْاِنْسُ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ؕ

"کہیئے اگر اس قرآن کی مثل لے آنے پر جن وانس بھی اکٹھے ہو جائیں تو ایک دوسرے کے مددگار ہونے کے باوجود وہ اس کی مثل نہ لا سکیں گے" جب اس تحدّی پر کچھ وقت گزر گیا۔ اور کوئی مرد میدان سامنے نہ آیا تو اس کی شرائط میں نرمی کر دی گئی۔ اور اس قرآن جیسی دس سورتیں لانے کو کہا گیا۔ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ "اس جیسی دس خود ساختہ سورتیں لے آؤ"، جب اس پر بھی کوئی مدّ مقابل نہ اٹھا تو آخری غیر مشروط دائمی چیلنج یوں دیا گیا۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

(البقرہ) "اور یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری اگر تمہیں اس میں کوئی شک ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب گواہوں مددگاروں کو بلا لو، اگر تم سچے ہو تو کر کے دکھاؤ" اس آیت میں کسی قوم، کسی زمانے یا ملک کی کوئی شرط نہیں۔ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت الکوثر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بھلا اس جیسے تین جملے ہی بنا کر لے آؤ۔ پھر مخالفین کو غیرت دلانے کے لئے یہاں تک فرما دیا گیا کہ:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۝ "پھر اگر ایسا نہ کرو اور اور ہرگز کبھی نہ کر سکو گے تو دوزخ کی آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ وہ منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے"۔ مگر دشمنوں کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ گالیاں دیتے رہے۔ اسلام کو مٹانے کی تدبیریں کرتے رہے۔ سازشیں کرتے رہے۔ فوجی کارروائیاں کرتے رہے۔ مگر یہ چیلنج جو ان کے لئے پیغام موت ہے۔ اسے قبول نہ کیا اور نہ کبھی کریں گے۔ اس سے بڑھ کر قرآن کی صداقت کا اور کون سا عملی و علمی ثبوت ہو سکتا ہے؟ گو اس کی صداقت کے ہزاروں دلائل اور بھی موجود ہیں!

جنت و دوزخ

عقیدۂ ایمان بالآخرت کی تفاصیل میں جنت و دوزخ کا عقیدہ بھی شامل ہے۔ جنت کا لفظی معنی باغ ہے وہ رضائے الٰہی کا گھر ہے جس میں ان لوگوں کو ہمیشہ کی زندگی کے لئے داخل کیا جائے گا جو میدان حشر کے حساب و کتاب میں کامیاب نکلیں گے اور جن کی نیکیاں برائیوں پر غالب ہوں گی۔ اگر ایمان سلامت

ہوا تو گنہ گاروں کو یا تو الہٰی فضل سے یا پیغمبرؐ اور ان کے فرماں برداروں کی شفاعت سے بخش دیا جائے گا۔ کچھ ایسے بھی ایماندار ہوں گے جنہیں کچھ وقت کے لئے سزا کی خاطر — تاکہ وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو جائیں — دوزخ میں بھیجا جائے گا۔ اور سزا ختم ہونے پر یا بذریعہ شفاعت یا رحمتِ خداوندی سے دوزخ سے رہا کرکے جنت میں بھیجا جائے گا

جنت کی نعمتیں بے حد و شمار ہوں گی اور دنیا میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا — جہنم — دوزخ — خدا کے عذاب، اور ظہورِ عدل کا مقام ہے۔ مشرک و کافر اور منافق تو اس میں اپنے اپنے درجے اور مرتبے کے مطابق ہمیشہ رہیں گے مگر اہلِ ایمان کے لئے وہ ایک مقامِ سیاست و طہارت ہوگا، کہ انہیں گناہوں کی میل کچیل سے صاف کر کے جنت جیسے پاک مقام میں لے جایا جائے۔ جس طرح جنت کے بے شمار درجے ہوں گے اسی طرح جہنم اور اس کے عذاب کے بھی درجے اور مراتب ہوں گے۔ نعوذ باللہ منہا۔

جمع قرآن دشمنانِ اسلام کے تمام مخالفانہ پروپیگنڈے کے باوجود حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی جمع و ترتیب کا کام اس کتاب کے نزول کے پہلے دن سے شروع ہو گیا تھا۔ جو اختتامِ نزول کے ساتھ اتمام کو پہنچ گیا۔ حسبِ وعدۂ خداوندی:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ (القیامۃ) "اسے جمع کرنا اور پڑھوانا خود ہمارے ذمہ ہے۔" ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ: اَی جمعہٗ فی صدرک۔ "یعنی اے رسولؐ! اسے آپؐ کے سینے میں جمع کرنا اور پھر آپؐ کی زبان سے پڑھوانا اللہ کے ذمہ ہے۔" پس جمع قرآن کا پہلا خزینہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک تھا۔ جوں جوں قرآن اترتا گیا آپ کے سینے میں حفظ ہوتا گیا۔ ہر نئی اترنے والی سورت یا آیت اعجازی رنگ میں سب سے پہلے جبرئیل سے سن کر آپؐ کو یاد ہو جاتی تھی۔ سورت لمبی ہو یا چھوٹی، اس معاملے میں کوئی فرق و امتیاز نہ تھا۔ پھر آپؐ نے قرآن کو لکھوانے اور کئی اصحاب کو اس کے مصاحف تیار کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ ان لوگوں کو کاتبِ وحی کہا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین کے علاوہ کم و بیش دو درجن لوگ وحی کے کاتب رہے ہیں۔ آپؐ انہیں بلوا کر اپنے سامنے لکھواتے، پڑھوا کر سنتے، ہر آیت اور سورت کا محل و قوع بتاتے تھے۔ لکھنے کا سامان یہ تھا: چوڑی چوڑی ہڈیاں، پتھر کے طویل و عریض ٹکڑے، لوہے کی تختیاں، ہرن کی کھال کی جھلی، ان چیزوں پر لوہے کی کیل سے کھود کر لکھا جاتا تھا۔ قلم دوات بھی استعمال ہوتی اور ان چیزوں کے علاوہ بعض دفعہ اور سامانِ کتابت بھی کام میں لایا جاتا تھا۔ کاتبینِ وحی کو حکم تھا کہ بالعموم آپؐ

کے قریب رہیں تاکہ بوقتِ ضرورت بلوا کر یا اگر مجلس میں موجود ہوں تو بھی وحی لکھوائی جاسکے بہت سے لوگ حافظِ قرآن بھی تھے۔ ویسے بھی نزولِ قرآن کی رفتار بہت سست تھی کہ ۲۳ برس میں تمام و کمال کو پہنچا، لہٰذا اس کا یاد کر لینا بہت سہل تھا۔ آج کل تو ہمارے بچے تین چار سال میں حافظ ہو جاتے ہیں۔ آپؐ نمازوں کے علاوہ خطبوں میں، وعظ و تقریر کی مجلسوں میں، غیر مسلموں کو تبلیغ کے وقت قرآن کی تلاوت فرماتے رہتے تھے اور ہر وقت لوگوں کی یادداشت تازہ ہوتی رہتی تھی۔ مسجدِ نبویؐ کے علاوہ مدینہ کی محلہ وار مساجد میں اور دُور دراز دیہات و صحرا میں قرآن کی تعلیم و تلاوت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا۔ مردوں کے علاوہ یہ سلسلہ بچوں اور خواتین میں بھی چلتا رہتا تھا۔ خواتین حضورؐ کے گھروں میں یا دوسرے مقامات پر جمع ہو کر مذاکرات و مکالمات اور مسائلِ شرع کے تعلیم و تعلّم کے علاوہ قرآن کی تلاوت و حفظ میں بھی کوشاں رہتی تھیں۔ اُس دَور میں ریاست و حکومت کا عہدہ اُن لوگوں کو ملتا جو دوسری اہلیتوں کے ساتھ ساتھ علمِ قرآن میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ یہ گویا تعلیمِ قرآن کی ایک عملی ترغیب تھی۔ کاتبینِ وحی کے علاوہ اور لوگ بھی اپنی اپنی یادداشت کے طور پر قرآن لکھتے اور اسے زبانی یاد رکھنے کے علاوہ کتابت کے ذریعے سے بھی محفوظ رکھتے تھے۔ حضورؐ جمعہ و عیدین کے خطبوں میں قرآن کا کوئی نہ کوئی حصّہ تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ فجر اور عشار کی فرض نمازوں کے علاوہ نمازِ تہجد میں آپؐ اور آپؐ کے اصحاب لمبی لمبی سورتوں کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ کتبِ حدیث اس قسم کے بے شمار واقعات سے پُر ہیں۔ حضورؐ کے زمانے میں آپؐ کی زیرِ نگرانی نہ صرف قرآنِ مجید کا جمع ہونا اور بہت سے لوگوں کے پاس اس کے مکتوب مصاحف کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس کی ترتیب سُوَر و آیات بھی آپؐ ہی نے صحابہؓ کو بتائی تھی۔ ایک حدیث میں ہے کہ جبرئیل جب قرآن کا کوئی حصّہ لے کر آتے تو آپؐ کو یاد کرانے کے ساتھ یہ بھی بتاتے تھے کہ اسے فلاں مقام پر فلاں سورت سے پہلے اور فلاں کے بعد یا فلاں آیت سے قبل اور فلاں کے بعد درج کیا جائے۔

حضورؐ کے حینِ حیات میں آخر وقت تک کسی حکم یا نہی کے نزول کا امکان باقی تھا۔ دین کی تکمیل ہو چکی تھی۔ مگر بعض احکام و نواہی کی وضاحت ممکن تھی یا کسی اخلاقی تعلیم کا نزول ہو سکتا تھا۔ اس مصلحت کے پیشِ نظر حضورؐ نے ان مختلف مجموعوں اور یادداشتوں کو جو کاتبینِ وحی کے پاس موجود تھیں کسی ایک صحیفہ یا کتاب کی شکل نہیں دی۔ اگر ایسا حکم دیا جاتا تو کسی نئی آیت یا سورت کے نزول کے بعد پھر اس کتاب کو توڑنا اور از سرِ نو مرتب کرنا پڑتا۔

یہ کام خلیفۂ رسولؐ ابوبکر صدیقؓ نے انجام دیا۔ جنگِ یمامہ میں شہید ہونے والے صحابہؓ میں بہت سے حفاظِ قرآن بھی تھے۔ جب اس کی اطلاع دارالخلافہ میں پہنچی تو حضرت عمر فاروقؓ کی منتظم طبیعت اور نگاہِ دُوررس نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اب قرآن کو ایک مصحف میں سرکاری نگرانی میں جمع کرنے کا وقت آ چکا ہے۔ چنانچہ ان کے مشورے سے خلافتِ صدیقیؓ میں یہ اہم کام سرانجام پایا۔ اس میں جلیل القدر فقہاء اور علمائے صحابہؓ اور حفاظِ قرآن سے مدد لی گئی۔ اور تقریباً چھ ماہ کے عرصے میں ایک مصحف تیار ہو گیا۔ جو مصحفِ امام کہلایا۔ یہ نسخہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تحویل میں رہا پھر جناب عمر فاروقؓ کے پاس رہا۔ ان کی شہادت کے بعد ام المومنین حفصہؓ نے اسے اپنی تحویل میں رکھا۔ حضرت عثمانؓ ذوالنورین کے دورِ خلافت میں کچھ لوگوں میں قرأتِ قرآنی میں اختلاف ہوا۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر انہوں نے پھر یہ کام اُسی پہلی جماعت کے سپرد کیا جو خلافتِ صدیقی میں جمعِ قرآن کا کام کر چکی تھی۔ اس کمیٹی کے ناظم کاتبِ وحی زیدؓ بن ثابت تھے۔ انہوں نے حضرت حفصہؓ سے اصل نسخہ منگوا کر اس کی سات نقلیں لکھیں اور سلطنت کے تمام صوبوں میں بھجوا دیں۔ رفعِ اختلاف کے لئے حکم دیا گیا کہ اس کے علاوہ اگر کسی کے پاس کوئی اور یادداشت ہو تو اُسے ضائع کر دیا جائے۔ اس طرح قرآن شائع ہوا اور مشرق و مغرب میں ہر طرف ایک ہی نسخہ پر سب مسلمان متفق ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ غنی کو اس سبب سے جامع القرآن کہا گیا۔ ان مختلف نقول کی اصل کا پیاں ترکی، تاشقند، مدینہ منورہ کے علاوہ بعض اور مقامات پر بھی بتائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ بتایا جاتا ہے جس میں موجودہ مصاحف سے سرِمو فرق نہیں ہے۔

جمعِ قرآن پر عالمِ اسلام کے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ کا خطبہ موجود ہے جو خطباتِ بہاولپور نامی کتاب کی زینت ہے۔

تدوینِ حدیث

عالمِ اسلام میں ہر مسلم کے گھر میں قرآن مجید کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ وہ خود اسے پڑھتا اور اولاد کو پڑھاتا ہے۔ ہر مسلم آبادی میں کئی حافظِ قرآن ہوتے ہیں۔ جو نمازِ تراویح میں ہر سال پورا قرآن کم از کم ایک مرتبہ زبانی سناتے ہیں۔ ہر اچھا مسلمان اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ میری اولاد یا ان میں سے ایک آدھ ضرور حافظ ہو۔ بس قرآن کا حرف بحرف محفوظ و مصئون ہونا ہر خاص و عام پر واضح ہے۔ یہی سبب ہے کہ اعداء اسلام کو قرآن پر اس پہلو سے اعتراض کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ اعتراضات اور شکوک و شبہات کا نشانہ بنانے کے لئے انہوں نے حدیث کو چُنا ہے۔

مستشرقین کی جماعت نے اس موضوع پر کھُل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ کیونکہ حدیث کی تعلیم و تعلّم اور اس کے مختلف علوم و فنون پر گفتگو کرنا علماء کا کام رہا ہے۔ اعدائے اسلام کی دیکھا دیکھی بعض ملحدین نے بھی حدیث کو نقد و جرح کا نشانہ بنایا ہے۔ اس وجہ سے اس موضوع پر مدلّل اور ذرا مفصّل گفتگو کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں پہلا سوال یہ ہے کہ آیا دورِ نبوی میں حدیث کا لکھا ہُوا ذخیرہ موجود تھا یا نہیں؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہاں موجود تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و اجازت بلکہ بعض حالات میں حکم سے احادیث کی کتابت و حفاظت کی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکینِ مکہ، قبائلِ عرب اور یہود سے کئی تحریری معاہدے کئے جنہیں باقاعدہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ اور ان پر فریقین کے دستخط اور مہریں ثبت ہوئیں۔ حدیث کی تعریف کی رُو سے یہ سب مواد حدیث ہی کا حصّہ ہے۔ اور حدیث و سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ ان معاہدوں میں سے صلحِ حدیبیہ، میثاقِ مدینہ اور دیگر کئی معاہدے مشہور ہیں۔ ابن عبد ربہ نے العقد الفرید میں بہت سے اشخاص اور قبائل عرب کو بخشے گئے مواثیق و معاہدات کو کئی صفحات میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح حضورؐ نے غیر مسلم امراء و رؤسا اور ملوک و حکام کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے جو محفوظ ہیں۔ سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے آپؐ نے بہت سے لوگوں سے خط و کتابت کی، بہت سے گورنروں اور حکام کو فرامین جاری کئے، یہ سب حدیث کا حصّہ ہیں۔ جنگِ بدر سے قبل آپؐ نے عبداللہ بن جحش کو ایک مختصر جماعت کے ہمراہ ایک سربمہر خط دے کر بھیجا اور حکم دیا کہ فلاں مقام پر پہنچ کر اسے کھولنا اور اس پر عملدرآمد کرنا۔ محصّلینِ زکوٰۃ کو آپؐ نے نصاب زکوٰۃ کی تحریریں بھیجیں تاکہ ان کے مطابق مختلف اموال کی زکوٰۃ وصول کریں۔ آپؐ کے زمانے میں کئی بار مردم شماری ہوئی اور اس کی رپورٹیں حضورؐ کے حکم سے مرتب کی گئیں۔ کئی صحابہ نے — مثلاً عبداللہ بن عمر و ابن العاص — آپؐ کے امر و اذن سے احادیث کا ذخیرہ آپؐ کی مجلس میں بیٹھ کر مرتب کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر جو خطبہ آپ نے ارشاد فرمایا تھا اسے ایک صحابی ابو شاہ یمنی نے تحریری شکل میں طلب کیا تو حضورؐ نے فرمایا: "اکتبوا لابی شاہ" (ابو شاہ کو یہ خطبہ لکھ کر دے دو) تعمیلِ ارشاد ضرور ہوئی تھی، اس میں تو مجالِ گفتگو ہی نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرو کے علاوہ دوسرے کئی اصحاب مثلاً علی بن ابی طالب، انس بن مالک، ابوموسیٰ اشعری، جابر بن عبداللہ انصاری اور عبداللہ بن عباس نے حضورؐ کے عہد میں احادیث لکھیں۔

عرب میں ظہورِ اسلام سے قبل قبائلی و بدوی زندگی کے باعث لکھنے پڑھنے کا رواج

بہت کم تھا۔ ابتداء اسلام میں قرآن کے علاوہ اور کچھ لکھنے پر پابندی لگادی گئی تاکہ خدا کی کتاب کے ساتھ کوئی اور چیز غلط ملط نہ ہونے پائے۔ جب بہت سے لوگ پڑھ لکھ گئے اور یہ خدشہ نہ رہا تو آپؐ نے کتابتِ حدیث کی اجازت دے دی۔ خود ایک شخص کی اس شکایت پر کہ اس کا حافظہ ذرا اچھا نہ تھا اور آپؐ کی باتیں یاد نہ رہتی تھیں، ارشاد فرمایا اِسْتَعِنْ بِیَمِیْنِکَ "اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو۔"

سفرِ ہجرت میں آپؐ کا عطا کردہ امان نامہ سراقہؓ بن مالک کے پاس محفوظ تھا۔ کئی لوگوں کو جاگیریں بخشیں اور تحریر لکھ کر دی۔ قبائل عرب کو بہت سے خطوط لکھوائے۔ غیر مسلموں، بالخصوص یہود کے ساتھ خط و کتابت رہتی تھی۔ اور چونکہ ان کی دیانت و امانت پر بھروسہ نہ تھا لہٰذا خطوط کو پڑھنے اور جواب دینے کی خاطر آپؐ نے ــــ جیسا کہ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے ــــ زیدؓ بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں عبرانی میں مہارت پیدا کر لی۔ اور اس کے بعد یہ خدمت انہی کے متعلق رہی۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کے یہ خطوط بھی ذخیرۂ حدیث ہی میں شامل ہیں۔ علامہ ابن عبدالبرؒ مالکی نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں حضورؐ کا یہ حکم درج کیا ہے کہ: قیدوا العلم بالکتاب "علم کو لکھ کر محفوظ کر لو۔" اس دور میں علم حدیث کا یہ سارا مواد منتشر یادداشتوں کی صورت میں لوگوں کے پاس موجود تھا۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ کسی شخص کے سوال پر اپنی تلوار کی نیام سے ایک تحریر نکال کر دکھائی تھی۔ جو حضورؐ نے انہیں قصاص اور خون بہا کے احکام پر لکھوائی تھی۔

عہدِ صحابہؓ میں روایتِ حدیث کا مدار عموماً زبانی یادداشتوں پر رہا لیکن بہت سے بزرگوں کے پاس اپنے اپنے مجموعے بھی موجود تھے۔ روایات میں حضرت ابوبکرؓ صدیق کے پاس بھی اس قسم کی ایک یادداشت کا پتہ چلتا ہے۔ لوگ روایتِ حدیث میں عموماً بڑی احتیاط کرتے تھے۔ کیونکہ ایک متواتر حدیث مَنْ کذب عَلَیَّ متعمداً فَلْیَتَبَوَّأْ مقعدہ مِنَ النَّار (جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے وہ جہنمی ہے۔) انہیں اس احتیاط پر مجبور کرتی تھی۔ تاہم حسب ضرورت حدیث بیان کی جاتی تھی۔ صحابہؓ میں زبانی یا بعض دفعہ تحریری روایتِ حدیث زیادہ تر ان حضرات نے کی ہے: ابوہریرہؓ، ابوسعیدؓ خدری، جابرؓ بن عبداللہ، انسؓ بن مالک ام المومنین عائشہ صدیقہؓ، عبدؓاللہ بن عباسؓ، عبدؓاللہ بن عمرؓ، عبدؓاللہ بن عمروؓ، عبداللہؓ بن مسعود خلفائےؓ راشدین کو خلافت کے معاملات سے کم فرصت ملی لہٰذا ان کی روایات ان بزرگوں سے کم رہیں۔ ایک سے لے کر سو تک احادیث بیان کرنے والے صحابہؓ بہت ہیں۔

تابعین کے دور میں منتشر یادداشتوں سے ابتدائی کتب مرتب ہوئیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دورِ خلافت میں سرکاری اہتمام سے جمع حدیث کا کام شروع کرایا مگر زندگی نے مہلت کم دی اور یہ کام سرکاری سرپرستی سے محروم رہ گیا۔ اس دور میں حجاز کے علاوہ عراق، شام اور یمن بھی روایت و تدوین حدیث کے مرکز بن گئے۔ تبع تابعین کے دور میں مؤطا امام مالکؒ مؤطا امام محمدؒ مسند شافعیؒ، کتاب الآثار ابی یوسفؒ، کتاب الآثار محمدؒ بن الحسن مرتب ہوئیں۔ کچھ اور کتابیں بھی ہیں جو بالعموم شائع نہیں ہوئیں۔ ان کے بعد مصنف عبدالرزاق صنعانی مسند بقی بن مخلد اندلسی وغیرہما کا زمانہ آیا اور پھر مسند احمد بن حنبلؒ جیسی جلیل القدر کتاب مرتب ہوئی۔ اور پھر صحاح کی مشہور کتب بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ پہلے ذخیروں کو چھانٹ کر لکھی گئیں۔ تیسری صدی جمع حدیث کی نہیں بلکہ تدوین کتب حدیث کی صدی ہے۔ جسے از راہ شرارت و عداوت اعداء اسلام نے "حدیث بنانے کی صدی" قرار دے رکھا ہے۔ آخر میں ایک حقیقت کا اظہار ضروری ہے۔ نقد و جرح حدیث پر علمائے اسلام نے جتنی محنت کی ہے اور جس قدر علوم اس ضمن میں مدون ہوئے ہیں۔ غیر مذاہب کی آسمانی کتابوں کی حفاظت و روایت میں اس کا سواں بلکہ ہزارواں حصہ بھی کام نہیں ہوا۔ بائبل کی کتابوں میں کوئی متصل مرفوع سند نہیں ہے۔ راویوں کو پرکھنے کے کوئی اصول و ضوابط نہیں ہیں۔ قرآن تو ایک معجزہ نبوی ہے ہی، ہماری حدیث و سنت کی کتابیں بھی دوسروں کی آسمانی کتابوں سے زیادہ مستند اور معتبر ہیں۔ اناجیل اربعہ کے مصنف گمنام ہیں، معلوم نہیں کون اور کیسے لوگ تھے۔ ہماری کتب حدیث کے جامع مشہور و معروف ثقہ اور عادل و ضابط ہیں۔ وہ اپنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہر حدیث کی سند بیان کرتے ہیں۔ راویوں کو جانچتے پرکھتے ہیں۔ کوئی راوی اگر مشکوک نظر آئے تو اس کی حدیث کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں۔ راویوں کے احوال، ان کے اساتذہ اور پھر ان کے اساتذہ در اساتذہ کے احوال کتب رجال میں جمع ہیں۔ علم جرح و تعدیل کی مدد سے ہر شخص کی قدر و قیمت اور اس کی روایت کا درجہ متعین ہے۔ یہ احتیاط اور محنت کہیں اور نظر نہیں آتی۔

تدوین فقہ و مکاتب فقہ

فقہ کا لفظی معنی ہے سمجھ بوجھ، عقل و فکر کی گہرائی۔ اصطلاح میں ان مسائل و احکام کے بیان کا نام ہے جو کتاب و سنت میں متعدد مقامات پر بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں سمیٹ کر ایک خاص ترتیب سے سجا دینا اور جہاں یہ دونوں خاموش ہوں وہاں اجتہاد و قیاس سے کام لے کر حکم نکالنا۔ اس

سے معلوم ہوا کہ فقہ کتاب و سنت ہی سے نکلی ہے۔ ان کے خلاف یا برعکس کسی تیسری چیز کا نام نہیں۔ قرآن و حدیث میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ (التوبہ)

(التوبہ) "سو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ان میں کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت پیغمبر کے پاس آکر رہے تاکہ دین کی گہرائی حاصل کر سکے۔"

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ (الحدیث) "اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اُسے دین میں فقاہت عطا کرتا ہے۔" یہ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے۔

فقہائے اسلام نے اپنی فقہی و قانونی زبان میں فقہ کی یہ تعریف کی ہے: فقہ وہ علم ہے جس میں ہمارے افعال کے بارے میں واجب، حرام، مستحب، مکروہ یا مباح ہونے کی حیثیت سے احکام الٰہی کو معلوم کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام کے قانونی احکام و نواہی کا نام فقہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد کی اجازت دی، بعض مسائل میں خود بھی اجتہاد کیا۔ آپؐ کے اصحابؓ میں وہ لوگ فقہا کہلائے جو خداداد سمجھ اور علمی استعداد کے مطابق کتاب و سنت سے احکام نکالتے تھے۔ اور جہاں ان سے فیصلہ کن حکم نہ ملے وہاں اجتہاد بھی کرتے تھے۔ حدیث و فقہ کی کتابوں سے ان کے یہ نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ چاروں خلفائے راشدین، عبداللہؓ بن مسعود، معاذؓ بن جبل، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ام المومنین عائشہ صدیقہؓ، ام المومنین ام سلمہؓ، انس بن مالکؓ، ابوہریرہؓ، ابوسعید خدریؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، سلمان فارسیؓ، جابرؓ بن عبداللہ، طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، عمرانؓ بن حصین، ابوبکرہؓ ثقفی، عبادہؓ بن صامت، ابوالدرداءؓ، معاویہؓ بن ابی سفیانؓ۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ چونکہ عرب میں پڑھنے لکھنے کا رواج کم تھا لہٰذا پڑھا لکھا اور صاحب فتویٰ ہونے کے باعث پہلے علماء کا نام قرآء رکھا گیا، آگے چل کر یہی نام فقہاء سے بدل گیا۔

خلافت راشدہ کے بعد اموی و عباسی دور میں بوجوہ فقہائے امت نے سرکاری سرپرستی سے بے نیاز ہو کر شرعی احکام کی تدوین اور اجتہاد و قیاس کا کام آزادانہ طور پر کیا۔ ان ادوار میں ہمیں اسلامی ممالک میں بہت سے فقیہ نظر آتے ہیں۔ مگر جن فقہا کے مسالک فقہ کو تدوین و ترتیب اور شہرت دوام نصیب ہوئی وہ ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ تھے۔ فقہ سے ان حضرات کے شغف کا بڑا باعث سلطنت کی وسعت اور نت نئے مسائل کا پیدا ہونا تھا۔ ہر قسم کے احوال میں ہر نئی مشکل کا حل تجویز

کرنا ضروری تھا کیونکہ اسلام خدا کا آخری دین، قرآن آخری کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تھے۔ اب کسی آسمانی ہدایت کا انتظار نہ تھا۔ کتاب، وسنت اور اجماع وقیاس سے ہی مسائل کو حل کرنا ضروری تھا۔ غیر مسلموں کو اعتراف ہے کہ مسلمانوں نے تشریع وقانون کے سلسلے میں ایسا کام کیا ہے جو بے مثال ہے۔ کسی دوسری قوم کے ہاں — یہودیوں میں بھی — فقہ وقانون پر وہ کام نہیں ہوا جو اہل اسلام کر سکے۔ ہر علاقے اور ہر دور کی کچھ منفرد قسم کی ضروریات بھی ہوتی ہیں۔ فقہائے اسلام نے تدوین فقہ اور مکاتب فقہ کے قیام کی صورت میں ایسا بے نظیر کام کیا ہے جو کسی بھی مہذب سلطنت کو چلانے کے لئے ہر زمانے میں مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں تشریع وقانون سازی کے ضمن میں ایک کارنامہ ایسا بھی ہے جس کی داد غیر مسلم علماء بھی دیئے بغیر نہیں رہ سکے، وہ کام ہے فن اصول فقہ کی ایجاد واختراع۔ کتاب وسنت کے مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے دلائل کو جمع کر کے ایک مدلل ومفصل علم وفن کی صورت گری کرنا واقعی جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہمارے فقہا کا یہ قابل فخر کارنامہ ہے۔ الموافقات، اصول بزدوی اور ان جیسی دوسری جلیل القدر کتابوں میں ایسے قواعد وضوابط منضبط کر دیئے گئے ہیں کہ قیامت تک ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے قانون کا وضع کر لینا اتنا مشکل کام نہیں، سوال یہ تھا کہ قانون سازی کی بنیادیں اور اس کے قواعد وضوابط کیا ہوں جنہیں اس مشکل کام میں مد نظر رکھا جائے۔

یوں تو امت مسلمہ میں دور تابعین سے لے کر اب تک بے شمار فقہا پیدا ہوئے مگر چار حضرات ایسے تھے جن کے نام پر مستقل مکاتب فقہ وجود میں آئے اور وسیع ذخیرہ کتب تیار ہوا۔ حنفی مکتب فکر امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت ۱۵۰ھ کی طرف منسوب ہے۔ انہوں نے بہت سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کی ایک جماعت تیار کی اور اپنی نگرانی میں ان سے بے شمار قانونی مسائل پر فیصلے کرائے۔ ان فیصلوں اور آراء کا مجموعہ فقہ حنفی کہلایا۔ ان کی جماعت میں ابو یوسف جیسے لوگ بھی تھے جو ہارون الرشید کے دور حکومت میں چیف جسٹس بلکہ وزیر عدل کے عہدے پر فائز تھے۔ محمد بن الحسن شیبانی نے فقہ حنفی کو کتابوں کی صورت میں مدون کیا۔ اس فقہ پر عقل وفکر اور شان اجتماعیت کا غلبہ ہے۔ شاید اسی سبب سے سالہا سال تک عظیم عباسی حکومت کا قانون رہ چکی ہے۔ حنفی کہلانے کے باوجود اس فقہ میں شاید ۱۵ فیصد سے زائد اجتہادات ابوحنیفہ کے نہیں ملیں گے۔ جو اصول حنفی جماعت نے وضع کئے تھے ان کی بنا پر جو بھی اجتہاد جب بھی

کیا جائے حنفی کہلا سکتا ہے۔ مالکی فقہ امام مالکؒ بن انس مدنی ۹۷ھ-۱۷۹ھ کی طرف منسوب ہے۔ وہ حدیث وفقہ کے عظیم امام تھے۔ اُن کے اصول کی رُو سے کتاب وسُنت کے بعد عمل اہلِ مدینہ کو شانِ اوّلیت حاصل رہی ہے۔ ان کی مشہور کتاب موطا ہے جس میں مرفوع احادیث کم اور ان کے فتوٰی کے ساتھ صحابہؓ و تابعین کے آثار زیادہ ہیں۔ یہ فقہ زیادہ تر افریقہ و اندلس میں پھیلی اور سلطنت کا دستور رہی ہے۔ اس فقہ کا طرّہ امتیاز مصلحتِ عامہ (مرسلہ) کا مسئلہ ہے جسے ہر زمانے میں اجتہاد کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ تیسرا مکتب فکر شافعی ہے جو امام محمد بن ادریس الشافعی ۱۵۰ھ-۲۰۴ھ کی طرف منسوب ہے۔ امام شافعیؒ نے امام مالکؒ اور محمدؒ بن الحسن سے علم حاصل کیا۔ ان کے زمانے میں حدیث کا ذخیرہ پہلے کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ صورت میں موجود تھا۔ ہر علاقے اور ممالک اسلامیہ کے ہر حصے کی احادیث جمع ہو چکی تھیں۔ امام شافعیؒ نے اس سارے مواد اور فقہ حنفی و مالکی کو پیش نظر رکھ کر بہت سے مسائل میں جدید اجتہاد و استنباط کئے۔ ان کی فقہ کا مرکز زیادہ تر مصر رہا ہے جہاں انہوں نے ایک عرصہ مقیم رہ کر وفات پائی۔ ان کا بڑا کارنامہ کتاب الام کے بعد اصولِ فقہ کی کتاب الرسالہ ہے۔ اس رسالے میں انہوں نے اجتہاد و استنباط اور قیاس کے اصول بیان کئے ہیں۔ بعد کے سب فقہاء اس کتاب کی اوّلیت اور افضلیت کے معترف رہے ہیں۔ چوتھا مکتبِ فکر حنبلیؒ ہے جو مشہور محدث و فقیہ امام احمدؒ بن حنبل ۱۶۴ھ-۲۴۱ھ کی طرف منسوب ہے۔ امام احمد نے عباسی معتزلی خلفاء مامون معتصم اور واثق کے دور میں ان کے ایجاد کردہ مسئلہ خلقِ قرآن کے سلسلے میں حکومت کا بڑی پامردی اور استقامت سے مقابلہ کیا اور آخر کار غالب آئے۔ اس بناء پر انہیں امام اہلِ سُنت کہا گیا ہے۔ وہ امام شافعیؒ کے واسطے سے مالکی و حنفی فقہ سے مستفید ہوئے اور ان کا اپنا ایک منفرد مسلک بنا جو حنبلی کہلاتا ہے۔ اس مسلک میں اجتہاد و استنباط کی نوبت کم آتی ہے اور ضعیف حدیث کے مقابلے میں اجتہاد و قیاس نہیں کیا جاتا۔ اس مسلک کو ابنؒ تیمیہ اور ابن القیم جیسے عظیم علماء و فقہا میسر آئے جنہوں نے اس مسلک کو چار چاند لگائے۔ اور اس اعتراض کو عملاً رفع کیا کہ حنبلی مذہب کوئی فقہی مسلک نہیں ہے۔

علم الکلام اور اس کا ارتقاء

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلفائے راشدین کے عہد میں اسلامی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ جوں جوں نئے ممالک فتح ہوتے گئے، ان میں اسلامی تعلیمات کچھ تو اپنی سادگی اور فطرتِ انسانی کے قریب تر ہونے کے باعث اور کچھ حکمران قوم کا دین و مذہب

ہونے کی وجہ سے پھیلتی رہیں اور لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ یہ لوگ اپنے آبائی مذاہب کے بعض عقائد و رسوم اور اپنی تہذیب و ثقافت کے مظاہر ساتھ لائے۔ اسلام اس معاملے میں خاصا لچکدار دین ہے۔ کہ جب تک کوئی عمل، عقیدہ یا رسم اس کے مبادی و اصول سے نہ ٹکرائے وہ لوگوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ نئے آنے والوں میں عجمی، رومی، مجوسی، پارسی، صابی، یونانی، بدھ، ہندو، لامذہب ترک، مانوی، مزدکی، غرض مختلف اقسام و اجناس اور مذاہب و ادیان کے لوگ تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے اختلاط سے زندقہ و الحاد کی تحریکیں اٹھیں۔ ان اقوام کے غلام اور لونڈیاں شاہی محلات اور امراء کے گھروں کی زینت بنیں۔ لونڈیاں بعض تو اپنے اصل دین پر رہیں۔ اور بعض نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے جو نسل پیدا ہوئی وہ آگے چل کر سیاست و معاشرت پر چھا گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کی اکثریت لونڈیوں کی اولاد تھی۔ اور تو اور علیؒ بن الحسینؓ (یعنی زین العابدین)، جو علماء و ائمہ دین میں ایک بلند مقام رکھتے تھے وہ بھی ایک ایرانی خاتون شہر بانو کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یہ خاتون خلافتِ فاروقیؓ میں مالِ غنیمت میں آئی تھیں۔ اسی طرح کئی ائمۂ فقہ و حدیث عجمی النسل تھے۔ بنی امیہ میں خالد بن یزید بن معاویہؓ کو یونانی فلسفے، ریاضی، ہیئت اور علمِ نجوم سے خاصی دلچسپی تھی۔ ابوجعفر منصور عباسی نے یونانی، ہندی، رومی اور عجمی فلسفے اور ادب و ثقافت کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرایا۔ اس طرح مسلمان دیگر اقوام کے علوم و فنون اور حکمت و فلسفے سے آشنا ہوئے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور مامون عباسی نے اسے بہت وسعت دی۔ اس نے یونانی، رومی اور عجمی ثقافت و آداب کی سرپرستی میں اپنے سب پیش روؤں کو مات کر دیا۔ مختلف تہذیبوں کے ملاپ، مختلف مذاہب کے میل جول، دیگر اقوام کے علوم کی وسیع اشاعت نے مسلمانوں میں نئے نئے خیالات کی ترویج کی اور بہت سے نئے فرقے پیدا ہو گئے۔ ان میں جبریہ، قدریہ، کرامیہ، معتزلہ، خوارج، روافض زیادہ مشہور ہوئے۔ ہر فرقہ پھر کئی اور فرقوں میں بٹ گیا۔ اور ہر طرف مذہبی اور فرقہ وارانہ بحثیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بعض فرقے محض سیاست کی پیداوار تھے۔ مگر بمرورِ ایام سے انہوں نے مذہبی جامہ اوڑھ لیا۔

مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک میں فارسی عنصر کے علاوہ کچھ تعداد یہودی کی اور کافی تعداد نصاریٰ کی بھی تھی۔ ان لوگوں کے اپنے مدارس تھے۔ اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی روایات تھیں۔ ان کے پاس اپنے مذہبی لٹریچر کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ یہودی تو ذرا کم آمیز نظر آتے ہیں مگر نصاریٰ مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے تھے۔ ان کے

تین مشہور فرقے تھے۔ جن میں تثلیث، حلول و اتحاد، تجسّم، الوھیت و ابنیتِ مسیح پر ہر وقت بحث و مناظرہ جاری رہتا تھا۔ ان فرقوں کے نام یہ ہیں: یعقوبی، نسطوری اور ملکانی۔ مصر و اسکندریہ، شام و فلسطین، نوبہ و حبشہ، افریقہ، سسلی، سپین، موصل، عراق اور فارس میں ان کی بڑی تعداد آباد تھی۔ مسلمانوں کا ان کے مناظرات و مباحثات اور فلسفیانہ الٰہیاتی مسائل سے متاثر ہونا بالکل قدرتی امر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے متعدد فرقوں کی مانند مسلمانوں میں بھی ذات و صفاتِ خداوندی، حشر و نشر، روح اور مادّہ جبر و قدر، اور انہی جیسے دیگر فلسفیانہ مسائل میں شدید اختلاف اور نزاع برپا ہوئی۔

عیسائیوں میں سنِ مسیحی کی ابتدائی صدیوں سے اسکندریہ کے مقام پر "جدید افلاطونیت" کے نام سے ایک فلسفی مذہب قائم چلا آتا تھا۔ اس مذہب کے الٰہیاتی فلسفیانہ خیالات سے بھی مسلمان خصوصاً معتزلہ اور صوفیہ شدید متاثر ہوئے۔ اس مذہب کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے، عالم کی ابتداء کیسے ہوئی؟ عالم قدیم ہے یا حادث؟ روح کی حقیقت کیا ہے؟ جسم کے ساتھ اتصال سے پہلے رُوح کہاں تھی اور جدائی کے بعد کہاں جاتی ہے؟ اس مذہب میں یونانی شرک و بُت پرستی کے عناصر شامل ہو گئے اور اس نے عیسائیت کا مقابلہ کیا۔ عیسائیت کے غلبے کے ساتھ ہی اس افلاطونی مذہب کے کچھ لوگ عیسائی ہو گئے اور انہوں نے یہ فلسفۂ عیسائی مذہب کا جزو بنا ڈالا۔ اسلام آیا تو مسلمان بھی اس فلسفی مذہب سے متاثر ہوئے جس کی مثال ہمیں اخوان الصفا اور معتزلہ اور بعض صوفیہ کے افکار و مبادی میں ملتی ہے۔

جدید افلاطونی فلسفے کا ترجمہ سریانی زبان میں بھی ہوا اور اسلامی مفتوحہ ممالک میں سے رُہا، نصیبین، انطاکیہ اور جندیساپور اس لٹریچر کے مرکز رہ چکے تھے۔ اسی لٹریچر کے ایک بڑے حصّے کو عربوں نے عربی کا جامہ پہنایا اور اس طرح یونانی افلاطونی مذہب کے خیالات مسلمانوں میں پھیلے۔ علاوہ ازیں منطق، طبعیات، طب اور ریاضی کی بہت سی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور مسلمانوں میں ان علوم و فنون کا شغف ترقی پذیر رہنے لگا۔ سریانی عنصر میں سے سب سے زیادہ جو لوگ مسلمانوں میں مشہور ہوئے وہ ابن دیصان اور سرجیس تھے۔ ابن دیصان ایک نئے مذہب کا بانی بھی تھا جو نصرانیت اور ثنویت کا مخلوطہ نظر آتا ہے۔ حافظ ابن حزم نے اپنی مشہور کتاب الفصل میں بار بار اس کا ذکر کیا ہے۔ اس سریانی لٹریچر نے بھی مسلمانوں پر گہرے اثرات ڈالے۔ کئی مسلم فرقوں اور صوفیہ میں ان کے فلسفے کی ملاوٹ نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ فارسی و عجمی ادب و شعر

نے مسلمانوں کو کافی متاثر کیا ہے، اگو یونانی ادب سے عرب کم متاثر ہوئے۔

اموی اور عباسی خلفا نے کئی عیسائیوں کو شاہی طبیب مقرر کیا تھا۔ ان اطبا میں ہمیں ایسے لوگ دکھائی دیتے ہیں جو بیک وقت طبیب اور فلاسفر تھے۔ شاہی محلات میں ان کی اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ امرا اور وزرا بھی ان سے طبی مشورے لیتے تھے۔ اس طرح ان کا سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں پر اثرانداز ہونا قابل تعجب نہیں۔ ان لوگوں میں مشہور تر ابن اثال، عبدالملک بن البجر کنانی (جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا) اور سرجویہ بہت مشہور تھے۔
غالی رافضی اور باطنی فرقے اپنے مذہبی عقائد میں یہودیت، مجوسیت، جدید افلاطونیت اور بعض نصرانی و یونانی تعلیمات سے بھی شدید متاثر ہوئے۔ ان میں بھی حلول و اتحاد، تجسیم جیسے عقائد پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابن حزم کی الفصل، شہرستانی کی الملل والنحل اور احمد امین مصری کی کتب کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ سُنّی و شیعہ اور خوارج کا اختلاف دیکھ کر ایک اور فرقہ پیدا ہوا جسے مرجیہ کہا جاتا ہے۔ اوّل اوّل یہ بھی ایک سیاسی نظریہ تھا مگر بعد میں خوارج و روافض کی مانند ایک مذہبی فرقہ بن گیا۔ انہوں نے بھی ایمان، کفر، مومن اور کافر کے بارے میں فلسفیانہ نظریات اختیار کرلئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے نجاتِ آخرت کے لئے صرف ایمان کو کافی قرار دیا اور کہا کہ: ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ایمان صرف قلبی اعتقاد کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص دل سے مومن ہے تو بظاہر یہودی و نصرانی یا بُت پرست بھی ہو جائے تو بھی نجات پائے گا۔ یہ عقیدہ خوارج کے اس عقیدہ کے بالکل برعکس تھا کہ گناہِ کبیرہ سے آدمی کافر و مرتد اور ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے۔

قدریہ فرقہ جو بالفاظ دیگر معتزلہ بھی کہلایا، اس بات کا قائل تھا کہ انسان پورا مختار ہے۔ اللہ تعالیٰ شر کا خالق نہیں بلکہ شر کی انسان خود تخلیق کرتا ہے۔ اس فرقے کا پہلا بیج معبد جُہنی اور غیلان دمشقی نے بویا۔ رافضہ کے عقائد میں بھی قدریہ و معتزلہ کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ ان کے بالمقابل ایک دوسرا فرقہ تھا جو جبریہ کہلایا۔ ان کے قول کے مطابق انسان مجبورِ محض ہے، کائنات کا سارا نظام جبر پر قائم ہے، انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اس فرقہ کا بانی جہم بن صفوان تھا۔ اس نے صفاتِ خداوندی کی نفی کی، قرآن کو مخلوق بتایا، جنت و دوزخ کا ثواب و عذاب دائمی نہیں ہوگا۔ بلکہ ان پر بھی فنا طاری ہو جائے گی۔ یہ دونوں فرقے بعد میں ناپید ہوگئے مگر ان کے عقائد و تعلیمات مسلمانوں کے کئی فرقوں میں پھیل گئیں مثلاً معتزلہ وغیرھم۔

معتزلہ کے اوّلین امام واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید تھے۔ معبد جُہنی کی طرح یہ بھی حضرت حسن بصری کے شاگرد تھے۔ مگر ان کا حلقۂ درس چھوڑ کر الگ ہو گئے اور اپنے نئے خیالات (مثلاً یہ کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہے نہ کافر، بلکہ ان دونوں کے بین بین ہے) کی اشاعت کرنے لگے۔ ان کا نام معتزلہ اس لیے رکھا گیا کہ یہ لوگ کبیرہ گناہ کرنے والے کو اسلام اور کفر دونوں سے الگ (معتزل) قرار دیتے تھے اور اسی مسئلے پر حسن بصری نے انہیں اپنے حلقۂ درس سے نکال دیا تھا۔ ایمان وکفر کے مسائل میں معتزلہ کا مسلک خوارج اور مرجیہ کے وسط میں تھا۔ تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ مرجیہ و جبریہ کی طرح خوارج بھی آہستہ آہستہ اپنی انتہا پسندی اور خانہ جنگی کے باعث تقریباً ختم ہو گئے، لیکن فرقہ معتزلہ کو عروج حاصل ہوا اور آگے چل کر عباسی دور میں یہ لوگ مشہور فتنۂ خلق قرآن کو اٹھانے اور اس کی خاطر وسیع قتل و غارت اور ظلم و تشدد کا سبب ثابت ہوئے۔ انہیں خاص مذہبی عقائد کی بنا پر اموی دور میں بھی کسی سرکاری رکاوٹ یا ناراضگی کا نشانہ نہیں بننا پڑا۔ مگر عباسیوں نے تو ان کی کھلی سرپرستی کی۔ خلیفہ ابوجعفر منصور کا عمرو بن عبید کا معتقد اور اس کے علم و فضل کا معترف ہونا اظہر من الشمس ہے۔ بعد کے حکمرانوں میں سے مامون معتصم اور واثق کھلے معتزلی تھے۔ معتزلہ اہل العدل والتوحید کہلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے تھے۔ انسان کو مختار مانتے تھے۔ خلق قرآن کے قائل تھے۔ اور مرتکب کبائر کو نہ کافر نہ مومن بلکہ بین بین شمار کرتے تھے۔ اموی خلفاء میں سے یزید بن الولید اور آخری خلیفہ مروان بن محمد دونوں معتزلی تھے۔

معتزلہ نے فلسفۂ یونان سے استفادہ کیا اور اسے اپنے بحث و مناظرات میں خوب خوب استعمال کیا۔ ان کے عظیم ائمہ میں ابوالہذیل علاف، نظام اور الجاحظ زیادہ مشہور ہوئے۔ ان لوگوں نے فلسفۂ یونان کو اپنے عقائد کے رنگ میں ڈھال کر ایک نیا فلسفہ ایجاد کیا جسے علم الکلام کا نام دیا گیا۔ اسی علم کلام کے بل پر انہوں نے اپنے مسلم مخالفین کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور دہریہ و مجوس کو زیر کیا۔ یہ غیر مسلم اپنے فلسفیانہ خیالات سے مسلم عوام و خواص کے لئے باعث پریشانی تھے۔ انہوں نے اسلام کے خلاف شکوک و شبہات اور اعتراضات کا انبار لگا دیا۔ معتزلہ نے ان کا شدید مقابلہ تو کیا مگر مسلمانوں میں بھی افتراق و تشتت کا گہرا بیج بو دیا۔ ان کے خاص عقائد اور فلسفی آراء کے باعث مسلم عوام اُن سے متنفر رہتے۔ مسلمانوں کا ادب (نظم و نثر) بھی اس فلسفیانہ فرقہ بازی سے متاثر ہوا۔

عباسیوں نے بنی اُمیہ کا تختہ الٹنے کے لئے جن عناصر سے زیادہ تر کام لیا وہ عجمی تھے۔

انقلاب حکومت کے بعد ایک طرف عباسیوں اور ہاشمیوں میں شدید چپقلش شروع ہو گئی تو دوسری طرف عجمی، ہندی اور یونانی تہذیبوں نے مسلم عوام و خواص پہ اپنے دُور رس اثرات ڈالنے شروع کر دیئے۔ عباسیوں نے اپنی ہوشیاری سے ہاشمیوں کے ساتھ اپنی اندرونی سیاسی کشمکش کو شیعہ سُنّی رنگ دے دیا۔ یوں ہاشمیوں پہ ان کے مظالم (جو در اصل بنی اُمیہ کے مظالم سے کسی طرح کم نہ تھے) مذہب کے پردے میں چھپے رہے۔ عجمی عناصر نے اپنی سیاسی مایوسی و ناراضگی کو رفض و تشیّع کے پردے میں چھپا لیا۔ یوں ایک خالص سیاسی جنگ نے "خالص مذہبی" رنگ اختیار کر لیا۔ اموی دَور کی فلسفیانہ مناظرہ بازی نے اس دَور میں خوب ترقی کی۔ فرقۂ معتزلہ کو پنپنے اور نشو و نما پانے کا کھلا موقع ہاتھ آ گیا۔

اس دَور میں علم و فن، تہذیب و ثقافت اور فلسفہ و منطق کی ترقی کے ساتھ الحاد اور زندقہ بھی ایک فتنہ بن کر نمودار ہوا۔ فلسفہ یونان اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ اور ہر طرف بحث و مناظرہ کی مجالس برپا تھیں۔ ہر اسلامی و غیر اسلامی فرقہ فلسفہ و منطق کے اسلحہ سے لیس تھا۔ عالم اسلام کے مرکزی شہر مختلف اور متضاد تہذیبوں کے سنگم بن چکے تھے۔ ان حالات میں الحاد اور زندقہ کا کھلا ظہور قابلِ تعجب نہیں تھا۔ ابو العلاء معرّی نے اپنے رسالۃ الغفران میں کئی شعراء و ادباء، سیاستدانوں، حکومت کے عہدیداروں اور صوفیوں کا نام زنادقہ میں شمار کیا ہے مثلاً دعبل شاعر، بشار بن برد، ابو نواس، صالح بن عبد القدوس، ابو مسلم خراسانی (دولت عباسیہ کا اصل بانی)، بابک خرمی، افشین اور حلاج صوفی۔ معرّی کی اس فہرست میں برامکہ ابن المقفع اور کئی دوسرے لوگوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی ثقافت کے ہندی ثقافت کے ساتھ میل جول کے باعث کئی مسلم فرقوں میں ہندوؤں کے فلسفیانہ عقائد کا اثر نظر آتا ہے۔ مثلاً احمد بن حائط، ابو مسلم خراسانی، قرامطہ، ابن زکریا رازی تناسخ ارواح کے قائل تھے۔ بہت سے شیعہ فرقے جن کا ذکر ابن حزم اور شہرستانی نے کیا ہے۔ تناسخ پہ ایمان رکھتے تھے۔ عبد اللہ بن سبا یہودی کا بھی ـــ جو اس دور سے پہلے ہو چکا تھا، تناسخ پہ توہی ایمان تھا، نصیریہ فرقہ بھی تناسخ کا قائل تھا۔ جریر بن حازم ازدی ہندوؤں کے سومناتی فرقے جیسے عقائد رکھتا تھا۔ مختار بن عُبید ثقفی نے یہود کا عقیدہ بدآء اختیار کر لیا تھا۔ اس کے بعد اہلِ تشیّع کے کئی اور فرقے اس کے قائل رہے ہیں معلوم رہے کہ نسخ جو ہمارے ہاں بعض احکام میں ہوا ہے اس کا باعث بدآء نہیں تھا۔ بدآء کا عقیدہ موجودہ بائبل کی پہلی کتاب میں طوفانِ نوحؑ کے سلسلے میں یوں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کا شرک و کفر دیکھا تو وہ تخلیق آدمؑ پہ پچھتایا اور اپنے پہلے فیصلے بدل ڈالے۔ اسی طرح

رجعت کا عقیدہ جو یہود و نصاریٰ میں مشہور ہے یہ بھی بعض مسلمان فرقوں ـــ مثلاً غالی شیعوں ـــ نے اختیار کر لیا۔

خلقِ قرآن جو معتزلہ کا مشہور عقیدہ ہے اس کی تاریخ علامہ ابن الاثیر نے یوں بیان کی ہے کہ احمد بن ابی دواد (جو مامون کا قاضی القضاۃ تھا) نے خلقِ قرآن اور معتزلہ کے دیگر عقاید بشر مریسی سے حاصل کئے، بشر نے جہم بن صفوان سے (جس کا ذکر اوپر گزرا)، جہم نے جعد بن درہم سے، جعد نے ابان بن سمعان سے، ابان نے طالوت سے جو لبید بن اعصم کا بھانجا اور داماد تھا، طالوت نے یہ عقیدہ لبید بن اعصم یہودی سے لیا جو خلقِ تورات کا قائل تھا اور جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا۔ ابن عبدربہ نے العقد الفرید میں امام شعبی کا قول نقل کیا ہے کہ امامِ منتظر کا عقیدہ یہود کے عقیدہ مسیح منتظر سے ماخوذ ہے۔ علی بن ابی طالب نے ان غالی روافض کو آگ میں جھونک دیا تھا لیکن جبر بھی وہ انہیں خدا تک ماننے سے باز نہ آئے۔ یہود کے نزدیک مسیح منتظر کے خروج تک جہاد فی سبیل اللہ منقطع ہے یہی عقیدہ غلاۃ روافض کا بھی ہے کہ جب تک امام مہدی منتظر نہ خروج کرے جہاد فی سبیل اللہ بند ہے۔ اسی طرح یہود کی مانند غلاۃ بھی تحریفِ قرآن کے قائل ہوئے ہیں۔ یہود نے جبرئیل کو اپنا دشمن قرار دیا تھا ان غالی روافض نے بھی کہا کہ جبرئیل غلطی سے وحی علی کے بجائے محمد پر لاتا رہا معاذ اللہ منہ علیٰ ھذا القیاس خدا کے ساتھ مخلوق کی تشبیہ کا عقیدہ بھی یہود سے بعض مسلمان فرقوں میں داخل ہوا۔

یہود کی مانند نصاریٰ بھی بعض مسلمان فرقوں پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یونانی فلسفے کے ماہر تھے۔ اور انہوں نے یونانی و رومی ثقافت اور مشرک مذاہب سے متاثر ہو کر تثلیث و تجسیم، حلول و اتحاد، ابنیت والوہیتِ مسیح کے عقاید اختیار کر لئے تھے۔ اسکندریہ شام و عراق اور فلسطین میں ان کے کئی مدارس موجود تھے۔ جن میں طب و نجوم کے علاوہ فلسفہ ریاضی، منطق و ھیئت کی تعلیم ہوتی تھی۔ فرقہ معتزلہ اپنے قدری عقاید میں نصاریٰ سے متاثر ہوا ہے۔ اسی طرح صفاتِ الٰہیہ کے مسائل میں بحث و تمحیص بھی ان میں اسی راہ سے داخل ہوئی۔ اسی طرح بعض صوفی فرقوں میں رھبانیت کے رجحان کا منبع بھی نصرانیت تھی۔

اس تمام گفتگو کے بعد قاری کے ذھن میں ایک سوال پیدا ہو گا کہ اموی و عباسی سلطنت میں فلسفی و منطقی علوم کی اس شہرت، و اشاعت، نئے نئے فرقوں کے ظہور معتزلہ وغیرہ کی ان ترکتازیوں سے کیا عامتہ اھلِ اسلام بے خبر تھے؟ مسلمانوں میں ہمیشہ اہلِ سنت و جماعت کی عظیم کثرت رہی ہے۔ ان کے علما و ائمہ کیا کرتے رہے ہے؟ اس کا جواب بڑا آسان

ہے۔ علمائے اسلام نے دینی علوم ۔۔۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ ۔۔۔ کو مرتب کیا۔ مدارس و جوامع میں ان کی تعلیم دی۔ جہاں ضرورت پیش آئی دوسرے فرقوں سے بحث و مناظرہ بھی کیا۔ بڑے بڑے ائمہ فقہ خود متکلم ہوئے ہیں۔ مثلاً امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت نے علمِ فقہ کی طرف توجہ کرنے سے قبل علمِ کلام و عقائد میں مہارت حاصل کی۔ ان کے علاوہ دوسرے اکثر مجتہدین کلامی مسائل سے پوری طرح آشنا تھے مگر انہوں نے معتزلہ اور دیگر فرقوں کی مانند سارا زور صرف بحث و جدل پر صرف نہیں کیا بلکہ اس کی طرف بلا ضرورت کم ہی توجہ کی۔ ویسے ہم تفاسیر میں معتزلہ کا ردّ بڑی تفصیل سے پاتے ہیں۔ اسی طرح علمِ عقائد پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ کلامی مسائل پر زیادہ تر کلام ہمیں امام ابوالحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی، امام فخر الدین رازی، امام ابن حزم اندلسی اور علامہ عبدالکریم شہرستانی کے ہاں ملتا ہے۔ امام غزالی نے بھی اس سلسلے میں خاصا ضخیم کام چھوڑا ہے۔ آخر میں ہم علامہ ابن خلدون کے مشہور مقدمۂ تاریخ سے علم الکلام پر ایک جامع مگر مختصر نوٹ پیش کرتے ہیں (محض بطور خلاصہ)

علامہ لکھتے ہیں کہ "علم الکلام" سے مراد وہ علم ہے جس میں دینی عقائد کا اثبات، اور بدعتی فرقوں کا ردّ عقلی دلائل سے کیا جاتا ہے۔ بدعتی وہ لوگ ہیں جو اعتقادات میں سلف صالحین اور اہل سنت کے طریقے سے منحرف ہو گئے تھے۔ دین کا سب سے بڑا بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ بدعتی فرقوں نے یہود و نصاریٰ اور دیگر مذاہب باطلہ سے متاثر ہو کر اسی عقیدے میں گڑبڑ کی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ادراک میں عقل و ذہن حیران ہو جاتا ہے۔ وہ ذاتِ اعلیٰ و برتر گو اپنی صفات و افعال سے دنیا و کائنات کے ذرّے ذرّے سے ظاہر و ہویدا ہے مگر انسانی حواس کی گرفت سے بالاتر ہے۔ ہماری عقل رہنمائی کرتی ہے کہ دنیا کی ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہے۔ ہم ایک سبب سے دوسرے پھر تیسرے تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ جب دنیوی و مادی اسباب کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو لازماً ہمارے دریافت کیے ہوئے آخری سبب کا بھی کوئی اور سبب ہو گا اور پھر ان تمام اسباب کا ایک مسبّب ہونا لازم ہے جو از خود موجود ہو حیّ و قیوم ہو اور کسی دوسرے خالق کا محتاج نہ ہو۔ پیغمبروں نے اس سے آگے بحث و تمحیص سے منع کر دیا کیونکہ کوئی فلسفہ یا سائنس ہمیں اس سے آگے نہیں لے جا سکتی۔ ہاں، پیغمبروں کا صدق و امانت، ان کا علم و عمل اور تقویٰ مان لینے کے بعد منزل آسان ہو جاتی ہے۔ جو بات ہماری عقل سے بالاتر ہو اسے پیغمبروں کے بھروسے پر مان لیا جائے۔ توحیدِ الٰہی کی مانند رسالت، آخرت، بعث بعد الموت، حشر و نشر، عذاب و ثوابِ قبر اور جنت و

و دوزخ ایسی چیزیں ہیں جن کے ادراک کا کوئی مادی ذریعہ نہیں۔ یہاں لازماً اس علم و فن کے ماہرین ـــ انبیاء و رسل پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ جو باتیں ہماری عقل و فکر سے بالاتر ہوں ان کا خلافِ عقل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اسلامی عقاید مشاہدے اور حس کے خلاف نہیں ہیں نہ عقل سلیم کے خلاف ہیں۔ ساری دنیا سے زیادہ عاقل و فہیم نبی اور رسول ہوتے تھے۔ ان کی عقل و فہم ان کی کتابوں، تعلیمات،، اقوال و افعال اور انسانیت کی صلاح و فلاح کے لئے کی گئی ان کی خدمات سے ظاہر و باہر ہے۔ پس جو بات ایک کمزور عقل والے کی سمجھ میں نہ آئے وہ اسے اپنے سے اعلیٰ تر عقل والے سے سن کر مان لے تو نہیں کہا جائے گا کہ اس نے خلافِ عقل بات مانی ہے۔

فلسفۂ یونان کی نشر و اشاعت اور غیر مذاہب والوں سے میل جول کے باعث بہت سی خلاف اسلام باتیں مسلمانوں میں رائج ہو گئیں۔ بہت سے بدعتی فرقے پیدا ہو گئے۔ ان کا ردّ کرنے کے لئے علماء اسلام نے انہی ہتھیاروں سے کام لیا۔ جن سے وہ باطل پرست مسلح تھے۔ یہ ہتھیار اسلام کی سان پر چڑھ کر اور بھی تیز اور کار آمد بن گئے۔ علمائے اسلام نے صفاتِ خداوندی کا مسئلہ انہی دلائل و براہین سے ثابت کیا جن کو اسلام کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا۔

صفاتِ خداوندی کے مسئلے میں وارد ہونے والی بعض آیات، و احادیث متشابہات میں داخل تھیں۔ انہی کو گمراہ فرقوں نے اپنی ضلالت کے ثبوت میں پیش کیا جیسا کہ کلمۃ اللہ، روح اللہ وغیرہ کے الفاظ سے اور عیسیٰؑ کی بن باپ، پیدائش سے نصاریٰ نے ابنیت و الوہیتِ مسیحؑ کا استدلال کیا تھا۔ حالانکہ بیت اللہ، ناقۃ اللہ، کتاب اللہ، بقیۃ اللہ کے الفاظ اس کی صحیح تشریح میں کافی ہیں۔ اسی طرح آدمؑ کے بارے میں: وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي کا لفظ موجود ہے۔ اور آدمؑ کی بلا والدین پیدائش پر سب کا اتفاق ہے۔ پس علمائے اسلام نے عقلی دلائل سے نقلی مسائل کو ثابت کیا اور ضلالت زدہ لوگوں کے شکوک و شبہات اور اعتراضات کو ردّ کیا۔

خود قرآن و حدیث میں اسلامی عقاید کا عقلی اثبات موجود تھا۔ جس سے فقہا کو جرأت پیدا ہوئی کہ مخالفین کے ردّ کے لئے خود انہی کے فلسفے کو استعمال کریں۔ آئمہ سلف نے ان آیاتِ متشابہات پر گفتگو نہیں کی تھی لیکن جب گمراہ فرقے اٹھے اور انہوں نے عقلی دلائل سے اپنے مذموم مقاصد پورے کرنے کی کوشش کی تو علم الکلام و العقائد ایجاد ہوا تاکہ دشمن کا جواب، اس کے دلائل و شواہد اور فلسفے اور منطق سے دیا جائے۔

امامت کا مسئلہ جن معنوں میں گمراہ فرقوں نے پیش کیا وہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن چونکہ بہت سے اہل بدعت مثلاً خوارج، روافض اور معتزلہ وغیرہ اس پر بحث و مناظرہ کرتے تھے لہذا علمِ عقائد کی کتابوں میں اس پر بھی مفصل اور مدلل بحثیں کی گئیں۔ علم کلام کے امام ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر باقلانی، امام الحرمین ابوالمعالی، امام ابوحامد الغزالی، ابن الخطیب وغیرہ تھے۔

علامہ ابن خلدون کی فہرست میں امام ابوالمنصور ماتریدی اور امام طحاوی حنفی کا بآسانی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور نام ہم نے اوپر گنوائے ہیں۔

تصوف اور اس کا نشو و نما

جس طرح فلسفے کی دو قسمیں ہمارے اوپر کے بیان سے واضح ہوئیں، ایک اسلامی فلسفہ جو علم الکلام والعقائد کے نام سے ہوا اور دوسرا غیر اسلامی فلسفہ مثلاً یونانی فلسفہ، ایرانی فلسفہ، ہندو فلسفہ وغیرہ۔ اسی طرح تصوف کو بھی دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم خالص اسلامی تصوف ہے۔ جو حدیث نبوی میں وارد ہونے والے لفظ احسان سے ثابت ہے۔ اس کو خلوص و تقویٰ، حب فی اللہ اور شرع محمدی پر چلنے کا طریقہ — طریقت و حقیقت — کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ پہلے تصوف نے مسلمانوں میں رہبانیت، الحاد اور باطنیت پھیلائی اور اس کے بطن سے کئی جدید فرقے پیدا ہوئے۔ دوسرا تصوف کتاب و سنت پر عمل کرنے والوں کا ہے۔ اس نے مادہ پرستی، حبِ دنیا، خواہشاتِ نفس کا اتباع اور غیر قوموں سے درآمد ہونے والے غیر اسلامی عقائد و اعمال کا شدید رد کیا۔

تصوف کا لفظ کتاب و سنت یا آثارِ صحابہ و تابعین میں ہمیں نہیں ملتا۔ اس کا مادہ صفا یا صُفّہ بتایا گیا ہے مگر اس صورت میں لفظ کی شکل کچھ اور ہونی چاہیئے تھی۔ دراصل یہ لفظ صوف (بمعنی اُون) سے ماخوذ ہے۔ صوف انبیاء، صحابہ، تابعین اور صلحاء کا لباس رہا ہے۔ صوفی چونکہ صوف کا لباس پہنتے اور سادہ زندگی گزارتے تھے۔ لہذا وہ صوفی کہلائے اور اس سے لفظِ تصوف بنایا گیا۔ حدیثِ جبرئیل میں حضورؐ نے احسان کی تعریف یوں فرمائی ہے:

"احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اتنے خلوص اور عاجزی سے کرے گویا اللہ کو سامنے دیکھ رہا ہے کیونکہ اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے دیکھتا ہے" گویا حضورِ قلب، خلوص، خشوع و خضوع اور استحضار کے ساتھ عبادت کا نام احسان (بالفاظِ دیگر تصوف) ہوا۔ یہی باعث تھا کہ اصلی صوفیوں — مثلاً خواجہ حسن بصریؒ، جنید بغدادیؒ، بایزید بسطامیؒ

عبدالقادر جیلانی، شہاب الدین سہروردی اور بہاؤ الدین نقشبند نے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب و روح کو تصوف اور مغز شریعت قرار دیا ہے۔ برعظیم ہند و پاکستان میں بڑے بڑے صوفیاء و علماء گزرے ہیں جنہوں نے اسلامی تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دیا۔ اشاعتِ اسلام میں ان لوگوں کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف کے علاوہ یہاں شیخ احمد سرہندی، خواجہ باقی باللہ دہلوی، علی بن عثمان ہجویری، بابا فرید جیسی قدآور شخصیتیں نظر آتی ہیں جو اسلامی شرع اور دینی علم و عمل کی علمبردار تھیں۔ شیخ احمد سرہندی تو بہر حال مجدد الف ثانی تھے۔ اور ان کا کارنامہ تجدید ردِ الحاد و باطنیت اور اصلاحِ تصوف کو محیط تھا۔ مگر شاہ ولی اللہ کے علاوہ اس ملک میں صحیح اسلامی تصوف کے علمبرداروں میں ہمیں سید احمد شہید رائے بریلوی، سلطان الاولیاء خواجہ نظام الدین دہلوی، خواجہ معین الدین چشتی، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، سید جلال الدین بخاری جیسے بزرگوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔

اسلام میں ہندوؤں کے وحدت الوجود، یوگ اور رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ کتاب و سنت کی تعلیمات اس ضمن میں بالکل واضح اور صریح ہیں۔ صوفیوں میں ہمیں تیسری صدی کی ایک مشہور متنازعہ فیہ شخصیت حسین بن منصور حلاج کی ملتی ہے۔ اس کی کتاب "طواسین" سے ان لوگوں کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ جنہوں نے حلاج کو شعبدہ باز، جادوگر اور باطنی فرقے کا داعی قرار دیا ہے۔ اسی جرم میں اسے قتل بھی کیا گیا۔ احمد امین مصری کی تحقیق کے مطابق حلاج نے ہندوستان کا سفر کیا اور جادو کی تعلیم حاصل کی۔ اماموں کے مرکز قم کی زیارت کی اور اپنے آپ کو امام منتظر کا وکیل قرار دیا تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا زندقہ و الحاد کی تہمت اس کے ساتھ گئی۔ شیعہ امامیہ کے باطنی فرقے کی دعوت کو پھیلانے کے لئے اس نے کئی سفر اختیار کئے تھے۔ مگر حیرت ہے کہ شیخ فرید الدین عطار اور مولانا جلال الدین رومی جیسے صوفی بزرگوں نے حلاج کی طرف سے یہ معذرت پیش کی ہے کہ غلبۂ شوق اور وجد و سکر کی حالت میں خلافِ شرع الفاظ اس کی زبان سے نکل گئے تھے۔ ان کی اگر تاویل کی جاتی تو بہتر ہوتا۔ لیکن ان حضرات کی دلیل اگر تسلیم کر لی جائے تو مسلمانوں کے مسلّمہ متشرع صوفیوں ــــ بایزید بسطامی اور جنید بغدادی ــــ سے بھی وجد و شوق اور سکر کی حالت میں بعض خلافِ شرع الفاظ کا صدور ثابت ہوتا ہے۔ پھر کیا سبب ہے کہ ان حضرات کو نہ تو ملحد و زندیق قرار دیا گیا اور نہ ان کے قتل کا فتویٰ صادر کیا گیا؟

حلاج کی طرف طواسین کے علاوہ نصف درجن کے قریب کتابیں منسوب ہیں مثلاً

کتاب العدل والتوحید، علم البقاء والفناء، کتاب طوٰسین وغیرہ۔ ان کتابوں میں حلول واتحاد اور توحید ادیان جیسے ہندوانہ اور ملحدانہ خیالات پائے جاتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے یکسر خلاف ہیں۔ جس شرک کے رد اور جس توحید کے اثبات کے لئے لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتابیں نازل کی گئیں، بے پناہ تکالیف ومصائب پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں پر آئے، بے شمار انسان قتل ہوئے۔ کیا وہ شرک کا رد اور وہ توحید قرآن وحدیث سے اخذ کی جائے گی یا ان کتابوں سے جن میں حلول واتحاد اور وحدت ادیان کی تعلیم پائی جاتی ہے؟ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم توحید تو بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس میں ہمیں ان عقائد واوہام کے رد کے سوا اور کچھ نہیں ملتا جو حلاج کی طرف منسوب ہونے والی کتب میں درج ہیں۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی شخصیت اور ان کا تصوف وحکمت بھی مسلم علماء وفقہاء بلکہ خود صوفیاء میں بھی متنازعہ فیہ چلے آتے ہیں۔ ان کی تصانیف فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم بڑے گہرے رموز وکنایات، اور دقیق وغامض خیالات سے پُر ہیں۔ ان کے خلاف جس مسئلے کے باعث سب سے زیادہ شور وغل اٹھا وہ ان کا وحدت الوجود کا مسئلہ ہے۔ یہ کوئی اسلامی مسئلہ نہیں۔ کتاب وسنت اور آثار صحابہ وتابعین کے علاوہ علم عقائد وکلام کی کتابوں میں توحید الٰہی کا جو صاف اور واضح بیان ہے۔ یہ مسئلہ اس کے یکسر خلاف جاتا ہے۔ اس مسئلے کا وجود ہمیں ہندو تعلیمات میں ملتا ہے۔ اور علمائے اسلام نے اس کا ہمیشہ کھلا رد کیا ہے۔ ابن عربی کا رد کرنے والے علماء، فقہاء اور محدثین میں ہمیں حافظ ابن تیمیہ، علامہ ابن خلدون اور امام ابن حجر عسقلانی کے چمکدار نام بھی نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی طرف سے معذرت کرنے والے اور کھینچ تان کر بذریعہ تاویل ابن عربی کے خیالات، کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنے والے حضرات میں امام فخر الدین رازی اور علامہ جلال الدین سیوطی کے بڑے بڑے نام بھی ملتے ہیں۔ ایک بات تو بالکل واضح اور ناقابل انکار ہے کہ ابن عربی نے رمز وکنایات کی فلسفیانہ زبان استعمال کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔

ہمارے ناقص خیال میں اسلامی تصوف کا مقصد مادہ پرستی اور نفس پروری کی مخالفت، باطن کا تزکیہ، اخلاق وآداب کی صفائی، دنیا پرستی سے گریز اور دور صحابہ کی اسلامی سادگی کا احیاء تھا۔ مسلم سلطنت کے وسیع وعریض ہو جانے سے مسلمانوں میں عیش پسندی اور دنیا سے رغبت پیدا ہو گئی۔ اس کا مقابلہ کرنے کی خاطر صوفی حضرات

نے زاہدانہ زندگی اختیار کی اور اسی کا درس دیا۔ عوام کے باطنی تزکیے کی خاطر انہوں نے آبادیوں سے ذرا فاصلے پر ڈیرے ڈالے اور خانقاہیں بنائیں جن میں اپنے شاگردوں اور مریدوں کو اپنی زیر نگرانی رکھ کر شوقِ آخرت، حبِ خداوندی، حبِ رسولؐ اور پاکیزگی عقیدہ وعمل کی مشق کرائی۔ پھر ان شاگردوں کو دور دراز علاقوں میں تبلیغ دین اور تربیتِ عوام کے لئے روانہ کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی عوام کو دھوکہ دینے اور اپنے خلافِ اسلام مقاصد کی خاطر کچھ دوسرے لوگوں نے تصوف کا جامہ اوڑھ لیا۔ عوام ان لوگوں کی دسیسہ کاریوں سے ناواقف تھے، انہوں نے چھلکے کو مغز سمجھ لیا اور کچھ لوگ ان جھوٹے صوفیوں کے ہمرنگ زمین جال میں پھنس گئے۔ دین کی اصل اور بنیادی تعلیمات محفوظ ہیں اور رہیں گی لہذا ہر دور میں ان جھوٹے مدعیانِ تصوف کو بالعموم وہی مقام حاصل رہا جس کے وہ دراصل حقدار تھے۔

آخر میں ہم صحیح صوفیوں کے کچھ نام پیش کرتے ہیں: اویسؒ قرنی، حسنؒ بصری، مالکؒ بن دینار، ابراہیمؒ بن ادھم، شقیقؒ بلخی، رابعہ بصریہ، معروفؒ کرخی، جنیدؒ بغدادی، سریؒ سقطی ابوسلیمانؒ دارانی، ذوالنونؒ مصری، سہلؒ تستری، ابویزید بسطامی، ابوبکرؒ شبلی، امام غزالیؒ ابنؒ تیمیہ، ابنؒ القیم، سید عبدالقادرؒ جیلانی، عمر بن عبدؒ اللہ سہروردی، ابوالحسنؒ شاذلی، جلال الدینؒ رومی، عبدالوہابؒ شعرانی، سید عبدالعزیزؒ دباغ۔ برصغیر پاکستان و ہند کے مشہور صوفی بزرگوں کے نام اوپر گزر چکے ہیں۔

تجدید واحیائے دین کی تحریکیں

اسلام اللہ تعالیٰ کا دائمی و کامل دین ہے جسے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا۔ اب ہدایتِ ربانی کے لئے کسی جدید پیغامبر کی ضرورت نہیں۔ زندگی ہر دم رواں دواں اور متحرک عمل کا نام ہے۔ انسان نے بے شمار مادی انکشافات و ایجادات کی ہیں اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ ہر دور اور ہر ملک میں انسانی تغیر پذیر ضروریات کا ساتھ دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فقہ و تجدید کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ فقہاء ہر دور میں اپنے اجتہادات کے ذریعے سے زندگی کی ضروریات پوری کرتے رہے ہیں۔ اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ باطل قوتیں شروع سے ہی پورے ساز و سامان اور پورے عزم و حزم کے ساتھ اسلام پر حملہ آور رہی ہیں۔ دین حق کو آمیزشوں کا اکھاڑا بنانے کی ہر دور میں کوشش ہوتی رہی ہے۔ اس امت میں اللہ تعالیٰ نے بدعات، والحاد کی ملاوٹ سے دین کو پاک و صاف رکھنے کے لئے اربابِ عزیمت و تجدید کی موجودگی کا اہتمام فرمایا ہے۔ یہ شجاع انسان جذبۂ حق سے معمور تھے اور بڑی ہمت اور صبر واستقامت کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے رہے ہیں۔

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بر سرِ حق جماعت کی ہمیشہ موجودگی کی خبر دی ہے جو باطل سے لڑتی اور غلبہ پاتی رہے گی۔ یہ بھی فرمادیا ہے کہ ہر قرن میں (ہر صدی میں) مجدّدین ملت دین کو تر و تازہ اور سرسبز و شاداب رکھنے کی سعی کرتے رہیں گے۔ اس جماعت کے افراد ہیں مفسرین، محدثین، فقہاء، صوفیاء، متکلمین اور اربابِ سیف و قلم جو ہر زمانے اور ہر ملک میں اپنا فریضہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاریخ ان کے کارناموں سے مزیّن ہے اور امت نے ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس عنوان کے تحت ہمیں احیائے اسلام کی کوششوں اور تجدیدِ دین کے زندہ جاوید کارناموں کا مختصر تعارف کرانا ہے۔ تجدید و احیاء کا کام اشخاص انفرادی طور پر بھی انجام دیتے رہے ہیں اور منظم جماعتیں بھی۔ عموماً ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک قدآور اور صاحبِ عزم و استقلال شخصیت اٹھی ہے اور اس نے تاریخ کا دھارا بدل دیا ہے۔ اس کی زندگی ہی میں یا اس کے بعد اس کی آواز ایک زندہ تحریک بن گئی ہے اور اس نے الحاد و بے دینی اور بدعت و شرک کا جھاڑ جھنکاڑ جسدِ ملت سے الگ کر کے پرے پھینک دیا ہے۔

اس قسم کی پہلی تحریک خلیفۂ راشد عمر ثانی عمر بن عبدالعزیز اموی کی ذاتِ والا صفات میں ظاہر ہوئی۔ انھوں نے ظلم و ستم، دولت پرستی، خاندانی تفوق، جنبہ داری، اقربا پروری بنی امیّہ کے خاندانی شاہی حقوق، خوشامد پرستی، امراء و خلفاء کی بے جا مدح سرائی، عربی و غیر عربی کی تفوق، اموی و ہاشمی رقابت غرض ہر اس چیز کا قلع قمع کیا جسے دورِ نبوی اور دورِ خلافت راشدہ کے خلاف پایا۔ اسلامی علوم و معارف بالخصوص حدیث کی سرپرستی کی اور اسے سرکاری نگرانی میں مدوّن کرانے کا اہتمام کیا۔ غیر مسلموں پر جو زیادتیاں حکام اور "شاہی خاندان" کے افراد کی طرف سے ہوتی تھیں انہیں ملیامیٹ کیا۔ تبلیغ و اشاعت اسلام کا انتظام کیا۔ اسلامی سادگی کا احیاء کیا اور اس کی ابتداء اپنی ذات اور اپنے گھر سے کی۔ زندگی کا کوئی گوشہ، سلطنت کا کوئی حصّہ، رعایا کا کوئی طبقہ ان کی اسلامی اصلاحات سے فیض یاب ہوئے بغیر نہ رہا۔ اگر سازش سے انہیں زہر نہ دلوا دیا جاتا اور ان کی عمر طویل ہوتی تو تاریخ ہمیشہ کے لئے مختلف ہو جاتی۔ بنو امیّہ کا یہ فرزند اپنی برادری کی پھیلائی ہوئی بہت سی بدعات میں ایک روشن سورج کی طرح تاریخ کے صفحات پر چمک رہا ہے۔ کاش! بنو عباس بھی اس طرح کا کوئی انسان منصّۂ شہود پر لا سکتے!

عمر ثانی کی وفات کے بعد حکومت و سیاست ایک دفعہ پھر دورِ جاہلیت کی طرف لوٹ گئی۔ تابعین کی مقدس جماعت نے سرمایہ پرستی اور عیش پسندی کی وبا کا راستہ

روکنے کی پوری کوشش کی مگر یہ سیلاب امنڈتا ہی چلا گیا۔ اس سیلِ بے پناہ کے لئے بند باندھنے میں جس شخص نے سب سے بڑھ کر اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کو کھپایا وہ حسن بصریؒ کی قد آور شخصیت تھی۔ وہ علم و فضیلت اور تقوٰی و خلوص کا پیکر تھے۔ اولیاء اللہ کے تقریباً سارے سلسلے انہی تک منتہی ہوتے ہیں۔ وہ بیک وقت مفسر، متکلم ، فقیہ، محدث، واعظ، صوفی، مدرس اور بے نظیر خطیب تھے۔ ان کے خطبے آگ لگا دیتے، زبان شعلے اُگلتی، وعظ سُننے والے تڑپتے رہ جاتے۔ ان کی فصاحت و بلاغت، اور طرزِ بیان مثالی تھا۔ کیوں نہ ہوا انہوں نے ام المؤمنین اُمِ سلمہؓ کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ اور ان کی گود میں پلے تھے۔ بعض دفعہ ام المؤمنین کا دودھ بھی چوسا تھا۔ شاید اس پاک دودھ کے کچھ قطرے حلق سے اُتر گئے ہوں جن سے ان کی زبان و بیان سیفِ قاطع بن گئی تھی!! انہوں نے اپنے حلقۂ درس میں بڑے بڑے فقہاء، و محدثین اور علم و فن کی ہر شاخ کے ائمہ کی تربیت کی تھی۔ حسن بصری زہد و تقوٰی اور خلوصِ اسلامی کا پیکر تھے۔ انہوں نے وقت کی پھیلتی ہوئی مادہ پرستی پر بڑی زوردار ضربیں لگائیں۔ سادگی، بے تکلفی، دنیا کی بے ثباتی اور دارِ آخرت کا شوق، یہ تاثرات ان کی مجلس میں آنے والا ہر شخص ساتھ لے کر جاتا تھا۔ وہ تمثیل و محاوروں کی زبان میں حکومتِ وقت کی بے راہ روی اور حکام کی بے لگامی پر چوٹیں کیا کرتے تھے۔ عوام ان کے عاشق و دلدادہ تھے۔ ان کی ہر دل عزیزی اور بے لاگ تنقید سے اموی حکومت کانپ کانپ جاتی تھی۔ حق گوئی و بے باکی ان کا شعار تھی۔ صوفیوں کے سبھی خانوادے حسن بصریؒ کو تاریخ اسلام کا پہلا صوفی — یعنی بعض صحابہؓ مثلاً ابوذر غفاریؓ کے بعد — قرار دیتے ہیں مگر افسوس ہے کہ بعد کا تصوف کچھ بدلا ہوا گیا تھا۔ — بھلا وہ کتنے صوفی تھے جنہوں نے باستثناء چند اتنی بلند آہنگی اور بے خوفی سے حکامِ وقت کی بے راہ روی پر کھلی تنقید کی تھی؟ اور اپنے گرد مردانِ کار کا ایسا بے مثال حلقہ تیار کیا تھا جس میں ہر علم و فن اور ہر طبقے کے لوگ زیرِ تربیت رہتے تھے؟

اس کے بعد عباسی دور آیا، بنی امیہ کی سلطنت کو زوال آ گیا اور کئی تعصبات اُبھار کر اور قسم قسم کے عوامی دلچسپی کے نعرے بلند کر کے حکومت کو تو بدل دیا گیا مگر اب یہ نئی حکومت اموی دور سے بھی گئی گزری تھی، موروثی بادشاہت قائم ہو چکی تھی۔ افرادِ حکومت میں ہاشمی ہونے کے علاوہ کوئی خاص خوبی نہ تھی، بلکہ ہمیں اموی دور کے بعض حکمران ان سے بدرجہا بہتر نظر آتے ہیں۔ بنی امیہ کو چن چن کر ختم کر دیا گیا تھا۔ مقابلے میں علویوں کے سوا کوئی مدعیٔ حکومت نہ رہا تھا۔ مگر انہوں نے بھی اصلاحِ احوال کی صحیح کوششوں کے

بجائے فرقہ بندی کا سہارا لے کر انقلاب لانا چاہا اور اس میں کئی بار ناکام ہوئے۔ مادہ پرستی، عیش پسندی، سرمایہ داری زوروں پر تھی۔ ان حالات میں ہمیں چند مردانِ با صفا کی صوفی جماعت کے افراد نظر آتے ہیں، جن کا ہدف صحیح تھا اور تنقید ذاتی اغراض سے بالاتر تھی۔ یہ جماعت سفیان ثوریؒ، فضیل بن عیاضؒ، معروف کرخیؒ اور بشر حافیؒ پر مشتمل تھی۔ انہوں نے اپنی خدا ترسی، زہد و اتقاء، ایثار و بے غرضی، بے لوث خدمتِ خلق اور بے لاگ آوازۂ حق کے ذریعے سے حق کی شمع روشن رکھی۔ سفیان ثوریؒ صوفی باصفا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم محدث اور بڑے قد آور فقیہ بھی تھے۔ حکومت اور اربابِ حکومت کو کبھی خاطر میں نہیں لائے۔ قال اللہ و قال الرسول سے کام تھا۔ بے شمار لوگ ان سے فیض یاب ہوئے اور اونچے طبقوں کی آوارہ مزاجی اور رنگینئ طبع کے باوجود حق کا بول بالا رہا۔

امام ابو حنیفہؒ اور مالکؒ بن انس اپنی اپنی ذات میں ایک تحریک تھے۔ انہوں نے آزادانہ کسی حکومت کی سرپرستی و نگرانی سے بے نیاز رہ کر اسلام کا نظامِ قانون مدوّن کیا۔ کئی بار حکومتِ وقت سے ٹکر بھی ہوئی مگر یہ بزرگ نہ جھکے۔ امام مالکؒ کی فقہ مغربی ممالک — افریقہ و اندلس — کا قانون بنی تو امام ابو حنیفہؒ کی فقہ نے عباسی سلطنت کے نظامِ قانون کو اپنے زیرِ اثر لے لیا۔ دونوں بزرگوں نے شاگردوں کی عظیم جماعتیں قائم کیں، جو زہد و تقویٰ، خدا ترسی علم و عمل اور صفائے باطن کی سلطنت کی امام بنیں۔ ان میں سے بالخصوص امام ابو حنیفہ سے حکومتِ وقت ہمیشہ لرزاں و ترساں رہی۔ امام صاحب کا جنازہ ابو جعفر منصور کی جیل سے اٹھا۔ جب منصور کو معلوم ہوا کہ ابو حنیفہؒ نے وصیت کی تھی کہ انہیں ان کی زر خرید زمین میں دفن کیا جائے کیونکہ سرکاری قبرستان غصب کی زمین پر بنایا گیا تھا، تو وہ چیخ اٹھا کہ ہے کوئی جو مجھے ابو حنیفہؒ سے بچائے جس نے مجھے نہ زندگی میں چھوڑا نہ موت کے بعد!

ان حضرات کے بعد امام شافعیؒ اور احمدؒ بن حنبل کا نام فقہاء و علمائے امت کی فہرست میں ملتا ہے۔ دونوں علم و عمل اور تقویٰ و خلوص کے پیکر تھے۔ امام شافعیؒ تو ایک مرتبہ قتل سے امام محمدؒ بن الحسن کی سفارش اور ذمہ داری پر بچے مگر بعد میں انہیں کھانے میں زہر دلوایا گیا جو ان کی موت کا سبب ہوا۔ احمدؒ بن حنبل کی ذات تو شہامت و شجاعت کا پہاڑ تھی۔ تین حکمرانوں کا ظلم و تشدد انہیں کلمۂ حق سے نہ روک سکا۔ آخر کار حکومت جھک گئی۔ مگر اس مردِ حق کا سر باطل کے سامنے نہ جھکا سکی۔ مسئلہ خلقِ قرآن کے سلسلے میں احمدؒ بن حنبل کا کردار اسی نوعیت کا ثابت ہوا۔ جیسا کہ صدیقِ اکبرؓ کا فتنہ ارتداد کے ضمن میں ہو چکا تھا۔ ان کا نعرۂ حق ہمیشہ کے لئے انہیں امامِ اہلِ سنت کا خطاب دلوا

گیا۔

تیسری صدی ہجری کی ایک اور عظیم شخصیت امام ابوالحسن اشعری تھے۔ انہوں نے مشہور معتزلی امام ابوعلی جبائی کی نگرانی اور سرپرستی میں پرورش پائی۔ انہی سے علم حاصل کیا اور معتزلہ کے مایۂ ناز وکیل اور مناظر بن گئے۔ چالیس برس مذہب اعتزال کی خدمت کے بعد اس سے برسرِعام توبہ کی اور باقی زندگی سُنت کی خدمت و اشاعت کے لئے وقف کر دی۔ انہوں نے اپنے زورِ استدلال، خداداد زورِ بیان اور زورِ قلم سے اعتزال اور معتزلہ کے پرخچے اڑا دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کی خدمت کا بڑا عظیم کام لیا۔ آج بھی ان کی کتابیں اہلِ سنت و حدیث کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ وہ علوم شرعیہ کے علاوہ فلسفہ و منطق اور دوسرے رائج الوقت عقلی و مشاہداتی علوم کے ماہر تھے۔ انہوں نے "سُنّی علم کلام" کی بنیاد رکھی۔ اشعریؒ کے بعد معتزلہ کا چراغ نہیں جل سکا۔ بعد کے تمام متکلمین انہی کے خوشہ چین ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے امام ابوالمنصور ماتریدی ماوراء النہر (چینی ترکستان) کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے محدث و فقیہ اور متکلم تھے۔ فقہ میں حنفی تھے اور صاحبِ قلم مصنف۔ انہوں نے اشعری علمِ کلام میں کچھ حک و اضافہ کیا اور اسے مزید متوازن بنایا۔ کتاب تاویلات القرآن ان کی عظیم تصنیف ہے۔ حنفی علماء بالعموم عقائد و کلام میں ماتریدی کے پیرو ہیں۔

پانچویں چھٹی صدی ہجری کے مشہور فلسفی، صوفی، معلّمِ اخلاق، فقیہ اور محدث، امام ابوحامد غزالیؒ کا نام مصلحینِ امت کی فہرست میں نہائت چمکدار ہے۔ ان کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیلی۔ انہوں نے تصوّف کی تجدید کا کارنامہ سرانجام دیا۔ بہت ذہین و فطین، زاہد و عابد اور عظیم متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ دل بزرگ تھے۔ فلسفۂ اخلاق ان کا خاص مضمون رہا ہے۔ وہ قلب و رُوح کی بیماریوں اور خطرات النفس کے ماہر و محقق تھے۔ ان کی تصنیفات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی علمِ کلام اور صحیح تصوف کیا چیز ہے۔ فلسفۂ یونان کا مطالعہ انہوں نے گہری نظر سے کیا اور اس کے ردّ میں تہافتہ الفلاسفہ نامی کتاب لکھی۔ وہ علمِ اصولِ فقہ کے بھی امام تھے۔ اور ان کی کتاب المستصفیٰ اس فن میں نہائت عظیم ہے۔ ان کے زمانے میں باطنیت نے تصوف کے بھیس میں اسلام پر حملہ کر رکھا تھا۔ امام غزالیؒ نے اس فتنے کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور دلائل سے کتاب و سنت کی حقانیت اور اسلامی عقائد کی برتری ثابت کی۔ اپنے دَور کے فتنوں کے ردّ میں اور نام نہاد علماء و مشائخ کو جھنجھوڑنے میں ان کا رنگ، کچھ اس قسم کا نظر آتا ہے جو بعد کی صدیوں میں ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے اختیار کیا۔ وہ وقت کے حکام کے شاکی رہے اور ان پر زبان و قلم سے برملا

تنقید و احتساب کے کوڑے برساتے رہے۔ ایک دفعہ انہوں نے وقت کے عظیم فرمانروا ترک سلطان سنجر سے بھرے بازار میں کہا تھا! "افسوس تیرے گھوڑوں کی گردنیں سنہری طوقوں سے ٹوٹ رہی ہیں۔ اور عوام کی گردنیں ٹیکسوں اور واجبات کے بوجھ سے ٹوٹ رہی ہیں" امام غزالیؒ کا کارِ تجدید اسلامی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔

اسی دور کی ایک اور عظیم شخصیت جس نے اصلاحِ امت اور ردِ بدعات کا فریضہ بڑی تندہی اور بے باکی سے انجام دیا وہ سید عبدالقادر جیلانی کی ہستی تھی۔ ہمارے ہاں کے معروف سلاسلِ تصوف میں سے قادری سلسلہ انہی سے منسوب ہے۔ وہ ایک حنبلی المذہب محدثؒ، فقیہ، واعظ، مدرس و معلم اور مصلح تھے۔ عوام میں ان کے کشف و کرامات کے حوالے سے بہت سی بدعات پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر وہ توحید و سنت کے علمبردار، حق گوئی میں شمشیر برہنہ اور اصلاحِ نفس میں جنیدؒ ثانی تھے۔ بڑے خادم خلق، منکسر المزاج اور عوام سے محبت کرنے والے تھے۔ حکام سے طبیعت متنفر و نفور رہتی اور اُن کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے کبھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ پر بے شمار غیر مسلم مشرف باسلام ہوئے۔ وہ تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول فقہ و اختلافِ ائمہ کا درس اپنے مدرسہ میں خود دیتے تھے۔ عوام نے جتنا فیض ان سے پایا، بمشکل کسی اور عالم و شیخ سے اس دور میں پایا ہوگا۔ صحیح اسلامی تصوف اور نبویؐ احسان کے علمبردار تھے اور الحاد و زندقہ اور غلط غیر شرعی تصوف و رسوم تصوف کا رد کرنا مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ وعظ میں تاثیر بہت تھی۔ کہتے ہیں کہ ان کے وعظ کی تاثیر سے بعض لوگ مر جاتے تھے۔ ان کے مواعظ و خطبات فتوح الغیب کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ غنیۃُ الطالبین نامی کتاب آپ کی تصنیف بتائی جاتی ہے مگر وہ تحریف و تغییر سے بچ نہیں سکی۔ بعض فرقوں نے اس میں کتر بیونت کر ڈالی ہے۔

چھٹی صدی ہجری کی ہی ایک اور سیماب پا شخصیت علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزی کی ہے۔ وہ مورخ، ناقد، محدث فقیہ، واعظ، اصولی، مدرس اور دوسری کئی خصوصیات کے حامل تھے۔ وسعت مطالعہ اور کثرتِ تصانیف میں یگانۂ روزگار تھے۔ انکارِ بدعت اور احقاقِ حق میں دو دھاری تلوار تھے۔ حدیث سے شغف زیادہ تھا۔ اور اس کی جانچ پرکھ میں کچھ متشدد بھی تھے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی مشہور کتاب "موضوعات" نے فنِ حدیث کے کئی جدید گوشے واشگاف کیے۔ بدعت اور اہلِ بدعت کے لئے رعد و برق کی دوگونہ صفات کے مالک تھے۔ انہوں نے تحریر و تقریر سے سُنت کا اصلی چہرہ پیش کیا جو بدعت اور وہم و خرافات کی دھند میں اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ کتاب الموضوعات

کے علاوہ تلبیس ابلیس بھی ان کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے مکائدِ شیطان کو بیان کر کے اس وقت کے معاشرے کے خواص و عوام میں ان کی نشان دہی کی ہے۔ حکمرانوں، علماء، مشائخ اور زہد و ورع کے مدعیوں کو خاص طور پر نقد و تبصرہ کا نشانہ بنایا ہے۔ تاریخ میں ان کی کتاب المنتظم ابتدائے اسلام سے لے کر ان کے دور (چھٹی صدی ہجری) تک کے واقعات و احوال و حوادث کے بیان پر مشتمل ہے اور نہایت قیمتی کتاب ہے۔ ان کے علاوہ بھی ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں علمائے آخرت میں سے تھے جو اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھال کر دوسروں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے اور وقت کے دھارے کو اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی سعی کرتے ہیں۔

علماء و فقہاء کے ساتھ اربابِ عزیمت کی صف میں کچھ اربابِ سیف حکام اور درویش صفت سلاطین کے نام بھی آتے ہیں جنہوں نے دورِ زوال میں زندگیاں اسلام کی خاطر وقف کیں اور میدانِ جہاد میں گزار دیں۔ جنہوں نے دنیا بھر کی تازہ دم عیسائی قوت کا بار بار مقابلہ کر کے اس کے دانت کھٹے کیے، اسلامی عدل و انصاف، امن و مساوات، عہد کی پابندی زہد و ریاضت، خدمتِ کتاب و سنت میں کم لوگ ہی ان کی نظیر ہو سکتے ہیں۔ یہ تین شخص ہیں اور تینوں کا تعلق ترکوں سے ہے۔ عماد الدینؒ زنگی، نور الدین زنگی اور صلاح الدینؒ ایوبی۔ بادشاہ ہونے کے باوجود انہوں نے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کی۔ قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت میں تن من دھن لگا دیا۔ یہ تینوں صلیبی جنگوں کے "مسلم ہیرو" ہیں جنہوں نے اسلام کی شمشیرِ بے پناہ کی ضرب سے دشمنانِ اسلام کے سر قلم اور کفر کے علم سرنگوں کیے۔ یہ علم و عمل کے پیکر بھی تھے۔ مسلمان قوم ان کے وجود پر فخر کر سکتی ہے۔ ان کے یقینِ محکم اور ایمانِ کامل نے ابوبکرؓ و عمرؓ کی یاد تازہ کر دی۔ ان کے سوزِ دروں اور شوقِ عبادت نے عثمانؓ غنی کی سجدہ ریزیوں کو زندہ کر دیا۔ ان کی شمشیرِ خارا شگاف نے علیؓ اور خالدؓ کے معرکے تازہ کیے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ہم ان لوگوں کو بے کھٹکے اربابِ عزیمت کی صف میں کھڑا کر کے دورِ صحابہؓ کی یاد تازہ کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا وجود ایک تحریک تھا جس سے مشرق و مغرب متاثر ہوئے۔ غیر مسلم مورخین نے ان پر جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھنے سے آنکھیں اشک بار اور دل بلیوں اچھلنے لگتے ہیں۔ یہ سب چھٹی صدی کے مجاہدین تھے۔

علامہ عز الدینؒ بن عبد السلام اسی چھٹی صدی ہجری کا ایک اور تابندہ ستارہ ہے۔ یہ شخص علم و عمل کا پہاڑ، تقویٰ و خلوص کا صحرائے ناپیدا کنار اور حق گوئی و بیباکی کا نادرۂ روزگار تھا۔ ان کا شمار مجتہدینِ ملت میں ہوتا ہے۔ زہد و ورع، صبر و شکر، خدمتِ دین و ملت،

ردِّ الحاد و بدعت میں ان کا وجود اپنے دَور میں بے مثل و بے نظیر تھا۔ وہ ان علمائے حق اور اولیائے صادق میں سے تھے۔ جن کی صورت دیکھ کر اللہ یاد آتا ہے۔ بے مثال خطیب بے حد مؤثر واعظ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں ننگی تلوار تھے۔ وقت کے حکام کو وعظ و پند سے موم کر دیتے اور ہیبت علم و عمل سے بڑے بڑے سرکش انسانوں کو آستانۂ حق پر جھکا دیتے تھے تاتاری فتنے کا مقابلہ کرنے کی تلقین میں ان کے نصائح اور خطبات آگ لگا دیتے تھے۔ وہ جرأت و استقامت کا کوہِ گراں تھے۔ انہیں دیکھ کر حسن بصریؒ اور سعیدؒ بن المسیبؒ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ شیخ عزّالدین صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ الفوائد الکبریٰ اور مجاز القرآن ان کی علمی گہرائی اور مجتہدانہ بصیرت کی شاہد عدل ہیں۔

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں غدّار ملت ابن علقمی (وزیر خلیفہ مستعصم باللہ) اور نصیر المشرکین نصیر الدین طوسی کی ملی بھگت اور اسلام اور اہلِ اسلام کے خلاف سازش کے نتیجے میں ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کر ڈالا۔ صدیوں کی عظمت سرنگوں ہو گئی۔ مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ چن چن کر اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک ایک نشان مٹا دیا گیا۔ ملت اسلامیہ پر ایک مایوسی کا عالم طاری ہو گیا۔ برائے نام خلافت عباسیہ کا مرکز بغداد سے دمشق اور مصر میں منتقل ہو گیا۔ ادبار و نکبت کی گھٹائیں چھا گئیں۔ نفاقِ باہمی، فرقہ بازی، دنیا پرستی، عیش و عشرت خلفاء کی نا اہلی، سلاطین کی کمزوری اور غفلت نے یہ بُرا دن دکھایا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ اسی زمانے میں اس دَور کا مجدّد امام ابن تیمیہ پیدا ہوا۔

ابن تیمیہ علم و فضل، زہد و ورع، تقویٰ و طہارت، حافظہ و ذہانت میں بے مثال شخصیت تھے۔ وہ بیک وقت مفسر، متکلم، فلسفی، صوفی، محدث، فقیہ و مجتہد، مصنف و مدرّس، واعظ و خطیب، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں شمشیر بے زنہار، شرک و بدعت اور الحاد و زندقہ کے لئے پیامِ موت، تلوار ہاتھ میں لے کر فوجوں کی کمان کرنے والے مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔ امام ابن تیمیہ کا زمانہ فتنوں سے پُر تھا۔ اندرونی اور بیرونی حملہ آور اسلام کے حصار کو توڑنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ابن تیمیہؒ نے ایک سیلاب بلا بن کر تمام فتنوں کا مقابلہ کیا، سیف و قلم سے حق کی خدمت کی۔ وہ بے تکان قلم برداشتہ لکھنے والے تھے ہر موضوع پر ان کا قلم فوراً رواں ہو جاتا تھا۔ بے نظیر حافظے کی مدد سے عبارتوں کی عبارتیں نقل کرتے جاتے۔ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کے علاوہ آثارِ صحابہؓ و تابعین اور اقوالِ فقہاء سپردِ قلم کرتے چلے جاتے تھے۔ یوں نظر آتا ہے کہ تمام شرعی، فلسفی، منطقی، تاریخی، عقلی و نقلی علوم ان کے سامنے ایک ترتیب سے سجے ہوئے ہیں، وہ جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں اقتباسات

و دلائل کا انبار لگاتے چلے جاتے۔ قوت استدلال کا یہ عالم تھا کہ مدمقابل چت ہو جاتا اور وہ فاتحانہ انداز میں قلم کی رفتار کو مزید تیز کر کے دلائل و شواہد کا انبار لگا دیتے۔ انہوں نے بیک وقت فلاسفہ، ملحدین، باطنیہ، روافض، نصاریٰ اور دیگر متبدعین و اعدائے اسلام کے خلاف چومکھی لڑائی لڑی۔ حق گوئی اور بیباکی کا یہ عالم تھا کہ کوئی ہیبت، کوئی دبدبہ، کوئی حکومت اور جاہ و جلال اس سلطانِ علم و عمل کو زیر نہ کر سکا۔ بارہا مصائب کی آندھیاں آئیں۔ آئے دن انقلابِ حکومت کے باعث نت نئی الجھن کا سامنا رہا مگر وہ استقامت اور صبر و وقار کا ایک کوہِ گراں ثابت ہوئے۔ انہوں نے تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا اتنا کام کیا کہ آج اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ خود ایک تحریک تھے۔ ان کی صحبت و تربیت سے ابن القیمؒ اور ابن کثیرؒ جیسے لوگ اٹھے جنہوں نے علوم و فنون کے انبار لگا دیئے۔ ان لوگوں کے احسان سے مسلمانوں کی گردنیں تا قیامت بوجھل رہیں گی۔

حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب منھاج السنۃ رفض و بدعت کے رد میں بے مثال ہے۔ اس میں بڑے دقیق کلامی اور فلسفی مسائل کا حل ملتا ہے۔ الجواب الصحیح ردِ نصاریٰ میں بے نظیر ہے۔ ان کے ضخیم فتاویٰ بے شمار فوائد کے حامل ہیں۔ ان کے شاگرد ابن القیمؒ نے بھی میدانِ تصنیف میں اعلیٰ قسم کی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ فقہ میں یہ دونوں حضرات حنبلی تھے۔ تحریر میں کہیں کہیں شدت کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان پر ساری امت متفق رہی ہے۔ استاد کی نسبت شاگرد پر تصوف کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ ان دونوں حضرات کو اعتزال اور بدعت و الحاد کے مقابلے میں اہلِ سنت کا ترجمان اور وکیل تسلیم کیا جاتا ہے۔

دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے احیائے اسلام اور تجدیدِ ملت کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ مجدد الف ثانی (دوسرا ہزار سال) کا تصور شاید دربارِ اکبری کے خوشامد پرست درباریوں کی اس گمراہی کا جواب تھا۔ کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا دور (ایک ہزار برس) معاذ اللہ گزر چکا ہے۔ اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بعض شکم پرست مسلمان امراء نے ہندوؤں اور دیگر غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک نیا مذہب ایجاد کیا جس کی مرکزیت کا سہرا وقت کے جاہل بادشاہ اکبر کے سر باندھا گیا۔ اس نئے دین کا نام دینِ الٰہی اکبر شاہی رکھا گیا۔ اس میں شرک و کفر، بت پرستی آفتاب پرستی، آتش پرستی، شاہ پرستی (اور خدا جانے کیا کیا پرستی) شامل کی گئی۔ اسلام کو چونکہ معاذ اللہ منسوخ کیا جا رہا تھا اس لئے اس کا کوئی حصہ شامل نہیں کیا۔ اس دین کو ترغیب و ترہیب کے ذریعے سے پھیلایا گیا۔ اور کچھ عرصے کے لئے اسلام کو عملاً اس سرزمین

سے رخصت کر دیا گیا۔ اسی الحاد و بدعات کے پلندے کو دریا برد کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندی کو توفیق بخشی اور انہوں نے اسے واقعی ختم کر ڈالا۔ اس بنا پر ان کا لقب مجدد الف ثانی ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ برصغیر ہندو پاکستان میں اسلام کی اشاعت کا سہرا چند قدسی نفس صوفیوں کے سر ہے۔ حکومتیں بالعموم اس سے لاتعلق اور غیر جانبدار رہی ہیں چند ایک چھوڑ کر اکثر حکمران محض دنیا دار بادشاہ تھے۔ وہ صرف اپنی ذاتی اغراض اور شاہی مصالح کی خاطر بعض اوقات دین کی سرپرستی کا جامہ اوڑھ لیتے تھے۔ حقیقت میں انہوں نے خدمت دین کا فریضہ ادا نہیں کیا۔ مغلیہ سلطنت کا مشہور بادشاہ ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر بھاگا تو کئی سال ایران میں پناہ گزیں رہا اور وہاں کی مشہور متعصب صفوی حکومت سے امداد طلب کرتا رہا۔ آخر کار اسے یہ امداد مہیا ہو گئی۔ وہ صرف فوجی اور مادی امداد کا تحفہ لے کر ہی واپس نہ لوٹا بلکہ اس مدد و نصرت کے جلو میں ایک نئے مذہب کا تحفہ بھی لایا۔ اس کے بعد بڑے بڑے فوجی اور سول عہدے ایرانی اہلکاروں کو ملنے لگے اور یہ ملک نئی نئی آوازوں سے آشنا ہوا۔ یاد رہے کہ آگے چل کر جب مغلیہ سلطنت پر زوال آیا تو یہاں کے بڑے بڑے رؤسا، و امراء، گورنر، فوجی حکام، نواب اور بادشاہ اکثر ایسی ایرانی تحفے کی یادگاریں تھیں۔ انہی کے ہاتھوں زوال سلطنت و حکومت کا کام انجام کو پہنچا۔

اکبر شاہی دور میں جن طبقوں کے ہاتھوں اسلام اور اہل اسلام کو شدید دھچکا لگا وہ علماء و صوفیاء، امراء و رؤساء، شاہی درباری، حکومت کے بڑے بڑے اہل کار اور فوجی عہدیدار تھے۔ حضرت شیخ سرہندی نے اپنے دل ہلا دینے والے مکاتیب کے ذریعے ان سب طبقوں کو خبردار کیا، جھنجھوڑا اور ان کے فرائض کی یاد دہانی کرائی۔ ان مکتوبات میں انہوں نے تفسیر قرآن شرح حدیث، فقہ و اصول اور صحیح اسلامی تصوف کے وہ موتی بکھیرے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان وجد میں آجاتا ہے۔ حضرت شیخ بدعت والحاد کے خلاف ایک قہر الٰہی کی بجلی تھے۔ ان کے مکاتیب میں رعد کی گرج، بجلی کی چمک، سیلاب کی تیزی، سمندروں کی گہرائی اور پہاڑوں کا وقار پایا جاتا ہے۔ انہوں نے علمائے سوء اور شکم پرست مشائخ کو صور اسرافیل پھونک کر جگایا۔ غیر اسلامی تصوف کو دلائل شرع سے رد کیا اور صحیح اسلامی تصوف اور نبوی احسان کو از سر نو زندہ کیا۔ اس ملک میں بدعت و الحاد کے دھارے کے سامنے سنت و شریعت کا بند باندھنے میں جو کردار انہوں نے ادا کیا تھا اس کے اثرات ان شاء اللہ تا قیامت باقی رہیں گے۔ ان کے بعد احیائے اسلام کی تحریکیں انہی سے متاثر نظر آتی ہیں۔ انہوں نے جہانگیر

جیسے عظیم شہنشاہ کو خدا اور رسولؐ کی شرع کی چوکھٹ پر جھکا دیا۔ دینِ الٰہی اکبر شاہی صرف اوراقِ تاریخ کی زینت بن کر رہ گیا۔ انہی کا اثر تھا کہ اس دنیا دار شاہی گھرانے سے اورنگ زیب عالمگیر جیسا پابندِ شرع اور خادمِ دین بادشاہ اٹھا۔ اگر عالمگیر کے جانشین نااہل ثابت نہ ہوتے تو آج ہندو پاکستان کی تاریخ اور جغرافیہ دونوں مختلف ہوتے۔

حضرت مجددؒ کی اصلاحی و تجدیدی تحریک نے برصغیر کے ہر کونے اور ہر گوشے میں ایسے دردمندانِ اسلام کا ایک جال بچھا دیا تھا جنہوں نے اسلامی علوم اور کتاب و سنت کی اشاعت میں اپنی جانیں کھپا دیں۔ بدعت و الحاد اور باطنیت کو نول کھدروں میں منہ چھپانے پر مجبور ہو گئے۔ یہ تحریک آگے چل کر کئی تحریکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور دین کا کام کرنے والوں نے اس سے رہنمائی حاصل کی۔

بارھویں صدی ہجری میں عالمِ اسلام کا ایک عظیم مفکر، علوم عقلیہ و نقلیہ کا جامع، وسیع النظر عالمِ دین، فقیہ، محدث، صوفی، معتدل دل و دماغ رکھنے والا حیرت انگیز مصنف، اسلام کے لئے دل دردمند رکھنے والا ایک ہمہ گیر دانش ور ہمیں ملتِ اسلامیہ میں کارنامۂ تجدید و اصلاح انجام دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بے مثال شخصیت کا نام شاہ ولی اللہؒ ہے۔ ان کے زمانے میں سلطنتِ مغلیہ زوال کا شکار ہو چکی تھی۔ مرہٹے اور سکھ ملک میں اُدھم مچا رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ نااہل حکمران نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ مایوسیوں نے ملتِ اسلامیہ کو گھیر لیا تھا۔ مغربی اقوام تاجروں کے بھیس میں متحدہ ہندوستان میں آ کر اب یہاں کی حاکم بن رہی تھیں۔ کئی علاقے عملاً ان کے زیرِ تسلط تھے۔ شاہی دربار مسخروں، بھانڈوں، نقالوں اور ڈوم ڈھاریوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ لوگ گھن کی طرح سلطنت کو آہستہ آہستہ کھائے جا رہے تھے۔ بیشتر علاقے مرکزی حکومت سے آزاد ہو چکے تھے۔ نواب اور ان کے درباری بٹیر بازی میں مصروف تھے۔ چھاپہ مار مرہٹے لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کئے ہوئے تھے۔ محلاتی سازشیں زوروں پر تھیں اور شاہی گھرانوں میں سازشوں اور اکھاڑ پچھاڑ کا نہ ختم ہونے والا چکر چل رہا تھا۔ خواص ایک مرتبہ پھر اپنے فرائض سے ناآشنا ہو گئے تھے اور عوام میں بے اعتمادی اور بے چینی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ہر طرف عیاشی، بے راہ روی، قتل و غارت، بدامنی اور جبر و تشدد کا بازار گرم تھا۔ بدعت و الحاد پھر اپنی دکانیں سجا چکا تھا۔ تصوف اور فقر و درویشی کا چشمۂ صافی پھر مکدر ہو چکا تھا۔ علم و فضیلت درباروں تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بن چکے تھے۔ مینخت کے گدی نشین نفس پرور اور دنیا پرست بن گئے تھے۔ قبر پرستی وبائی شکل اختیار

کر گئی تھی۔ توحید پرست ایک خدا کے سوا باقی ہر ایک کے پجاری ہو گئے تھے۔ سُنت کے چراغ ماند پڑ گئے تھے اور شرک و بدعت کی شمعیں روشن تھیں۔ غرض ایک طوفانِ بلا تھا جس میں اس ملک کی ملتِ اسلامیہ گھری ہوئی تھی۔

ایسے خوفناک حالات میں دہلی شہر کے ایک کونے میں بیٹھ کر شاہ ولی اللہ حالات کو اچھی طرح بھانپ کر اس بیمار قوم کا علاج دریافت کرنے اور پھر اس کو ایک نسخۂ شفا کے طور پر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی صورت میں پیش کرنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اتنا وسیع کام کیا ہے جو عام حالات میں شاید ایک بڑی جماعت بھی نہ کر سکے۔ کوئی سیاسی، معاشی، معاشرتی، عمرانی، تہذیبی، اخلاقی موضوع ایسا نہیں جس پر انہوں نے مدلل بحث و تحیص کر کے پیش آمدہ مسائل کا حل پیش نہ کیا ہو۔ حکمتِ دین میں ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ آج تک بے مثال ہے۔ دنیا بھر کے مسلم اور غیر مسلم عقلاء اس کے مندرجات کی داد دے چکے ہیں۔ انہوں نے ترجمہ و تفسیرِ قرآن، شرحِ حدیث، فقہ و اصول، غرض ہر شرعی علم و فن کی بے نظیر خدمت کی۔ وہ اس ملک میں حدیث کی باقاعدہ تدریس جاری کرنے والے پہلے محدث ہیں۔ ان کے بعد بس انہی کی سند اور انہی کا سلسلہ چلا۔ پہلے بزرگوں نے جو کام کیا تھا وہ جزوی وانفرادی ہو کر رہ گیا۔ قرآن پاک کی تفہیم و تعلیم کے لئے انہوں نے ایک آسان اور عام فہم طریقہ نکالا۔ اس کی خاطر انہوں نے فارسی زبان میں ــــ جو اس وقت علمی و دفتری زبان تھی ــــ ایک ترجمہ اور تفسیر لکھی۔ اصولِ تفسیر پر ایک انوکھے طرز کا رسالہ لکھا جو آج کل درس گاہوں میں داخلِ نصاب ہے۔ سُنّی فقہ کے مکاتبِ چہارگانہ کو ایک دوسرے سے ملانے اور قریب تر کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ حدیث کی عام فہم اور جامع شرح لکھی ــــ ان کے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کی شمع روشن رکھنے اور دُور دُور تک اس کی روشنی پہنچانے کی توفیق بخشی۔ ان کے لائق صاحبزادوں اور جانشینوں نے اُردو زبان کو تفہیم و اشاعتِ قرآن کا ذریعہ بنا کر ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ اُن کے تراجم آج تک بے نظیر شمار ہوتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے خود گو سیاست میں عملی حصّہ نہیں لیا مگر وقت کے اربابِ حکومت و سیاست کو بار بار جھنجھوڑا اور خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کی۔ وہ مرہٹہ گردی اور ہر طرف کفار کی یلغار پر تلملاتے رہے اور رخانیانِ اسلام کو میدانِ مبارزت میں نکلنے کی کھلی دعوت دیتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی انہی کی دعوت اور پکار سے متاثر ہو کر مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے برصغیر پر حملہ آور ہوا تھا۔

تصوف کو جن بدعات اور غیر اسلامی اعمال و رسوم اور وہم و خرافات سے ملوث کر دیا گیا تھا، شاہ صاحب نے اس سارے جھاڑ جھنکاڑ کو اس سے الگ کر کے نبوی احسان اور قرون اولیٰ کے اسلامی تصوف کو از سرِ نو زندہ کیا۔ وہ خود ایک بہت بڑے صاحب نسبت اور صاحب اجازت صوفی تھے۔ ان کے والد بھی عظیم عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے صوفی تھے۔ شاہ صاحب نے تصوف پر بھی بہت سی کتابیں اور رسائل چھوڑے ہیں۔

آج ہند و پاکستان میں سُنی مکاتب فکر میں کوئی طبقہ ایسا نہیں جو اپنی نسبت شاہ ولی اللہ کی طرف نہ کرتا اور اپنی سندِ حدیث ان کے ساتھ نہ ملاتا ہو۔ ان کی ذات، اور ان کے بعد ان کے اخلاف اس ملک میں شرعی علوم کے لئے مرکزیت کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تصانیف بالخصوص حُجّۃُ اللّٰہِ الْبَالِغَۃ ہند و پاکستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ انہوں نے احیائے دین اور اصلاحِ ملت کا جو کام شروع کیا تھا اس کے نتیجے میں انہی کے فیض یافتہ اور ان کے اخلاف نے ہند و پاکستان میں ایک عظیم تحریک جہاد شروع کی جو وقتی طور پر گو ناکام ہو گئی مگر دنیا کے اِن اطراف میں دیرپا اثرات چھوڑ گئی۔ اس کی صدائے بازگشت اب بھی سُنائی دے رہی ہے۔

یہ تحریکِ جہاد سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کی بیداری میں بڑا کام کیا ہے۔ ہم آزادیٔ ہند اور قیام پاکستان کی ہر تحریک میں اس کا اثر بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اس تحریک کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہو گا کہ اس کا مقصد احیائے دین کے سوا کچھ نہ تھا۔ ناموافق حالات میں بعض لوگوں کی غداری سے یہ حضرات شہادت پا گئے۔ لیکن ان کا نعرۂ جہاد اور احیائے اسلام کی پکار اب بھی زندہ و پائندہ ہے۔ یہ تیرھویں صدی ہجری کی تحریک تھی۔

سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں کی تحریک جہاد تو بظاہر ناکام ہو گئی مگر احیائے دین کے سلسلے میں اس تحریک کے اثرات بہت دیرپا ثابت ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر اور ان کے حامی شکست کھا گئے، تو انگریزوں نے اہل ہند پر ــــ بالخصوص مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ بے شمار لوگوں کو پھانسی دی گئی۔ علماء کو تختۂ دار پر کھینچا گیا، کہتے ہیں کہ دہلی کے خونی دروازے کے باہر دُور تک پھانسیاں گڑھی تھیں، فاتح قوم نے غلط یا صحیح شکایت پر اندھا دھند باشندگانِ دہلی کو بر سرِ عام اُن پر لٹکایا۔ حاکم قوم کی پالیسی اب یہ تھی کہ مسلمانوں کو ہر میدان میں نیچا دکھایا جائے۔ اور ہندو کو آگے بڑھایا جائے۔ بہت سے علماء و صلحاء ملک چھوڑ گئے۔ خانوادۂ ولی اللہی پر بھی مصائب کے پہاڑ ٹوٹے۔

مولانا رحمت اللہ، مولانا شاہ محمد اسحاق ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی پر بغاوت کے مقدمے چلے۔

علمائے حق کی جماعت نے مسلمانوں کو مایوسی سے بچانے اور اسلام کو غیر قوم کی زد سے نکالنے کے لئے غور و فکر کے بعد مدارس اسلامیہ کا سلسلہ شروع کیا۔ دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں اور انہوں نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی خاطر مخالف حالات میں دین کا جھنڈا بلند رکھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کو ترکوں کی امداد کے جرم میں جزیرہ مالٹا میں نظر بند رکھا گیا۔ آگے چل کر اسی جماعت کے لوگ آزادی ہند اور مسلم لیگ کی تحریکوں میں پیش پیش رہے۔

سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی نے بھی مسلمانوں کی بیداری اور اتحاد میں بڑا کام کیا۔ افغانی کے بعد ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ نے ان کا کام سنبھالا۔ سید رشید رضا مصری نے اسلامیان مصر کی بیداری اور مسلمانان عالم کی دینی رہنمائی میں بہت بڑی خدمات انجام دیں۔ ماضی قریب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک جماعت اسلامی کی خدمات کو نظر انداز کرنا دیانت و انصاف کے خلاف ہوگا۔ سید مرحوم نے وقت کے تمام اہم مسائل پر خامہ فرسائی کی ہے اور اسلام کی حقانیت کے اثبات میں وسیع ذخیرہ کتب چھوڑا ہے۔ مصر کی تحریک اخوان اور سوڈان کی تحریک مہدی سوڈانی کے علاوہ سنوسی تحریک نے بھی اسلام کی خدمات اور دفاع میں عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ سب تحریکات ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک بھی اصلاحی تھی گو اسے بدنام بہت کیا گیا ہے۔

اسلامی اقدار کے احیاء اور تبلیغ دین میں تبلیغی جماعت کا کام ناقابل فراموش ہے تقسیم ہند سے قبل جب ہندوؤں نے شدھی کا فتنہ اٹھایا اور بہت سے مسلمانوں کو مرتد بنا ڈالا تو مسلمانوں نے انفرادی و اجتماعی طور پر اس کا مقابلہ کرنے کی کوششیں کیں۔ ان سب کوششوں میں مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی جدوجہد بے مثال تھی۔ انہوں نے دہلی — ہندوستان — کی بستی نظام الدین میں ڈیرہ جمایا اور ملحقہ وسیع علاقہ میوات جو شدھی کی شدید زد میں تھا، اسے اپنے کام کا مرکز منتخب کیا۔ ان کی کوششوں سے یہ علاقہ کفر کی گود میں جانے سے بچ گیا اور مولانا مرحوم کی اس تحریک نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی۔ اس جماعت کا نہ کوئی دفتر ہے نہ ممبر شپ، نہ چندہ نہ کوئی اور مصنوعی اور تکلفاتی رسم۔ اللہ کے چند بندے اپنا خرچ اور بستر ساتھ لے کر چلتے ہیں، کسی سے کچھ طلب نہیں کرتے بلکہ

بلا چند شرطوں کے کسی کی دعوت بھی قبول نہیں کرتے۔ بستی بستی گھومتے پھرتے ہیں مسجدوں میں ڈیرہ لگاتے ہیں۔ اور نمازوں کے اوقات میں مقامی لوگوں کو ان کے دینی فرائض کی طرف متوجہ کر کے ساتھ لے لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو لوگ ساتھ ہو جائیں انہیں دینی احکام کی تعلیم بھی دیتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ بستی بستی کوچے کوچے جاری رہتا ہے۔ نماز عصر کے بعد مسجد کے ملحقہ علاقے میں گشت کر کے عوام کا کلمہ صحیح کراتے اور نماز کی تلقین کرتے ہیں۔

یہ جماعت خاموشی سے ہند و پاکستان کے علاوہ مغربی ممالک — فرانس، جرمنی ہالینڈ اور انتہائی مشرقی ملک جاپان کے علاوہ امریکہ میں بھی برسرکار ہے۔ ان کے کام کے نتائج رونما ہو رہے ہیں۔ اور ان ممالک میں اسلام کی خاموش تبلیغ کے علاوہ وہاں رہنے والے یا ملازمت کرنے والے مسلمانوں کی اصلاح کا کام بھی جاری ہے۔ جاپان میں یہ کام خاصہ تیز اور وسیع ہے۔ یہ اصلاح و تجدید کا ایک خاموش اور سادہ کام ہے مگر اپنے نتائج کے لحاظ سے بڑا اہم اور نتیجہ خیز ہے۔

اسلام اور عصر حاضر

عصر حاضر میں اسلام بے شمار مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے خلاف دنیا کے دو دھڑے یعنی مغربی عیسائیت اور مشرقی اشتراکیت ہر وقت سازشوں میں مصروف ہیں۔ اسلام کے مقابلے میں یہودیت و عیسائیت — جن کا جنم جنم کا بیر تھا — متحد ہو چکی ہیں۔ ہندو ازم نے ایک مرتبہ پھر ہندوستان میں اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ اور وہ اسلام کے خلاف ہر قسم کے اسلحہ سے لیس ہو کر اسے زک پہنچانے — بلکہ اپنی مزعومہ سرزمین سے اس کو مٹانے پر تل گیا ہے۔ مسلمانوں کے بہت سے علاقے افریقہ میں مغربی عیسائیوں کی سازشوں سے عیسائی اقلیت کے ہاتھوں میں آ چکے ہیں۔ سپین سے مسلمانوں کا نام و نشان بہت پہلے سے مٹایا جا چکا ہے۔ اشتراکیت مسلمانوں کی کم از کم ایک درجن ریاستوں پر قابض ہے۔ اور وہاں سے اسلامی تہذیب و ثقافت کی ہر علامت کو مٹایا جا چکا ہے۔ چینی ترکستان — موجودہ سنکیانگ کا عظیم علاقہ — چین کی جدید اشتراکیت کے قبضے میں ہے اور خدا معلوم وہاں مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ مسلمان سلطنتیں تنزل اور زوال کا شکار ہیں۔ ان میں اتحاد نام کی کوئی چیز عملاً کم ہی نظر آتی ہے۔ معاشی طور پر مسلمان ہر ملک میں پسماندہ ہیں۔ عربوں نے اسرائیل سے بار بار شکست کھانے کے بعد بھی ہوش نہیں سنبھالا۔ اور وہ دھڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں روس کا ریچھ افغانستان کی مسلم سلطنت پر قبضہ جما چکا ہے اور اپنی پوزیشن روز بروز مستحکم کرنے کی فکر میں ہے۔

خالص مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اب ہم میں وہ دم خم باقی نہیں رہا کہ وقت کے فتنوں کا علمی تجزیہ کر کے کسی غزالیؒ یا ابن تیمیہؒ یا شاہ ولی اللہؒ کا پارٹ ادا کر سکیں۔ روح اجتہاد مردہ ہو چکی ہے۔ فکر و نظر زنگ آلود ہو گئے ہیں۔ ہمارے علما رتعطل و جمود کا شکار ہیں۔ سالہا سال پہلے کا بنا ہوا نصاب تعلیم ہماری مذہبی درسگاہوں میں رائج ہے اور ہم اس سے ایک انچ ہٹنا بھی کفر و الحاد کا ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ ساری طاقت فروعی اختلافات کو ہوا دینے اور فرقہ بندی پر صرف ہو رہی ہے۔ ہمارے مشائخ جاہل اور رجعت پسند ہیں۔ کتاب و سنت اور نبوی احسان سے بے بہرہ ہیں۔ شکم پروری اور حکام پرستی ان کا منتہائے مقصود ہے۔ سب سے بڑی خطرناک بیماری جس نے ہمیں نیم جان کر دیا ہے۔ وہ فرقہ پرستی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اسلام کو اپنی خاص رنگین عینک سے دیکھنے کا عادی ہو گیا ہے۔ ہماری مسجدیں فروعی خانہ جنگی کا اکھاڑا بن چکی ہیں۔ ایک فرقہ کے لوگ دوسروں کی مسجد میں نماز ادا کرنے کو تیار نہیں۔ بعض مسجدوں کے دروازے دوسرے خیال کے لوگوں پر بند ہیں۔ تکفیر و تفسیق کا شغل مذموم جاری ہے۔ واعظوں کے ہر وعظ اور خطبا کے ہر خطبے میں ملت کی بیماریوں کا علاج نہیں بلکہ ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کی پیش کش کی جاتی ہے۔ اس صورت احوال سے مغربی تعلیم سے مزین دل و دماغ — جو پہلے ہی اسلام سے بیگانہ ہیں — متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ ہماری آبادی کا ایک دو فیصد حصہ بھی نمازی نہیں رہا۔ حالانکہ یہ اسلام کا اولین فریضہ ہے جسے اسلام اور کفر کے درمیان علامت امتیاز قرار دیا گیا ہے۔ اللہ کے کچھ بندے صحیح لائنوں پر کام کرتے بھی ہیں تو عوام و خواص انہیں تضحیک کا نشانہ بناتے اور عجیب و غریب فتوؤں اور القاب سے ان کی تواضع کرتے ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہے اس میں بمشکل ہی بعض ایسے افراد مل سکیں گے جو اسلام کے بارے میں مخلص ہوں۔ ورنہ بعض تو ملحد یا سوشلسٹ یا لادین ہیں، بعض غیر جانبدار ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بعض بیرونی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ ایسے لوگ ہر محکمے اور ہر دفتر میں موجود ہیں۔ حال ہی میں پی۔ آئی۔ اے میں جو تطہیر کا عمل ہوا ہے۔ تو اس سے کئی حیرت انگیز انکشافات منظر عام پر آئے ہیں۔ بعض انکشافات ایسے بھی ہوں گے جنہیں مصلحتًہ ظاہر نہ کیا جا سکتا ہوگا۔ ملک میں آئے دن جو تخریبی کارروائیاں، قتل و غارت، اغوا اور ڈاکہ زنی، بموں کے دھماکے ہوتے رہتے ہیں ان کے پیچھے یقینًا کوئی خفیہ ہاتھ کارفرما ہے۔ تعلیمی اداروں میں ملحدوں،

سوشلسٹوں اور ممالکِ غیر کے جاسوسوں کے متعلق اعلانات اور بیانات ذمہ دار لوگوں کی طرف سے اکثر اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بعض خاص فرقے یہودیوں کی مانند ذرائع ابلاغ پر مکمل قبضہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ قومی اور ملکی ذرائع کو اپنے فرقہ وارانہ مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ انتشار و اضطراب کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔ یہ لوگ اندرونی سازشوں کے بل پر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور ملت کا کام کرنے کی بجائے اپنے خاص طبقے یا فرقے کا کام کرتے ہیں۔

معاشی نقطۂ نظر سے مسلم ممالک پسماندہ اور مغربی ممالک کے محتاج ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فقدان کے باعث وہ اپنے آپ کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ سوشلسٹ بلاک یا مغربی سرمایہ دار بلاک سے منسلک ہوں۔ بڑے ملکوں کی امداد مفت نہیں ملتی۔ اس کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس امداد کی شرائط بعض دفعہ رسوا کن ہوتی ہیں۔ اس امداد کے سہارے وہ ممالک اپنے دانشور، مشیر، سائنسدان، ماہرین اقتصادیات اور بعض دفعہ فوجی ماہرین بھی ان مسلم ممالک میں داخل کر دیتے ہیں۔ مسلم ممالک کا ہر راز ان لوگوں کی معرفت افشاء ہوتا رہتا ہے۔ یہ ماہرین کام میں مخلص نہیں ہوتے۔ ان کے پیش نظر محض اپنے ممالک کے خاص مفاد ہوتے ہیں۔ پسماندہ ملکوں کو بعض دفعہ بڑی طاقتوں کے سامنے مجبور ہو کر اپنے ملک میں فوجی اڈے، ہوائی اڈے اور بحری اڈے بنانے کی اجازت دینی پڑتی ہے۔ یہ ماہرین مسلم ممالک میں فحاشی اور بے راہ روی پھیلانے اور اضطراب پیدا کرتے ہیں۔ افغانستان کی موجودہ صورتِ حال اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ یہاں ایک عرصے سے رُوسی ماہرین نقب لگا رہے تھے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کسی ملک کی میراث نہیں بلکہ یہ ساری انسانیت کی مشترک میراث ہے۔ ہر نئی ایجاد عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔ علم و فن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ جو شخص یا قوم بھی اسے اپنا لے وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ اس میدان میں ہم مغرب اور سوشلسٹ ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔ اب تو ہندو اور یہودی بھی اس میدان میں مسلم ممالک پر بازی لے جانے کی شدید جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس علمی بے مائگی اور ذہنی پس ماندگی کا نتیجہ ہے کہ ہم غیروں کے محتاج بن کر رہ گئے ہیں۔ باہر سے پڑھ کر آنے والے ان ممالک سے متاثر ہوتے ہیں جہاں انہوں نے تعلیم پائی۔ وہ غیر شعوری — اور بعض دفعہ شعوری طور پر بھی اپنے ملک میں دوسروں کے سفیر بن کر رہ جاتے ہیں۔

معاشرتی نقطۂ نگاہ سے ہماری سوسائٹی بے شمار رسوم اور وہم و خرافات کا

شکار ہے۔ ہم طبقات میں بٹ کر رہ گئے ہیں۔ قوموں اور ذاتوں کا تعصب بے شمار اختلافات کا باعث ہے۔ علاقائی تعصب کی بیماری ہم میں گھر کر چکی ہے۔ مسلم ہونے کے باوجود ہم اپنے ہی ملک کے ان لوگوں کو جن کی زبان یا بعض ثقافتی رسوم ہم سے مختلف ہوں، برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ یہ مرض پڑھے لکھے لوگوں اور سیاست دانوں میں سب سے زیادہ ہے۔ سٹیج پر ہم جس تہذیب اور زبان کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں، پیچھے اُتر کر اُسی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ہماری سرحدوں پر ہمارے ہمسایہ ملک میں جو قتل و غارت اور خاک و خون کا ہنگامہ بپا ہے ہم اس سے بھی سبق لینے کو تیار نہیں ہیں۔

ہمارے سیاستدانوں کی عقل و فکر کو گھن لگ چکا ہے۔ وہ کبھی کسی قومی مسئلے پر بھی متحدہ قوت کا مظاہرہ کرنے کو آمادہ نہیں۔ اتفاقاتِ زمانہ سے جن لوگوں کو لیڈری کا مقام مل چکا ہے وہ اپنے تختِ رعونت سے نیچے اُترنے کو تیار نہیں۔ ہمارے ملک کی بے شمار مصیبتوں کا باعث یہی طبقہ ہے۔ اس طبقے کے ہاتھوں یہاں محلاتی سازشوں کا دور شروع ہوا جس نے کئی دفعہ ملک کو خطرناک حالات سے دوچار کیا ہے۔

یہ حالات کا ایک بے لاگ تجزیہ ہے۔ کم و بیش تمام اسلامی ممالک انہی احوال سے دوچار ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی عظیم ترقی کے اس دور میں بڑے ملک چھوٹے ممالک کو فوجی طاقت سے کم فتح کرتے ہیں اور نظریاتی، معاشی اور علمی ذرائع و وسائل سے زیادہ تر فتوحات حاصل کرتے ہیں۔

یہ تصویر کا ایک رُخ ہے جو بظاہر بھیانک نظر آتا ہے۔ اب ہمیں دُوسرا رُخ بھی وسیع النظری سے ــــ خوش فہمی سے نہیں! ــــ دیکھنا ہے۔ گزشتہ تیس پینتیس سال کے عرصے میں اکثر اسلامی ممالک غیروں کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں گو ان ممالک میں اسلامیت و غیر اسلامیت میں شدید کشمکش برپا ہے مگر حالات مایوس کُن نہیں ہیں۔ پے در پے جھٹکوں اور ٹھوکروں نے مسلمانوں میں اتحاد کا شعور پیدا کیا ہے۔ اور اب وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ موتمر عالم اسلامی اور رابطہ عالم اسلامی جیسی عالمی اسلامی تحریکیں برسرکار ہیں۔ نکبت و ادبار کے خلاف تقریباً ہر مسلم ملک میں ایک بے چینی کی کیفیت موجود ہے۔ مسلم ممالک کے ثقافتی، تجارتی، سیاسی اور خالص دینی روابط مضبوط ہو رہے ہیں۔ فلسطین اور افغانستان کے مسائل بین الاقوامی مسائل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مسلم ممالک پہلے کی نسبت زیادہ

جذبۂ خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو رہے ہیں۔ فرقہ ... کے خلاف اب ہر جگہ ایک جذبۂ تنفر پیدا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ مسلم عوام دین کی طرف ازسرِ نو متوجہ ہو رہے ہیں۔ اکثر مسلم ممالک میں انفرادی اور اجتماعی آوازیں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اُٹھ رہی ہیں۔ اب مغربیت اتنی شدت اور بے باکی کے ساتھ اسلام کے خلاف پروپیگنڈا نہیں کر سکتی جس طرح وہ تیس چالیس سال قبل کرتی رہی ہے۔ اشتراکیت بھی اب کافی حد تک ننگی ہو چکی ہے۔ دنیا میں اب اسے سامراجیت کا دوسرا بھیس قرار دیا جا رہا ہے جس نے عدل و مساوات کا نعرہ لگا کر کمزور ممالک کو جکڑنے کا دھندہ اختیار کر رکھا ہے۔

مسلم ممالک کے اندر سے اسلام کی طرف لوٹنے کی طاقتور آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ غیر اسلامی نظریات سے ایک عام بیزاری کا دور شروع ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی رفتار بھی نسبتہً تیز ہو رہی ہے۔ رضاکار جماعتیں جاپان، ہندوستان، امریکہ، جرمنی، فرانس، کینیڈا اور بعض دوسرے مغربی و مشرقی ممالک میں خاموشی سے تبلیغِ اسلام کا کام کر رہی ہیں اور اس کے نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔

پاکستان میں اسلامی نظام کو عملاً نافذ کرنے کی طرف بعض ناموافق حالات کے باوجود مسلسل پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس کا اثر دوسرے مسلم ممالک پر بھی مثبت انداز میں پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ اسلامی قانون اور حدود و تعزیرات کے خلاف اندرون ملک جو مسلسل پروپیگنڈا ہوتا رہا ہے اب وہ بند ہے۔ مغربی ممالک میں بھی اب غالباً دوسرے انداز میں سوچا جا رہا ہے۔

مسلم ممالک کی سربراہی کانفرنس کے اجلاس وقفے وقفے سے ہوتے ہیں اور ان کا اثر بہت خوش گوار نظر آتا ہے۔ اب انجمنِ اقوامِ متحدہ میں مسلم ممالک کی آواز کو اہمیت حاصل ہے۔ دنیا کے دو دھڑوں کے عین وسط میں ایک تیسرا دھڑا منظم ہوتا نظر آتا ہے اور اس دھڑے کی آواز میں اب جان ہے۔ اگر مسلم ممالک کے سربراہ خلوص کے ساتھ اپنے فرائض کو پہچانیں تو مستقبل میں اسلام کے لئے کامیابی کے مواقع ہیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔